جدید ادب جرمنی

www.jadeedadab.com

شمارہ: 18

اُلجھے جو فقیروں سے
یوں سمجھو اُلجھے
اپنی تقدیروں سے

حیدر قریشی

جدید ادب جرمنی
شمارہ: 18
حیدر قریشی

JADEED ADAB Literary Urdu Journal (January to June 2012)

Haider Qureshi Rossertstr.6, Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.



نذیر فتح پوری



ترنم ریاض

۵ شعری مجموعے، ۲ افسانوی مجموعے، خاکوں، یادوں اور انشائیوں کا ایک ایک مجموعہ
اور ایک سفرنامہ پر مشتمل حیدر قریشی کی گیارہ کتابوں کا مجموعہ

عمرِ لاحاصل کا حاصل



اردوستان:انٹرنیٹ کی دنیا کا ایک اہم نام۔اردو کی سب سے پرانی ویب سائٹ جواردو سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔اردوستان نیٹ ورک کی بنیادی اوراہم ترین ویب سائٹ۔

کاشف الھدیٰ کی نفع و نقصان سے بے نیاز رہ کر اردو کی خدمت کی لگن

www.urdustan.com

حیدرقریشی کا کالم **منظر اور پس منظر** اور کالم **خبر نامہ** بھی ان لنکس پر موجود ہیں۔

http://www.urdustan.com/manzar/

http://urdustan.com/khabarnama/

کتاب گھر:حسن علی کی مفت اردو کتب (E-Books) فراہم کرنے والی ایک اہم ویب سائٹ،جس میں مختلف موضوعات پر 270 سے زائد کتب مطالعہ کے لئے آن لائن دیکھی جاسکتی ہیں یاڈاون لوڈ کی جاسکتی ہیں۔

www.kitaabghar.com

اردو دوست ڈاٹ کام : خورشیداقبال کی خوبصورت ویب سائٹ

www.urdudost.com

سہ ماہی ادبی رسالہ **کائنات**،ادبی خبرنامہ **اردو ورلڈ**،ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل **ادبی البم**۔ ای بکس کا سلسلہ **اردو دوست لائبریری** اوردلچسپی کے متعدد دوسرے سلسلوں سے مزین ویب سائٹ۔

اردو ماہیا

http://www.urdudost.com/archive/old-mahya.html

حیدر قریشی کی تخلیقات کی ویب سائٹ اور تراجم کے لنکس

www.haiderqureshi.com

حیدرقریشی کی شاعری کے تراجم کے مطالعہ کے لئے اس لنک کوکلک کریں:

http://haiderqureshi.blogspot.com/

حیدرقریشی کے افسانوں کے انگریزی تراجم کے مطالعہ کے لئے اس لنک کوکلک کریں:

http://haiderqureshisstories.blogspot.com/

ایک عبرتناک لنک

http://bhinder-ki-asliyyat.blogspot.com/

خلاصۂ کلام:

ا۔عمران شاہد بھنڈر نے 2007ء میں اپنے آپ کو پی ایچ ڈی کا سکالر بتایا،پی ایچ ڈی کے موضوع Postmodern Literary Theory تک کو چھپوا کر اردو دنیا کو دھوکہ دیا،جعل سازی سے کام لیا،اپنے جعلی علم کارعب قائم کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ 2007ء سے لے کر جون 2011ء تک،انہوں نے پی ایچ ڈی کرنا تو درکنار ابھی تک رجسٹریشن بھی نہیں کرائی۔یہ ادبی دنیا کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔واضح جعل سازی ہے۔

۲۔خود کو شعبۂ تعلیم سے وابستہ کہنا بھی جعل سازی اور دھوکہ دہی ہے۔اس وقت تو شعبۂ تعلیم سے اس حد تک بھی وابستہ نہیں جتنا پرائمری کلاس کے کسی طالب علم سے لے کر کالج تک کا کوئی طالب علم بطور طالب علم وابستہ ہوسکتا ہے۔جبکہ شعبۂ تعلیم سے وہ اپنی وابستگی تو ایسے ظاہر کر رہے ہیں جیسے کہیں لیکچرر یا پروفیسر لگے ہوئے ہوں۔کیا وہ ایسے جعلی تعارف کے بغیر خود کو معزز محسوس نہیں کرتے؟

۳۔خود کو بقلم خود اور بزبان خود''نوجوان فلسفی'' کہلوانا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔عمران بھنڈر مابعد جدیدیت کی درسی نوعیت کی طالب علمانہ تشریحات سے زیادہ کچھ نہیں کرسکے۔اس میں بھی ان کا مطالعہ غیر ہضم شدہ ہے اور اس غیر ہضم شدہ کے اثرات جابجا دکھائی دیتے ہیں۔فلسفی کے لیے جس میلان اور غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں سرے سے موجود نہیں۔اسی لیے شدت سے کہتا ہوں کہ موصوف اپنی یہ بچکانہ کتاب انگریزی میں چھپوائیں،مغربی دنیا کو بھی اس فلسفیانہ تماشے کا اندازہ ہو جائے گا۔اور اگر ہمیں اپنے''نابغہ'' کو شناخت کرنے میں غلط فہمی ہو رہی ہے تو یہ بھی دور ہو جائے گی۔ورنہ ہمارے فلسفی بھائی کی خوش فہمی تو ختم ہوگی۔

۴۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ترجمہ بلاحوالہ کا معاملہ ادب کی تاریخ کے حوالے ہو چکا۔عمران کا یہی ایک کام ہے جس کا تھوڑا بہت ذکر کیا جاسکے گا۔ان کے اس کام کو بھی ان دوسرے بہتر نقادوں اور دانشوروں کے کام کے تناظر میں ہی دیکھا جاسکے گا جو متعدد ادیبوں کے ترجمہ بلاحوالہ کی نشان دہی کر چکے ہیں۔اور انہوں نے ایسی نشان دہی کر کے کوئی اچھل کود بھی نہیں کی۔یوں ایک مجموعی کارکردگی میں عمران بھنڈر پچاس یا سو ادیبوں کے ترجمہ بلاحوالہ کی نشان دہی کیے جانے کا ایک پرسنٹ ہی داد سمیٹ پائیں گے۔اس داد پر جتنا خوش ہوسکتے ہیں،ہوتے رہیں۔

۵۔عمران شاہد خود بھی کاری گری کے ساتھ سرقات کا ارتکاب کر چکے ہیں۔اس سلسلہ میں ایک ثبوت پیش کر دیا گیا ہے۔

۶۔عمران شاہد بھنڈر جو سلمان شاہد بھنڈر کے نام سے خود ہی اپنی تعریف میں اور اپنے مخالفین کی مذمت میں مضامین لکھتے رہے ہیں،اس بارے میں اب یہ بات کھل گئی ہے کہ سلمان شاہد بھنڈر ان کا کم سن بیٹا ہے۔بچے کی قانونی حیثیت کیا ہے،ہمیں اس سے غرض نہیں ہے لیکن عمران بھنڈر ابھی تک خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کرتے رہے ہیں،تو دوسروں پر غلیظ اور جھوٹے حملے کرنے سے پہلے غیر شادی شدہ باپ کی حیثیت سے انہیں اپنی اخلاقی حیثیت کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔

ے۔''نوجوان فلسفی''ادب میں تخلیقی صلاحیت سے تو یکسر عاری ہیں،ان کی ادب فہمی پر بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔جب تک وہ اردو ادب کا قدیم سے جدید تک ایک عمدہ انتخاب کر کے،تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کر کے اپنی ادب فہمی کا ثبوت نہیں دیتے،وہ اس معاملہ میں ادبی طور پر خالی ہاتھ ہیں۔ادب میں ان کی حیثیت ایک درانداز سے زیادہ کچھ نہیں۔

(اسی شمارہ میں شامل مضمون''عمران بھنڈر کا سرقہ اور جعل سازی''سے اقتباس)

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیر اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

کتابی سلسلہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ: 18 (جنوری تا جون 2012ء)

مشیرِ خاص: ڈاکٹر شفیق احمد (بہاول پور)

مدیر: حیدر قریشی

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے

Haider Qureshi
Rossertstr.6 , Okriftel,
65795-Hattersheim, Germany.

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg786@arcor.de
haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: مصطفیٰ کمال پاشا

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6,(INDIA)
PH:23215162, 23214465, FAX: 0091-11-23211540
E-MAIL: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

Jadeed Adab ist kostenlos,man muss nur die Versndkosten Übernehmen.

فہرست

ایک گوشہ ترنم ریاض کے لیے

غزلیں

افسانے

نظمیں

خصوصی مطالعہ

ایک گوشہ نذیر فتح پوری کے لیے

ماہیے

کتاب گھر

گفتگو!

جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۷ کی گفتگو میں جدید ادب کی با قاعدہ عام اشاعت کا سلسلہ بند کرنے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔اس دوران میں اطمینان کے ساتھ اپنے دوسرے ادبی کاموں میں اور خاص طور پر جدید ادب کے میرا جی نمبر کی تیاری میں مصروف ہو گیا تھا۔لیکن اگست کے مہینے میں ایسی صورتِ حال بننا شروع ہوئی کہ پھر یہ عام شمارہ شائع کرنا لازم ہو گیا۔

میں نے جولائی ۲۰۱۱ء میں ایک مضمون لکھا تھا ''فلسفی کی نو جوانی اور شیلا کی جوانی''۔اصلاً یہ عمران بھنڈر کا مجھ پر کچھ قرض تھا جس کی اس میں ادائیگی کی گئی تھی۔ میں نے اس مضمون کو چھاپنے اور ریلیز کرنے سے پہلے چند خاص احباب کو بھیجا اور ان کی رائے مانگی۔شمس الرحمٰن فاروقی صاحب،سی ایم نعیم صاحب اور محمد عمر میمن صاحب نے اس مضمون کے بارے میں اپنی اپنی رائے سے نوازا۔ فاروقی صاحب نے بھنڈر کے تعلق سے میرے موقف کو تو پسند کیا لیکن اپنے بعض خدشات سے بھی آگاہ کیا۔سی ایم نعیم صاحب کو جب میں نے اس نوعیت کے خدشات کی خبر دی تو انہوں نے بہت صاف گوئی کے ساتھ لکھا کہ:

''یہ تو بہت افسوسناک بات ہوئی۔لیکن آپ نے ان کے مضامین چھاپے تھے،اس لیے یہ فرض بھی آپ پر عائد ہوتا تھا۔آپ کی دیانت داری کا یہی تقاضہ تھا۔نارنگ صاحب کے احباب کی خوشی یا ناخوشی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

حقیقت یہ ہے کہ سی ایم نعیم صاحب کے اس اصولی اور بے لاگ موقف نے مجھے بڑی تقویت دی اور میں نے اس سے ہمت پا کر بھنڈر کے بارے میں اپنا مضمون شائع بھی کرایا اور اسے انٹرنیٹ پر ریلیز بھی کرا دیا۔اس دوران ادبی زبان میں اور ادبی سلیقے کے ساتھ کوئی جواب اور الجواب چلتا رہتا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں تھا لیکن شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے مجھے جن خدشات سے آگاہ کیا تھا،اس کے عین مطابق پروپیگنڈہ اور افواہ سازی کا بازار گرم کر دیا گیا۔البتہ اس سارے عمل کے دوران حیرانی یہ رہی کہ یہ سارا کام کوئی اور نہیں،خود فاروقی صاحب کے کارندے کر رہے تھے، کرا رہے تھے۔اس سلسلہ میں کچھ تفصیل میرے مضمون ''عمران بھنڈر کا سرقہ اور جعل سازی'' میں آ گئی ہے،اسے یہاں دہرانا مناسب نہیں۔بس اس ساری واردات کے بعد لازم ہو گیا کہ اس تازہ ترین معرکہ کی روداد یک جا کر دی جائے۔اسی لیے جدید ادب کا شمارہ نمبر ۱۸ شائع کیا جا رہا ہے۔

جن دنوں میں میری طرف سے اور میرے دوستوں کی طرف سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے دوستوں کے ساتھ معرکہ زوروں پر تھا،تب بھی عمران بھنڈر کے ساتھ میری بول چال بند تھی۔شہرت طلبی کے لیے کسی سطح کی بھی دھوکہ بازی کر سکنے والے ان صاحب کے ساتھ ۲۰۰۸ء سے میرا حساب کتاب چلا آ رہا تھا اور وہ حساب بے باق کرنا لازم تھا۔میں ایک وقت میں دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتا تھا۔اب جبکہ ایک محاذ پُر امن ہوا ہے تو

میرے لیے عمران بھنڈر کے ساتھ اپنا پرانا معاملہ طے کرنا آسان ہو گیا۔ میں نے اپنے مضمون ''فلسفی کی نو جوانی اور شیلا کی جوانی'' میں ان کا قرض اتار دیا۔اس مضمون میں شمس الرحمٰن فاروقی یا کسی بھی اور بزرگ کے خلاف کچھ بھی نہیں تھا۔فاروقی صاحب یا کسی بھی دوسرے سینئر بزرگ کے ساتھ میرا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔اب بھی میری طرف سے بالکل جھگڑا نہیں ہے۔میرا مضمون خالصتاً میرے اور عمران بھنڈر کے تعلق کے حوالے سے تھا۔لیکن افسوس صد افسوس کہ پھر اس معاملہ میں فاروقی صاحب کے کارندے کود پڑے۔ان کے ساتھ پھر جو کچھ ہوا اس کی پوری روداد تیار ہو گئی۔اور اب یہ سب کچھ اس شمارہ میں یکجا کر دیا ہے۔

میرا اب بھی یہی موقف ہے کہ میرے اور عمران بھنڈر کے قضیہ میں اور کسی کے ساتھ میرا جھگڑا نہیں ہے۔تاہم اس سلسلہ میں کسی نے کچھ لکھنا ہے تو میری ساری متعلقہ تحریروں کو پوری طرح اور غور سے پڑھ کر اظہارِ خیال کریں۔ایسا نہ ہو کہ وہ سوال کیا جائے جس کا جواب پہلے سے مضامین کے اندر موجود ہو۔بہر حال مضامین کو بغور پڑھنے کے بعد احباب کی بات درست ہو گی تو کھلے دل کے ساتھ اسے تسلیم کروں گا،غلط اعتراض ہو گا تو اس کا مناسب طریقے سے جواب دوں گا۔کچھ مزید وضاحت طلب ہو گا تو وضاحت کر دوں گا کیونکہ جتنا کچھ اب تک لکھ چکا ہوں،لگ بھگ اتنے ہی مزید حقائق بھی موجود ہے،سو اس طرح ان حقائق کو سامنے لانے کا موقعہ مل جائے گا۔

یہ عام شمارہ اگرچہ بظاہر اپنے وقت پر آ رہا ہے،تاہم میرے لیے یہ اچانک ہی ہے۔اسی وجہ سے اس بار خطوط کا سیکشن شامل نہیں کر رہا۔تاہم ڈاکٹر انور سدید،شمس الرحمٰن فاروقی،عبداللہ جاوید،سہیل اختر،حمیدہ معین رضوی،سلیم آغا قزلباش،ناصر عباس نیر،خادم علی ہاشمی،اور متعدد دیگر احباب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے جدید ادب شمارہ ۱۷ پر اپنے گراں قدر خیالات سے نوازا تھا۔ان سب کی گراں قدر اور حوصلہ افزا آراء میرے پاس محفوظ ہیں۔

سال ۲۰۱۲ء میں میرا جی کی پیدائش کے سو سال پورے ہو رہے ہیں۔اس مناسبت سے جدید ادب کا اگلا شمارہ ''میرا جی نمبر'' ہو گا۔جو احباب میرا جی کے فن کی کسی جہت پر کچھ لکھ سکیں وہ بروقت بھیج دیں۔

حیدر قریشی

پڑھنے داناں مان کریں تے ناں آکھیں میں پڑھیا
او جبار،قہار سدا وے، متاں روڑھ سٹّی دُدھ کڑھیا
(**میاں محمد بخش** کی **سیف الملوک سے**)
ترجمہ:اپنی پڑھائی اور اپنے مبلغ علم کا تکبر مت کرنا۔وہ خدا جبار اور قہار بھی ہے، وہ ناراض ہو جائے تو کاڑھا ہوا دودھ بھی ضائع کر دیتا ہے۔

حمدیہ

رباعیاتِ غالب کا ترجمہ

صبا اکبرآبادی

راہیست ز عبد تا حضور اللہ
خواہی تو دراز گیرو خواہی کوتاہ
ایں کوثر وطوبیٰ کہ نشانہا دارد
سرچشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

☆

اک راستہ بندے کا ہے تا ذاتِ الٰہ
تُو اس کو طویل کردے چاہے کوتاہ
یہ کوثر وطوبیٰ تو ہیں بس صرف نشاں
ہو چشمہ وسایہ کوئی جیسے سرِ راہ

......O.....

ہر چند کہ زشت و ناسزائیم ہمہ
در عہدۂ رحمت خدائیم ہمہ
در جلوہ دہد چنانکہ مائیم ہمہ
شائستۂ نفت وبوریائیم ہمہ

☆

حالانکہ خراب وناسزا ہیں ہم سب
ہاں طالبِ رحمتِ خدا ہیں ہم سب
تُو جلوہ نما ہو، ہم ہیں جیسے بھی ہیں
شائستۂ خاک وبوریا ہیں ہم سب

حمدِ ربِّ جلیل

حفیظ انجم (کریم نگر)

غفار ہے، جلیل ہے، محمود ہے خدا
سب جانتے ہیں سب کا ہی معبود ہے خدا

جالب نظر وہی ہے اسی کی کرو ثناء
بے شک ہر ایک شخص کا بہبود ہے خدا

ایسی جگہ نہیں ہے جہاں پر خدا نہ ہو
دل میں بسا ہے، سانسوں میں موجود ہے خدا

تو لا زوال اور تو ہی لا شریک ہے
قرآن کہہ رہا ہے کہ مشہود ہے خدا

تو ذُوالجلال اور کتاب آئینہ تری
منصف ہے خیر و شر کو تو مسجود ہے خدا

سب کے دلون میں رہتا ہے آتا نظر نہیں
اس لا مکاں وجود کا اک بود ہے خدا

انجم سفر طویل ہو کہ مختصر مِرا
میں جانتا ہوں منزلِ مقصود ہے خدا

حمدِ خدائے عزوجل

عزیز الرحمٰن عزیز سلفی

شکر و سپاس لائق پرور دگار ہے
خلّاق ہے جو کون کا جو کر دگار ہے
مالک جزاء کے دن کا ہے، رحمان ہے تو ہی
ہاتھوں میں تیرے گردش لیل ونہار ہے
محتاج تاج پوش ہو، تو شہ کو کر فقیر
قسّام رزق، مالک بااختیار ہے
پانی کے ایک قطرے کو صورت حسیں دیا
شکم صدف میں موتی ترا شاہکار ہے
رحمت سے اپنی پیاس میں پانی عطا کیا
قدرت سے تیری آتی خزاں ہے ،بہار ہے
تونے فلک کو تاروں کا زیور عطا کیا
سورج بھی تیرے ملک کا خدمت گذار ہے
قائم ہے تو ازل سے، ابد تک رہے گا تو
تیری ہی ذات باقی ہے، تو پائدار ہے
تو ایک لاشریک ہے، بے مثل، ذوالجلال
محتاج ہے زمانہ ترا، روزگار ہے
ہرشے میں حسن تیرا، ہویدا ہے تیری ذات
پھولوں کے حسن ورنگ کا توخوش نگار ہے
دنیا و آخرت میں تو امن و اماں سے رکھ
آتی دعا یہ لب پہ مرے بار بار ہے
یارب عزیزؔ تیرے ہی در پہ جھکار ہے
جب تک جہاں میں زندگیِ مستعار ہے

نعت

صبا اکبرآبادی

سکھایا ہے یوں زندگی کا قرینا
ہمیں آگیا ہے سلیقے سے جینا
عزیز اُن کو ہے خاکساریؔ عزیزو!
یہی ہے خلوص و محبت کا زینا
تمہاری نگاہوں کے سب فیصلے ہیں
مرا کچھ نہیں ہے ،نہ مرنا نہ جینا
ہیں آنکھوں سے دل تک تمہارے ہی جلوے
اُدھر بھی مدینہ ، اِدھر بھی مدینا
یہ جی میں ہے کہتا رہوں تا بہ محشر
محمد ﷺ محمد ﷺ مدینہ مدینا
شفاعت کرو میری مزدور ہوں میں
اور اب خشک ہونے لگا ہے پسینا
ہے اُن کی جدائی کا غم مجھ کو یارو
نہ چھیڑو چھلک جائے گا آبگینہ
مرے دل میں ہے رازِ توحید پنہاں
ملا ہے یہ اُن کی نظر سے خزینہ
صبا اک جام پینا ہے ہم کو وہیں پر
بڑی شان کا میکدہ ہے مدینہ

نعت النبیؐ

صادق باجوہ (میری لینڈ، امریکہ)

مِدحتِ مصطفیٰؐ کے ساتھ، روحِ عمل بھی ہو کہیں
وِردِ زباں بھی خوب ہے، فردِ عمل بھی ہو حسیں
جلوہ گہہِ حبیب کا، در تو سدا سے ہے کھلا
جلوۂ خاص کے امیں، آئے نظر کہیں کہیں
محوِ درود اِنس و جاں، جس کی ثنا میں ہے خدا
ایک ہی مجتبیٰؐ تو ہے، کوئی بھی دوسرا نہیں
کون و مکاں کی وُسعتیں، ارض و سما کی رِفعتیں
بارِ گراں نہ سہہ سکِیں، اُس نے اُٹھا لیا وہیں
جن کو سمجھ رہے تھے لوگ، قابلِ دید ہی نہیں
حسنِ نظر سے ہو گئے، سارے جہان سے حسیں
سَوز نوائے درد نے، پایا بفیضِ مصطفیٰؐ
حاصل سرورِ جاں ہوا، دل ہو گیا ہے پُر یقیں
کیسی لگن سی لگ گئی، کس کی تلاش میں ہے دل
بھول بھلیّوں میں گم، ہو نہ یہ جائے پھر کہیں
خالی مکان دیکھ کر، شاید کچھ اِلتفات ہو
صادقؔ نکال پھینکئے، دل میں بسے ہوئے مکیں

نعتیہ

حفیظ انجم

مجھ سے کیا ہو گا گُن گان
میں ہوں انساں اک نادان
آپؐ سے دنیا کا نرمان
کہتا ہے ہم سے قرآن
آپؐ دَیا کے ساگر ہیں
اور محبت کی ہے کھان
غیروں کے، اپنوں کے بھی
آپؐ نے جھیلے سو اپمان
آپؐ سے پہلے دنیا میں
انسانوں میں تھا اگیان
ہم بندے ہیں گندے ہیں
آپؐ ہیں اُجوَل، آپؐ مہان
آپؐ کے پتھ پر چلنے کی
ہم کو شکتی دے بھگوان
رب جن کا سمّان کرے
ہم سے بھلا کیا ہو سمّان
آپ کو دیکھوں خوابوں میں
ایسا دے بھگوَان وردان
صرف خدا کے بعد انجمؔ
آپؐ کا اونچا ہے استھان

دعا

حفیظ انجم

مجھ پہ کرم تو اتنا کر دے   میرا گھر خوشیوں سے بھر دے
اچھی باتیں گھر گھر کر دے   ان باتوں کے موتی بھر دے
خواہش دنیا کی کم کر دے   مجھ کو وفا کا پیکر کر دے
تیرا تقویٰ میرا مسلک   مجھ کو مسلماں سچا کر دے
چاک کروں گا سینوں کو میں   میرے قلم کو نشتر کر دے
عقل ٹھکانے لگ جائے گی   وقت کے ہاتھوں میں پتھر دے
اُڑتا پھروں گا پنچھی بن کر   اُڑنے والے بال و پر دے
دھوپ اترتی ہے آنگن میں   کوئی سایہ دار شجر دے
داغ لگے ہیں دنیا بھر کے   زیست کو اُجلی چادر کر دے
رم جھم، رم جھم، رم جھم، رم جھم   پانی برسا، جل تھل کر دے
حشر کے دن تو اپنے کرم سے   سب کی پریشانی کم کر دے

دور بہت ہے منزل میری
انجم کو تو اذنِ سفر دے

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

یورپ بہ طور کبیری بیانیہ

نوآبادیاتی نظام کسی داخلی دباؤ کے تحت بیانیے کی قوّت دریافت کرتا ہے یا طاقت کی مختلف شکلوں کی دریافت و تشکیل کے دوران میں بیانیہ، قوّت کے عظیم مخزن کے طور پر اس کے ہاتھ لگتا ہے؟ اس سلسلے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے، مگر یہ بات غیر مشتبہ ہے کہ بیانیے کو نوآبادیاتی طرزِ حکم رانی میں ایک بنیادی ستون کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں اس نظام کی چُولیں ڈھیلی کرنے میں ایک اہم کردار بھی بیانیے ہی کا ہوتا ہے، یعنی ان متبادل بیانیوں کا جنھیں مقامی لوگ، اجنبی حکم رانوں کے وضع کردہ اور رائج کردہ بیانیوں کے مقابلے میں تشکیل دیتے اور عامۃ الناس کے عمومی شعور کا حصّہ بنانے میں کام یاب ہوتے ہیں۔ متبادل بیانیے دراصل ان تضادات کی قلعی کھولتے ہیں جنھیں آبادکار مخفی و مضمر رکھنے کی خاطر اپنے مخصوص بیانیے تراشتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نوآبادیاتی ممالک میں حاکم و محکوم کے درمیان اصل جنگ بیانیے کی قلم رَو میں، بیانیے وضع کرنے کی استعداد اور انھیں رائج کرنے کے وسائل کی مدد سے لڑی جاتی ہے۔ تاہم واضح رہے کہ جنگ کے میدان اور جنگ کے آلات کا اوّلاً انتخاب محکوم نہیں کرتا۔ وہ زیادہ تر دفاعی محاذ پر ہوتا ہے۔ اس کے بیانیے ردِّعمل، بغاوت، بچاؤ اور آزادی سے عبارت ہوتے ہیں۔

یہ اچنبھے کی بات نہیں کہ استعماری حاکموں کے پاس بیانیے کی تھیوری موجود نہیں ہوتی اور نہ ہی تھیوری تشکیل دینے کی باقاعدہ کوشش کی جاتی ہے، مگر بیانیے کو ثقافتی و نفسیاتی تبدیلیوں کے ایک عظیم وسیلے کے طور پر کام میں لایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیانیہ ہو یا فن کی کوئی دوسری شکل، اس کی تھیوری بعد میں تشکیل دی جاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تھیوری تشکیل پانے کے بعد فن پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ استعماری بیانیوں کی اثر انگیزی کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انھیں انسانی ادراک کی دو معروف صورتوں میں امتیاز کے نتیجے میں بروے کار لایا جاتا ہے۔ انسان عمومی طور پر منطقی/ سائنسی اور بیانیہ انداز میں اشیا کا علم حاصل کرتا اور ان کے بارے میں آرا قائم کرتا ہے۔ منطقی انداز، تجریدی تصورات قائم کر کے اشیا کی صداقت تک پہنچتا ہے، اس لیے یہ ایک رسمی اور منظّم اندازِ فکر ہے، جب کہ بیانیہ انداز، مادی، واقعاتی، دنیوی، غیر رسمی اور روزمرہ انداز ہے۔ فکر کے منطقی طور کو صداقت درکار ہوتی

ہے اور بیانیہ طور کو زندگی! دونوں میں یہی امتیاز، دونوں کی اثر انگیزی کو قوّت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ منطقی طور کے مقابلے میں مادی، واقعاتی اور روزمرہ انداز ہونے کی بنا پر بیانیہ طور زندگی پر زیادہ شدّت اور کثرت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ عمومی طور پر ہم منطقی کے بجائے بیانیہ طرزِ فکر کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔

بیانیے کا زندگی سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ ہم یہ حتمی طور پر ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ بیانیہ زندگی کی نقل ہے یا زندگی بیانیے کی نقل کرتی ہے، مگر اتنا ہم وثوق سے جانتے ہیں کہ ہماری زندگیاں اُسی ڈھب پہ گزرتی ہیں، جس کا نقشہ ہمارے ثقافتی بیانیوں میں موجود ہوتا اور ہم ان بیانیوں کو بغیر کسی ردّ وکد کے اس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ یہ بیانیے اوّلین لمحوں میں ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ ان کا خمیر ہماری روزمرہ زندگی کے تجربوں، ارادوں اور خوابوں ہی سے اٹھا ہے۔ بیانیے ہماری سماجی زندگی کا ڈی این اے ہیں۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ بیانیہ صرف کتھا کہانی میں ہوتا ہے، مگر بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ساختیات اور بیانیات کے مفکرّین نے واضح کیا کہ فکر کے ایک طور کی صورت بیانیہ ہر جگہ اور ہر چیز میں ہے۔ رولاں بارت لکھتے ہیں:

''بیانیہ، اسطور، لیجنڈ، حکایت، کتھا، ناویلا، رزمیے، تاریخ، المیے، ڈرامے، طربیے، سوانگ، مصوّری...... منقش شیشے، سینما، مطائبات، خبروں، گفتگو میں موجود ہے۔ ہیئتوں کی اس تقریباً لامحدود کثرت کے علاوہ، بیانیہ ہر عہد، ہر جگہ، ہر معاشرے میں موجود رہا ہے، اس کا آغاز بنی نوع انسان کی تاریخ کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور کہیں کوئی شخص بیانیے کے بغیر موجود نہیں رہا...... اچھے اور برے ادب کی تقسیم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، بیانیہ بین الاقوامی ہے، تاریخ وثقافت میں ہمیشہ سے جاری وساری ہے: ؓؓ زندگی کی مانند یہاں موجود ہے۔''۱

گو بارت کا یہ اقتباس خطابت سے لبریز ہے، مگر اس حقیقت کو منکشف کرنے میں پوری طرح کام یاب ہے کہ بیانیہ ایک آفاقی، لازمانی چیز ہے؛ ہمارے ثقافتی وجود کا کوئی پہلو اور ہماری نفسیاتی وتخیّلی دنیا کا کوئی گوشہ بیانیے سے خالی نہیں اور بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ''عملاً تمام انسانی علم ان کہانیوں پر منحصر ہے، جنھیں ماضی کے تجربات کے گرد تشکیل دیا جاتا ہے اور نئے تجربات کی تفہیم وتعبیر پرانی کہانیوں کے معنوی سیاق میں کی جاتی ہے۔''۲ اگر یہاں تمام انسانی علم سے سماجی وثقافتی علم مراد ہے تو اس دعوے کے بجا ہونے میں کوئی شک ہی نہیں، تاہم جہاں تک سائنسی علم کا تعلق ہے تو وہ مشروط طور پر کہانیوں پہ منحصر ہے۔ سائنسی علم کا تعلق فکر کے منطقی، تجرباتی طور سے ہے، مگر کسی بھی سائنسی نظریے کے وجود میں آنے کا پورا عمل دراصل ایک کہانی ہے۔ لہٰذا تمام سماجی وثقافتی علم کو 'بیانیاتی علم' بھی کہہ سکتے ہیں اور اس علم میں، ہیئتوں کی وہ لامحدود کثرت شامل ہو جاتی ہے، جس کا ذکر بارت نے کیا ہے۔ یہاں اصل نکتہ یہ ہے کہ انسانی علم کی بنیادی ساخت ''بیانیاتی'' ہے۔ کسی معمولی واقعے کا ادراک ہو، اس کی تعبیر ہو یا سماج اور کائنات سے انسان کے رشتوں کے تعیّن کا فلسفیانہ سوال ہو، تاریخ کی تحریر وتشکیل ہو یا سماج

میں نئی گروہ بندیوں اور نئے خیالات ونظریات کی ترویج کا معاملہ ہو، کم وبیش ایک ہی قسم کی بیانیاتی سرگرمی، ان سب میں مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ گویا بیانیہ معنی سازی اور معنی کی ترسیل کا مخصوص طریقہ ہے جو کسی ایک شعبے سے مخصوص نہیں ہے۔

اب اصل سوال یہ ہے کہ بیانیے کی وہ کیا ساخت یا شعریات ہے جو ایک اسطورہ سے لے کر ان تمام فکری نظاموں اور ثقافتی منصوبوں میں کارفرما ہوتی ہے، جنھیں دوررس سماجی تبدیلیوں کی خاطر وضع کیا جاتا ہے؟ مختصراً ''کسی نمایندگی کو، خواہ وہ ذہنی ہو یا لسانی نشانیاتی، ایک بیانیے کا درجہ پانے کے لیے، دو بنیادی خصوصیات کا حامل ہونا اشد ضروری ہے۔ اس میں ایک قسم کا ماخذ اور ایک قسم کی زمانی ساخت لازماً موجود ہو۔''۳

ماخذ بیانیے کی شعریات کے پہلے بنیادی اصول کے طور پر اسے زندگی سے اثر قبول کرنے اور زندگی پر اثر انداز ہونے کی دوہری اہلیت سے ہم کنار کرتا ہے اور زمانی ساخت، بیانیے کو وہ مخصوص ہیئت دیتی ہے جس کی بنا پر بیانیہ دوسری اصناف اور علوم سے مختلف ہو جاتا ہے۔ بادشاہ مرا اور ملکہ بھی مر گئی۔ اس بیانیے میں سادہ ترین اور اتنی ہی مکمّل ساخت موجود ہے۔ اس مختصر بیانیے کا ماخذ بادشاہت ہے جس میں ایک شخص کو مرکزی اور کبیری حیثیّت حاصل ہوتی ہے اور باقی سب اس پر منحصر اور اس کے معاون وخدمت گار ہوتے ہیں۔ اس ماخذ میں یہ بات اصول کا درجہ رکھتی ہے کہ بادشاہ مرے تو ملکہ کو بھی موت آ جائے۔ کہانی میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ماخذ حقیقی ہے، تخّیلی ہے، آرزومندانہ ہے یا ایسا ممکن جو فی الوقت ناممکن نظر آتا ہو۔ اصل یہ ہے کہ وہ ہمارے تجربات اور تصوّر کائنات میں خود کو ایک یقینی امکان کے طور پر پیش کرتا ہو۔ جہاں تک بیانیے کی زمانی ساخت کا معاملہ ہے تو یہ ساخت واقعات میں زمانی تسلسل یعنی بیانیے میں ماضی، حال اور مستقبل کی نشان دہی کرتی ہے، مگر حقیقتاً بیانیوں میں ''ایک ایسا حال تخلیق کیا جاتا ہے، جس میں ماضی اور مستقبل بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور اسی بنا پر ؓؓ ہر بات کو ممکن بناتا ہے''۴ ماضی ومستقبل کا حال میں انضمام ہی بیانیے کو ہمیشہ کی زندگی دیتا اور ہمیشہ کے لیے زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت دیتا ہے۔ مذکورہ انضمام کی عملی صورت یہ ہے کہ بیانیے کے وقوعاتی عناصر کو ایک ایسے مسلسل لمحۂ حال میں بیان کیا جائے، جس میں ماضی ومستقبل عملاً وجود نہ رکھتے ہوں، مگر ان کا وجود میں آنا اور کسی حقیقی یا تخّیلی ماخذ سے منسلک ہو کر زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت حاصل کر لینا ممکن ہو۔ بادشاہ کی موت کہیں بھی، کسی بھی وقت ممکن ہو سکتی اور بعد کے واقعات کی محرک ہو سکتی ہے۔ بیانیہ ماضی کی حال میں موجودگی اور ماضی کی حال سے مطابقت کو کچھ اس طور ممکن بناتا ہے کہ دونوں کی سرحدوں، دونوں کے آغاز واختتام کو ممیّز کرنا محال ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے بیانیہ زماں کی ایک نئی تشکیل کرتا ہے اور اسی انوکھی زمانی تشکیل سے غیر معمولی قوّت کشید کرتا ہے۔

نوآبادیاتی حکمران تاریخ اور زماں سے ایک پل کے لیے غافل نہیں ہوتے۔ نوآبادیاتی نظام ہو یا

کوئی دوسرا معاشی و ثقافتی ایجنڈا، تاریخ اور زماں پر دست رس حاصل کرنے اور اس کی تشکیل نَو کرنے سے عبارت ہے۔ یہی وہ سیاق ہے، جس میں نوآبادکار بیانیے کی اثر انگیزی اور طاقت سے متعارف ہوتا ہے۔

لارڈ میکالے کے بہنوئی چارلس ایڈورڈ ٹریویلین نے ۱۸۳۸ء میں ہندستانیوں کی تعلیم سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس ثقافتی منصوبے کا پورا خاکہ موجود ہے، جسے برصغیر کی تہذیبی و نفسیاتی قلبِ ماہیت کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ٹریویلین برصغیر میں برطانوی حکومت کی سیاسی تقدیر کا تجزیہ کرتے ہوئے یا تاریخ پر دست رس حاصل کرنے کی تدبیر کرتے ہوئے یہ رائے دیتے ہیں کہ انگلستان کی کوئی پالیسی ہندوستان کو انجام کار آزادی حاصل کرنے میں مانع نہیں ہوسکتی۔ اس کی مستقبل بینی کی بنیاد دراصل اس فرق و امتیاز کا شدید احساس ہے جو دونوں ملکوں میں مذہبی و ثقافتی سطحوں پر موجود ہے۔

اس فرق کو مٹانا ممکن ہے یا نہیں، یہ سوال اٹھایا ہی نہیں جاتا۔ اس لیے کہ فرق کے خاتمے کا مطلب اس سیاسی نظام اور ثقافتی منصوبے ہی کو چوپٹ کرڈالنا ہے جو استعماری صورتِ حال کو وجود میں لاتا اور اپنے اثمار سے آبادکار کی جھولی بھر دیتا ہے۔ دوسری طرف مقامی باشندوں کے لیے اس فرق کو قبول کرلینا اور اس سے نباہ کرنا ممکن نہیں۔ چناں چہ ٹریویلین یہ رائے قائم کرتا ہے کہ ہندوستان بالآخر آزادی حاصل کرے گا اور نوآبادیات کے سیاسی مدبّر کے طور پر، اس کی آزمایش بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ آزادی کو کب تک موخّر کرنے کی کوئی حکمتِ عملی تجویز کرسکتا ہے اور برصغیر کے باشندوں کو آزادی حاصل کرنے کے ممکنہ طریقوں میں سے کسی ایسے طریقے کو اختیار کرنے پر مجبور کرنے کا کوئی لائحہ عمل پیش کرسکتا ہے، جو آبادکار کے مقاصد سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو؟ اس کے نزدیک غلام ہندوستان کے پاس آزادی حامل کرنے کے دو راستے ہیں:

ان میں سے ایک، انقلاب کے ذریعے سے آزادی حاصل کرنے کا راستہ ہے؛ دوسرا اصلاح کے ذریعے سے۔ ایک میں پیش قدمی اچانک اور متشددانہ ہے؛ دوسرے میں یہ بتدریج اور پُرامن ہے۔ ایک لازمی طور پر ہمارے اور دیسی باشندوں کے درمیان ذہن کی مکمل بیگانگی اور مفادات کی علیٰحدگی پر منقسم ہوتا ہے؛ دوسرا ایک مستقل اتحاد ہے، جو باہمی فائدے اور خیرخواہی پر مبنی ہے۔ ۵

وہ مزید واضح کرتا ہے کہ انقلاب کے ذریعے فقط ایک ماہ میں ''مرہٹہ یا اسلامی ملوکیت'' قائم کی جاسکتی ہے (یاد رہے ابھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزاری میں انیس برس باقی تھے) مگر اصلاح کے ذریعے آزادی حاصل کرنے میں ہندستان کو ایک صدی درکار ہوگی۔ (یہ پیش گوئی سو فی صد درست ثابت ہوئی۔)

ٹریویلین اس یقین سے سرشار ہے کہ وہ غلام ہندوستان سے متعلق اس علم کو انگلستان کی طاقت میں بدل سکتا ہے۔ اس کا یہ علم ہی کہ ہندوستانی آزادی حاصل کرنے کے لیے تشدّد یا امن کے راستے کا انتخاب کرسکتے ہیں، اسے ہندوستانیوں پر اختیار دے دیتا ہے۔ اس اختیار کا صاف سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ نوآبادیاتی حکم ران

ہندوستانیوں کی انتخاب کی صلاحیت اور انتخاب کے مواقع پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ ٹریویلین اس اختیار کر بروے کار لانے ہی میں نوآبادیاتی نظام کی بقا اور انگلستان کا مفاد دیکھتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس اختیار کا مظاہرہ بیانیہ وضع اور رائج کرنے کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ یورپی تہذیب کی آفاقیت اور برتری کا کبیری بیانیہ! اسے اس امر میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ بیانیہ ایک ایسی قوّت تخلیق کرسکتا ہے جو دیسی باشندوں کی خواہشِ انقلاب کی تُند موجوں کے آگے بند باندھ سکتی ہے۔ ہر چند اس کتاب کی تصنیف کے انیس برس بعد ہندستانیوں نے انقلاب و تشدّد کا راستہ اختیار کیا جس میں انھیں ناکامی ہوئی، مگر بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ یورپی تہذیب کے بیانیے نے طلسماتی اثر پیدا کیا اور برصغیر میں آزادی کی تحریکیں زیادہ تر اسی راستے پر چلیں جس کا خاکہ ٹریویلین کے یہاں ملتا ہے۔

ٹریویلین اس سوال کو نظر انداز نہیں کرتا کہ انقلاب یا اصلاح کے راستے کے انتخاب کا محرک کیا ہوسکتا ہے اور اس محرک پر کیسے اثر انداز ہوا جاسکتا ہے؟ قومی شناخت؟ معاصر صورتِ حال؟ وہ یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ اگر ہندوستانیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ فی الفور اپنے ماضی کی طرف پلٹ جائیں گے یعنی معاصر یورپی اثرات کی طرف پیٹھ کرلیں گے اور اپنی قومی شناخت کے احیا کی متشددانہ کوشش کریں گے اور اگر اس راہ میں انگریزی حکومت اور اس کے ثقافتی مظاہر کو حائل دیکھیں گے تو انھیں انقلابی جوش سے ملیامیٹ کردیں گے۔ نوآباد کاروں کے لیے یہ ایک بھیانک اور ڈراؤنا تصوّر رہے۔ اس تصور کو حقیقت میں بدلنے سے روکنے کے لیے ٹریویلین وہ اصلاحاتی ایجنڈا پیش کرتا ہے، جس میں مرکزی حیثیت ہندوستانیوں کی یورپی طرز پر اصلاح کو حاصل ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس اصلاح کے نتیجے میں ''وہ ہندوستانی تہذیب قدیم ہندوستانی بنیاد پر آزادی کی خواہش اور قصد کرنا ترک کردیں گے۔ پھر اچانک تبدیلی ناممکن ہوجائے گی؛ اور ہندستان کے ساتھ ہمارے موجودہ تعلق کا طویل مدّت تک جاری رہنا یقینی ہوجائے گا'' ۶ گویا یہی وہ طریقہ ہے جو ہندوستانیوں کے انتخاب کے موقع اور محرّک پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ اس کے نزدیک یورپی خیالات ہندوستانیوں کو ایک نئی شناخت دیں گے اور یہ شناخت انھیں قدیمی قومی شناخت کی طرف راجع ہونے سے بے نیاز کردے گی۔ شناختوں کے انہدام و تاسیس کا یہ ایک غیر معمولی منصوبہ تھا جسے یورپی ثقافت کے آفاقی اور تہذیب آموز ہونے کے کبیری بیانیے کی مدد سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔

ایرک سیلبن نے حال ہی میں اپنی شایع ہونے والی کتاب میں مغربی ثقافت کے تہذیب و جمہوریت آموز ہونے کے بیانیے کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ اس کے مطابق اس کہانی میں مغربی ثقافت کو دیگر ثقافتوں کے مقابل رکھا گیا اور ممتاز قرار دیا گیا ہے اور جن باتوں کو وجہِ امتیاز قرار دیا گیا ہے ان میں فنون، سائنس، سیاسی طور طریقے اور فلسفیانہ مذہبی اصول ہیں ۷ مغربی ثقافت کے یہ امتیازات کہاں تک بجا اور بے جا ہیں، اس سے فی الوقت بحث

نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانی صدیوں سے رائج اور مقبول چلی آ رہی ہے اور اسے سامراجیت اور عالم کاری (گلوبَلائزیشن) کے ذریعے دنیا بھر میں پھیلایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ کہانی ہے جو مغرب اور مشرق یا 'ہم' اور 'وہ' کے تصوّرات تشکیل دیتی اور ان میں اٹوٹ مگر غیر مساوی رشتہ قائم کرتی ہے۔

اس کہانی کا جو متن ہندوستان کے لیے تیار ہوا، اس میں بری کولاژ کے فن سے بطورِ خاص استفادہ کیا گیا۔ یہ فن ''ایک ایسی صلاحیت کا اظہار ہے جس کے ذریعے دست یاب مواد اور آلات سے طرح طرح کے بے شمار کام کیے جا سکتے ہیں''۸ چناں چہ برّصغیر میں یورپی ثقافت کے تہذیب آموز ہونے کا بیانیہ لکھنے والے دراصل بری کولیئر (bricoleur) تھے۔ انھیں اس بیانیے سے طرح طرح کے بے شمار کام لینے کے لیے، جو کچھ یہاں وہاں (مشرق و مغرب) سے دست یاب ہوا یا جسے موزوں سمجھا، اسے کہانی میں کھپا دیا۔ انھیں کہانی کے پلاٹ کے گٹھے یا ڈھیلے ہونے، واقعات میں تضاد ہونے، منتخب مواد کے مستند یا غیر مستند ہونے سے غرض نہیں تھی۔ ایک چیز پہ انھیں بہ ہر حال یقین تھا: بیانیے کی قوّت اور اثر پر۔ اس یقین کی بنیاد یہ علم تھا کہ بیانیے کی قوّت اس کے مواد کے تاریخی طور پر مستند یا غیر مستند ہونے میں مضمر نہیں، اس کو کمال مہارت سے بیانیے میں صرف کرنے میں ہے۔ انھیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ بیانیے میں ماخذ بے حد اہم مگر ماخذ کی نوعیّت (حقیقی یا تخیّلی) غیر اہم ہے۔

یورپی ثقافت کی کہانی کے ہندوستانی متن کا آغاز یورپ اور ہندوستان کے ماضی کے تقابل سے ہوتا ہے۔ میکالے کے یہ جملے ''یورپ کی کسی اچھی لائبریری کی الماری میں ایک تختے پر رکھی ہوئی کتابیں، ہندوستان اور عرب کے مجموعی سرمایۂ علمی پر بھاری ہیں۔'' اور ''یقین جانیے مجھے کوئی بھی ایسا مستشرق نہیں ملا جس نے یہ دعویٰ کرنے کی جسارت کی ہو کہ عربی اور سنسکرت کے شعری سرمائے کا عظیم یورپین اقوام کی تخلیقات شعری سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔''۹ اس کہانی کے تمہیدی ٹکڑے ہیں جن کی تخلیق میں میکالے نے اپنی ترغیب انگیز خطابت کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی قوّت اور اثر انگیزی کا انحصار تاریخی سچائیوں پر نہیں، تاریخ کو بری کولاژ کے فن کے ذریعے کمال سے مصرف میں لانے پر ہے؛ دوسرے لفظوں میں تاریخ کی تشکیلِ نو پر ہے۔

جیسے جیسے ہم اس کہانی کے اگلے ٹکڑوں کا مطالعہ کرتے ہیں، تاریخ کی نئی تشکیل کے متواتر عمل سے آگاہ ہوتے ہیں۔ یورپ اور برّصغیر کے تقابل میں دونوں کی تاریخ سے واقعات منتخب کیے جاتے اور انھیں اسی سلسلے کی اگلی کڑیاں بنایا جاتا ہے، جس کی جھلک ہم اس کہانی کے افتتاحی ٹکڑے میں دیکھ چکے ہیں۔

اس کہانی میں، تہذیب اور جمہوریت پہلے پہل یونانیوں کے یہاں سامنے آئیں؛ ان میں رومیوں نے ترمیم و اصلاح کی؛ عبرانی بائبل نے تنقیدی طریقوں سے اضافے کیے، خصوصاً جب وسطی یورپ کے عیسائی گروہوں نے اس کا مطالعہ کیا۔۱۰ حقیقت یہ ہے کہ اس کہانی میں یونان و روم کو یورپ نے اپنایا ہے؛ انھیں اپنے اب و جد قرار دیا ہے اور ان پر ایک ایسے انداز میں اجارہ جتایا ہے کہ کسی دوسری ثقافت کو یونانی و رومی علوم سے اخذ و استفادے کے

لیے یورپ کی عظمت و آفاقیت کے اس تصوّر کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں، جسے نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں تشکیل دیا گیا اور تمام یورپی نوآبادیوں میں پھیلا دیا گیا۔

دوسری طرف اس کہانی کی واقعاتی تشکیل کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ سے چند انوکھی باتیں منتخب کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ''عربی یا محمدی نظام طاقت کے استعمال اور وفورِ جذبات سے لطف لینے میں بنیاد رکھتا ہے۔ تفاخر، امنگیں، حکم رانی سے محبت اور کئی قسم کی عیش کوشیوں کو مذہب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ نیز مسلمانوں کے نزدیک زمین اہلِ ایمان کی وراثت ہے اور اہلِ ایمان کے علاوہ سب کافر ہیں۔ عالم گیر حکومت مسلمانوں کا الوہی حق ہے۔ ان کا مذہب تلوار کے ذریعے ایسے غلبے کو لازم قرار دیتا ہے۔ جو لوگ انکار کرتے ہیں انھیں غلام بنا لیا جاتا ہے''۱۱ ہندوؤں کی تاریخ سے یہ بات کہانی کا حصّہ بنائی گئی ہے کہ ''ہر چند ہندو مذہب مسلمانوں کے مقابلے میں کم جارحانہ ہے، مگر پھر بھی علیٰحدگی پسندانہ ہے۔ تمام غیر ہندو ناپاک ہیں، جبکہ ملازمتوں کے لیے موزوں ہیں اور بلاشبہ حکومتی فرائض کے لیے نااہل ہیں''۱۲۔

اس کہانی کا سب سے دل چسپ پہلو برّصغیر کے باسیوں کی مذہبی شناخت ہے۔ یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی تاریخ کا غالب اور موثر ترین پہلو مذہب ہے۔ وہ سر تا سر مذہبی وجود ہیں؛ ان کا تصوّرِ کائنات اور سماج سے ان کے رشتوں کے سب پیچ و خم مذہب سے صورت پکڑتے ہیں۔

یہاں تک تو خیر کوئی خرابی نہیں، خرابی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب یہ ثابت کیا جانے لگتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے یہاں مذہب روحانی نظام نہیں جو آدمی کو کثافتوں سے پاک کرتا اور انسانی ہستی کے نہایت بنیادی سوالات کے جوابات دیتا ہے۔ یورپی ثقافت کے زیرِ بحث بیانیے میں نوآبادیاتی اقوام کے مذاہب ان سیاسی و سماجی اداروں کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں جو انسانوں کو تقسیم و تسخیر کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کہانی میں برصغیر کے باشندوں کو ایک نئی، واحد اور مخصوص شناخت دی گئی ہے۔

کیا کسی فرد یا قوم کی واحد اور حد درجہ مخصوص شناخت ہو سکتی ہے؟ یہ سوال نوآبادکاروں کے سامنے نہیں تھا، مگر وہ واحد اور مخصوص شناخت کے اثرات و مضمرات سے اچھی طرح واقف تھے۔ چناں چہ انھوں نے ہندوستانیوں کی محدود مذہبی شناختوں کو اپنے بیانیے میں اس چابک دستی سے گوندھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے نوآبادیاتی عہد کے مسائل و معاملات کو اپنی انھی شناختوں کے ذریعے طے کرنے کی کوششیں کیں۔ کم از کم مسلمان اب تک اپنے اسی محدود مذہبی تشخّص کی بنیاد پر زیرِ عتاب ہیں یا اس کے دفاع میں مصروف ہیں۔

واحد اور حد درجہ مخصوص شناخت کسی قوم یا سماجی گروہ کو ایک ایسی بند گلی میں دھکیلتی ہے جس میں اس گروہ کو اپنی مخصوص اور محدود شناخت پر اصرار کرتے چلے جانے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے چھن جانے کے مسلسل خوف میں مبتلا رہنے کے کچھ نہیں سوجھتا۔ اس طور پر محدود شناخت اسے علیٰحدہ اور کم زور کرتی ہے اور اس کی کم زوری کا فائدہ

ہمیشہ وہ طبقہ اٹھاتا ہے، جسے شناخت کے تصوّر کو وضع کرنے اور رائج کرنے کا اختیار تاریخی طور پر حاصل ہوتا ہے یا وہ یہ اختیار کسی طور ہتھیا لیتا ہے۔ نوآبادکاروں نے اپنے بیانیے کے ذریعے قائم اور رائج کی گئی محدود شناختوں کے ''ثقافتی استعماری ثمرات'' سمیٹے۔

ہمارے زمانے میں امرتیا سین نے واحد اور مخصوص شناخت کو تشدّد کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ شناخت ہوتی نہیں، مسلّط کی جاتی ہے۔ ان کا یہ اقتباس چشم کشا ہے۔

''اس بات میں کوئی تجربی معقولیت نہیں ہے کہ کیوں مسلمانوں کے ماضی کے علم بردار یا کہہ، لیجیے کہ عرب ورثہ کے علم بردار خصوصی طور پر مذہبی عقائد پر توجہ مرکوز کریں اور کیوں نہ سائنس اور ریاضی پر بھی اپنی توجّہ مرکوز کریں، جن میں عرب اور مسلم معاشروں نے بہت زیادہ حصّہ ڈالا ہے اور جو اسی طرح سے عرب اور مسلم تشخّص کا ایک حصّہ بن سکتے ہیں۔ اس ورثہ کی اہمیّت کے باوجود بھونڈی جماعت بندیوں نے سائنس اور ریاضیات کو ''مغربی سائنس'' کی ٹوکری میں ڈال دیا ہے اور دوسرے لوگوں کو اپنے فخر کو تلاش کرنے کے لیے مذہب کی گہرائیوں میں کریدنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔''[۱۳]

مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی تاریخ میں نہ صرف سائنس و فلسفے کی باقاعدہ روایت موجود ہے، بلکہ اس روایت نے یورپ میں جدید سائنس کی بنیادیں استوار کرنے میں بنیادی کردار بھی ادا کیا ہے۔ مسلمانوں میں کندی، ابوبکر رازی، فارابی، ابنِ سینا، ابنِ باجہ، ابنِ طفیل، ابنِ رُشد، ابن الہیثم، اور ابنِ خلدون کے افکار غیر معمولی اہمیت کے ہیں۔ آج یورپ کے بعض سائنسی مورخین مسلمانوں کی سائنسی و فلسفیانہ خدمات کو تسلیم کرتے ہیں، مگر یورپی ثقافت کے استعماری بیانیے میں بری کولاژ کی تکنیک سے کام لینے کی وجہ سے اس سے انکار موجود ہے۔ اس انکار نے جو گل کھلائے ہیں، ان کا سلسلہ انیسویں صدی کی مذہبی احیائی تحریکوں سے لے کر عہد حاضر کی طالبانیت تک میں دیکھا جا سکتا ہے __ برصغیر کے باشندوں کی تاریخ میں سائنس و فلسفہ کی بے مثال روایت کے اثبات کا مطلب انھیں کثیر تشخصات کی حامل اقوام سمجھنا ہوتا اور نتیجتاً ان کے یہاں جدید سائنس (جس کی ترقی میں نہایت عظیم الشان کردار مغرب کا ہے) سے وہ عمومی لاتعلقی نہ ہوتی، جو دراصل ایک محدود تشخص کو قبول کر لینے کا نتیجہ ہے اور جس نے ان کی پس ماندگی میں سب سے بڑھ کر کردار ادا کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واحد تشخّص ایک عجیب و غریب تضاد کا حامل تصّور رہے۔ پہلا تضاد تو یہی تھا کہ یورپ، ہندوستان/ مشرق کو جس نظر سے دیکھ رہا تھا وہ ''حسّی، عقلی، سماجی'' تھی؛ یہ نظر سماج اور کائنات کو ایک غیر کے طور پر دیکھتی اور اسے تسخیر کرنے میں یقین رکھتی تھی، اسی لیے اسلام اور ہندومت کو 'سماجی ادارے' تصوّر کیا گیا جو دوسری اقوام اور طبقات کو محکوم بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ خود یورپ مشرقی و افریقی ممالک کو جس سیاسی و ثقافتی محکومی کے شکنجے میں کس رہا تھا، اس طرف دھیان نہیں تھا۔ تاہم یہ تضاد یہیں پہ ختم نہیں ہوتا۔ یورپ 'عقلی و سماجی نظر' کا علم

بردار تھا۔ یہ نظر اور اس کے ثمرات یعنی ریاضی و سائنس مشرق کے پاس بھی تھے، مگر مشرق کی شناخت متعین کرنے میں اس سے بری طرح صرفِ نظر کیا گیا اور اس لیے کیا گیا کہ یورپ و مشرق کے اس فرق کو برقرار رکھا جائے جس پر نوآبادیاتی نظام کا انحصار تھا۔ اس بات کا برملا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس فرق کی استواری میں خود مشرق/ ہندوستان کا بھی ہاتھ تھا جس نے اپنی شناخت کے ''حسی و عقلی'' عنصر کی پرداخت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ دیسی باشندوں کی تاریخ میں ان کی ایک سے زائد شناختیں موجود ہوتی ہیں، مگر ان پر ایک مخصوص شناخت مسلّط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک طرف ان کے قلب و ذہن میں واحد تشخّص راسخ کرنے کا اہتمام ہوتا ہے اور دوسری طرف اسی تشخّص سے گریز کا رویّہ پیدا کرنے کی تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں محدود تشخّص دوہرا کردار ادا کرتا ہے۔

دراصل جب محدود تشخص کے تصوّر کو اس طور متعارف کروایا جائے کہ شناخت کے بحران جنم لے لے اور اس بحران سے نکلنے کا راستہ محدود تشخص کے تصوّر کے قبول کرنے کے علاوہ نظر نہ آتا ہو تو اس کے ضمن میں کشش و گریز کے باہم متصادم جذبات جنم لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دیسی باشندے اپنی ہی تاریخ، ثقافت، مذہب، زبان اور ادبیات کے ضمن میں دو جذبی رجحان (ambivalance) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نوآبادکار اپنے مقصد میں پوری طرح کام یاب ہو جاتا ہے۔

دو جذبی رجحان، نوآبادکار کو مطلوب وہ نفسیاتی کیفیّت ہے جو اس کے ثقافتی بیانیے کے سب سے اہم حصّے کے انجذاب و رواج کا ذریعہ بنتی ہے۔ دیسی باشندے کا اپنے واحد تشخّص پر اصرار اسے متشدّد بناتا ہے جب کہ اس سے گریز، ایک خلا اور نئی ضرورت کو جنم دیتا ہے اور اسی خلا میں یورپی ثقافت کی اس عظمت و آفاقیت کے پُرشکوہ تخیّلات انڈیلے جاتے ہیں، جس کی نمایندگی انگریزی زبان اور اور اس کا ادب کرتا ہے۔ انگریزی ادب محض ایک قوم کا یا یورپی تہذیب کا فقط ترجمان نہیں، بلکہ اس کے تمام مثالی اوصاف، عظمتوں، بہترین اقدار اور ارفع تصوّرات کا ایک مکمل استعارہ ہوتا ہے۔

برطانیہ کے ادب کے نام...... ہمارے وطن کی عظمتوں میں سے سب سے دائمی عظمت، اس ادب کے نام جو ارفع حقیقتوں اور ارفع افسانوں کا بے مثال ذخیرہ رکھتا ہے......اس ادب کے نام جس نے ہماری معیشت کے مقابلے میں کہیں وسیع اور ہماری افواج کے مقابلے میں کہیں طاقت ور اثرات مرتّب کیے ہیں......اس ادب کے نام جس کی روشنی کے آگے بدنہاد اور ظالمانہ توہمات گنگا کے کناروں پر فرار ہو رہے ہیں۔[۱۴]

برطانوی انگریزی ادب کے اس قصیدے کے بغیر یورپی ثقافتی بیانیے کا پلاٹ، بالکل ادھورا ہوتا ہے اور اسے بیانیے میں عین اس مقام پر شامل کیا جاتا ہے، جہاں استعمار زدہ باشندوں کو انھی کی تاریخ سے ماخوذ محدود مذہبی تشخّص کا چولا پہنایا جاتا ہے، اور جس کے سلسلے میں وہ دو جذبی رجحان کے حامل ہوتے ہیں۔ چناں چہ دیسی لوگوں میں

اس خواہش کو پیدا کرنا ممکن ہو جاتا ہے کہ اپنے محدود تشخّص کی تاریکیوں سے نکلنے کے لیے یورپی ادبیات کی طرف بے محابا لپکیں۔ ایک نئے تشخّص سے بغل گیر ہوں۔ ٹھیک یہی مقصود نوآبادکار کا ہوتا ہے۔ چارلس ٹریولیلین واشگاف کہتے ہیں:

ہندوستانی نوجوان ہم سے ہمارے ادب کے ذریعے مانوس ہونے کے بعد ہمیں غیر ملکی سمجھنا ترک کر دیتے ہیں۔ وہ ہماری ہی طرح ہمارے عظیم لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ یکساں طریقے سے تعلیم حاصل کرنے، یکساں باتوں میں دل چسپی لینے، یکساں مشاغل میں ہمارے ساتھ مصروف ہونے کے بعد، ہندوؤں سے زیادہ انگریز بن جاتے ہیں، بالکل اسی طرح، جس طرح گال یا اٹلی کے لوگ، رومیوں سے بڑھ کر رومی بن گئے تھے۔۱۵

بلاشبہ یہ ایک قسم کی نفسیاتی تقلیب تھی، مگر نامکمل تھی۔ یورپی ادبیات نے، ہندوستانی نوجوانوں کو ایک نئی شناخت دی، مگر وہ اپنی پرانی شناخت کے اس تصوّر سے کبھی الگ نہ ہو سکے جسے نوآبادکاروں نے ان کے ذہنوں میں راسخ کیا۔ وہ پورے یورپی بن سکے نہ پورے ہندوستانی ہی رہ سکے۔ وہ دوغلے تھے۔ میکالے نے تو ان کا تعارف بے حد سادہ طور پر کرایا تھا کہ ''وہ رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز'' تھے۔۱۶ وہ اس التباس کا شکار تھے کہ وہ دوہری ثقافتی شہریت رکھتے ہیں۔ یہ التباس انھیں ایک انوکھے تفاخر کے اظہار پر بھی مائل رکھتا تھا: وہ ایک محکوم معاشرے میں حاکم ثقافت کے ذوق اور فہم و فراست کے علم بردار ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ثقافتی شناخت کے عدم تعیّن کے شدید بحران کا شکار تھے۔ وہ حاکم ثقافت کے نہ تو نمایندے تھے نہ ترجمان، بلکہ اس ثقافت کی طاقت کے مظاہرے کا محض ذریعہ اور آلۂ کار تھے اور خود اپنی مقامی ثقافت سے شعوری طور پر علیحدہ اور اجنبی بن گئے تھے۔ ان کے پاس دوہری ثقافتی شہریت نہیں، دوغلی ثقافتی شخصیّت تھی جو شناخت کے بحران کو حل کرنے کی تخلیقی قوّت سے محروم تھی۔

نوآبادکاروں کا مقصود بہ ظاہر اپنے اور دیسی باشندوں کے درمیان اس ثقافتی بیگانگی کو دور کرنا تھا، جو انگریزی نظامِ حکومت کے لیے زبردست خطرے کی گھنٹی تھی مگر اس کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا یا جو بیانیہ گھڑا گیا، اس میں ثقافتی اختلاف کو وجودیاتی اور قدری سطحوں پر نہایت شدّت سے ابھارا گیا۔ حالاں کہ دونوں ثقافتوں میں متعدّد اشتراکات موجود تھے۔ اسلامی اور عیسوی ثقافتوں میں سامی مذہبی عنصر مشترک تھا۔ دونوں کے یہاں سائنس و فلسفے کی روایت کا ماخذ یا محرک یونان تھا۔ اسی طرح ہندوستان اور یورپ میں نسلی سطح پر آریائی عنصر اور لسانی سطح پر ہند آریائی زبان ایک عظیم قدرِ مشترک تھی، جس کا انکشاف ولیم جونز کر چکے تھے۔ اگر ان اشتراکات کو ابھارا جاتا اور ان کی بنیاد پر ثقافتی بیگانگی کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی تو نتائج یک سر مختلف ہوتے۔ دوغلے ہندوستانی نہ پیدا ہوتے؛ مختلف ثقافتوں کے مشترک اور بہترین عناصر کی آمیزش سے وجود پذیر ہونے والے منفرد وژن کی حامل شخصیتیں سامنے آتیں۔ یقیناً کچھ ایسی شخصیّات پیدا ہوئیں، مگر ان کی پیدائش میں اس نوآبادیاتی پیراڈائم کا کوئی

کردار نہیں تھا جو ثقافتی فرق ابھارنے اور نتیجتاً دوجذبی رجحان پیدا کرنے سے عبارت تھا۔ وہ شخصیتیں ثقافتوں کے تنقیدی مطالعے کی انفرادی کوششوں کی پیداوار تھیں اور تاریخ کے جبر سے آزار ہونے کی غیر معمولی تخلیقی قوت رکھتی تھیں۔ وہ تعداد میں کم تھیں اور عمومی نوآبادیاتی ثقافتی فضا میں اجنبی تھیں۔

ہومی بھا بھا نے ثقافتی دوغلے پن کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ ان کے مطابق، دوغلا پن نوآبادیاتی طاقت کی پیداواریت، اس کی تغیر پذیر اور مستقل قوّتوں کی علامت ہے...... دوغلا پن، نوآبادیاتی شناخت کے مفروضے کی معنویت کا ازسرِ نو تعیّن ہے، جسے امتیازی شناختی اثرات کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔۱۷ چناں چہ دوغلے ہندوستانی ثقافتی انضمام کا نمونہ پیش کرنے کے بجائے نوآبادیاتی طاقت کی ثقافتی میدان میں کرشمہ کاری کے مظہر ہوتے ہیں۔

ثقافتی دوغلے پن میں تہذیبی امتیاز لازماً موجود ہوتا ہے، اور یہ امتیاز ایک قسم کی اجنبیت اور غیریت کے احساس کو ابھارتا ہے۔ اس احساس کی شدّت کے بڑھنے اور ایک آتش فشانی صورت اختیار کرنے کا اندیشہ برابر موجود رہتا ہے۔ چناں چہ یورپی ثقافت کے بیانیے میں ایک واقعے پر شدید اصرار کیا جاتا ہے، جو یورپ ہی کی تاریخ سے ماخوذ ہوتا ہے مگر اسے انسانی تاریخ کی اٹل صداقت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس واقعے سے یہ باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ تہذیبی پس ماندگی و زوال کا مداوا مقامی طور پر دست یاب نہیں ہوتا، اسے بیرونی ثقافت سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ ''ایسی مثالیں انتہائی کم یاب ہیں، جن میں قوموں نے تہذیب کی بلند سطح تک رسائی اپنے مقامی وسائل کے ذریعے حاصل کی ہو، ان مثالوں کے مقابلے میں، جن میں ؓبی بلندی کیؓیک باہر سے ملی اور اس تحریک کو غیر ممالک کے ادبیات کے گہرے مطالعے اور تقلید نے مستحکم کیا۔''۱۸

چارلس ٹریولیلین کے سامنے یورپ کی تاریخ ہے، جو روم پر یونان کے اور شمالی یورپ کے ممالک پر یونان و روم کے ثقافتی اثرات کی کہانی پیش کرتی ہے۔ اس کے لیے یورپ کی تاریخ کے یہ ابواب، تاریخِ انسانی کے لیے مثالی نمونہ ہیں۔ یورپی ثقافتی بیانیے میں اس بات کو کثرت سے دہرایا گیا ہے کہ ''جو حیثیت یونانی اور لاطینی زبانوں کی مورؓتھا مس مورؓورا یسچمؓجرا یسچمؓکے ہم عصروں کے سامنے تھی، عین وہی حیثیت آج ہماری زبان کی ہندوستان کے لوگوں کے سامنے ہے۔''۱۹ گویا جو کردار یونانی اور لاطینی نے انگریزی کے لیے ادا کیا، اب انگریزی وہی کردار ہندوستانی زبانوں کے لیے ادا کرے گی۔ انگریزی زبان اور اس کے ادب کو ہندوستان کی اس تہذیبی ترقی کے ناگزیر وسیلے کے طور پر پیش اور رائج کیا گیا، جسے ہندوستان خود اپنے مقامی وسائل سے حاصل کرنے کا اہل نہیں تھا۔

برصغیر کی تہذیبی زندگی میں اس سے نازک مقام شاید ہی آیا ہو کہ اس کے نازک ترین تہذیبی مسئلے (زوال) کی نشان دہی ایک ایسے ثقافتی ذہن نے کی ہو جو خود کو برصغیر کے ''تہذیبی غیر'' کے طور پر پیش کرتا ہو۔ اس کہانی میں

یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ برّصغیر کس حد تک تہذیبی زوال کا شکار تھا (یوں بھی کہانی میں ماخذ کا مستند ہونا نہ ہونا اہم نہیں) اہم بات یہ تھی کہ زوال کے انتہائی موثر بیانیے کے ذریعے کیا نتائج حاصل کیے گئے۔ برّصغیر کو تہذیب کی بلند سطح سے انتہائی پست قرار دے کر ان یورپی تہذیبی اثرات کے نفوذ کو جائز قرار دینا اور خود ہندوستانیوں کے لیے قابل قبول بنانا آسان تھا جو کسی طور سیاسی مفہوم سے الگ نہیں تھے۔ انگریزی زبان، یورپی تہذیب کے مکمل استعارے کے طور پر، یورپی طرزِ زندگی کو ہندوستانیوں میں رائج کرنے کی مدعی تھی۔ انھیں حکومتِ خود اختیاری کے طور سکھانے، یعنی ان کی نجات و آزادی کی پیام بر تھی۔ دیسی باشندوں کی نجات و آزادی کا دعویٰ کئی تضادات سے مملو تھا۔ ایک طرف نو آبادکاروں کو اس بات کا پختہ یقین کہ ’’برٹش انڈیا کی آبادی پوری برٹش امپائر سے تین گنا ہے ...... دولت اور تجارت کی افزائش کو ممکنہ حد تک ترقی دینے سے ہم ہندوستان کو آنے والے وقت میں اپنی دولت اور طاقت کا منبع بنا سکتے ہیں، جس کی مثال ہماری تاریخ میں نہیں ملتی۔‘‘ ۲۰ اور دوسری طرف ہندوستانیوں کو مستقبل میں خود حکومت کرنے کے قابل بنانا تھا۔ کیا استعماری تخیّل اپنی ہی طاقت کے منبع کی آزادی کا لائحہ عمل وضع کر سکتا ہے؟ اس کا جواب ہندوستانی حکومت کی تجرباتی پالیسی نامی دستاویز میں ملتا ہے۔

’’اس امر کا ذکر کرتے ہوئے کہ ہندوستان میں عوامی اقدامات کا رخ بالآخر آزادی عطا کرنے کی طرف ہے اور یہی انگلستان اور اس کے ایشیائی مقبوضات کے تعلق کی خصوصیت ہے، __ یہ سمجھنا حماقت ہوگی کہ کروڑوں ہندوستانیوں کو کبھی مکمل آزادی دی جائے گی۔ ہندوستان اور خود اپنے تحفّظ کی خاطر، انگلستان کو بالضرور ایشیائی دنیا کا محافظ اور مدار رہنا ہے ورنہ جلد ہی دوسری اقوام جسمانی کے ساتھ ساتھ اخلاقی طوق دوبارہ پہنانے کی کوشش کریں گی جن کا ہندوستان صدیوں تک غلام رہا ہے۔‘‘ ۲۱

اس بات کو ہم یوں نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستانی صنوبر کو نو آبادیاتی باغ میں بہ یک وقت آزاد اور پابہ گِل رکھنا مقصود تھا بلکہ یہ کہنا صائب ہوگا کہ ہندوستانی صنوبر پابہ گِل تھا، جسے مستقبل میں آزادی کی نوید دی جا رہی تھی۔ لہٰذا یہ آزادی ایک خواب تھی۔ برّصغیر کے باشندوں سے زیادہ نو آبادکاروں کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اوّل الذکر یہ خواب دیکھتے رہیں اور اس اعصابی و نفسی تشنّج کی حالت کو نہ پہنچیں جو بغاوت و تشدّد کو تحریک دیتی ہے۔

خواب میں ہمیشہ مقامی لسانی و ثقافتی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر چند نو آبادکار کی مہم جو یانہ طبیعت ان علامتوں کو بے دخل کر کے اپنی لسانی و ثقافتی علامتوں کو رائج کرنے سے باز نہیں آتی اور لارڈ میکالے کی ۱۸۳۵ء کی تعلیمی روداد اس مہم جوئی کی غیر معمولی مثال ہے، مگر یہ بات جلد ہی واضح ہو جاتی ہے کہ مقامی زبان و ثقافت کوئی آرائشی چیز نہیں کہ اسے ایک دوسری آرائشی چیز سے بدل دیا جائے۔ اس کی اگر کوئی تمثیل ہو سکتی ہے تو وہ حواسِ خمسہ کی ہے۔ زبان و ثقافت کسی بھی سماج کے حواس خمسہ ہیں، جن کے ذریعے وہ کائنات اور دنیا کا ادراک کرتا، ان سے معاملہ کرتا اور ان سے متعلق مخصوص تصوّرات قائم کرتا ہے۔ حواس خمسہ کو نہیں بدلا جا سکتا، مگر یہ جن معلومات پر

انحصار کرتے ہیں، انھیں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک یہی کام تعلیماتِ عامہ کی اس کمیٹی نے اپنی پہلی سالانہ رپورٹ میں تجویز کیا، جسے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کی انگریزی حکومت کی قرارداد کے ذریعے قائم کیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں واضح کیا گیا تھا کہ ’’برطانوی حکومت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے دیہی باشندوں میں یورپی ادبیات اور سائنس کو فروغ دیا جائے اور تعلیم کے لیے مختص تمام رقم کو فقط انگریزی تعلیم کے لیے وقف کیا جائے۔ ۲۲ مگر تعلیمات عامہ کی کمیٹی نے فقط ایک سال بعد ہی اپنی رپورٹ میں لکھا:

’’ہم مقامی زبانوں کی ترقی کی حوصلہ افزائی کی اہمیت کا گہرا شعور رکھتے ہیں...... ہم خیال کرتے ہیں کہ مقامی ادبیات کی تشکیل ہی ہمارا منتہائے مقصود ہے، جس کی طرف ہماری تمام کوششوں کا رُخ ہونا چاہیے۔ انگریزی کا مطالعہ، جس کو ترجیح دینے کی ترغیب، کئی واقعات سے دیسی لوگوں کو ملتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی مغرب کی تعلیمات کا علم روز بروز پھیل رہا ہے جیسا کہ ہمیں محسوس ہو رہا ہے، یہ ہندوستان کو روشن خیال بنانے کے عمل کا پہلا مرحلہ ہے۔‘‘ ۲۳

چناں چہ جلد ہی دیسی زبانوں کی ترقی کو سرکاری تعلیمی پالیسی کا حصّہ بنا دیا گیا۔ اس پالیسی کے پس پشت ایک طرف ’’مقامی اعتقادات و احساسات کو ٹھیس نہ پہنچانے‘‘ کی وہ عمومی روش کار فرما تھی جس کا مقصد دیسی لوگوں کے دلوں سے اجنبیت کا خوف دور کرنا اور ان کی ہم دردیاں حاصل کرنا تھا اور دوسری طرف یورپی علم کی ترسیل کو سریع اور فطری بنانا تھا۔ انگریزی زبان و ادب کی براہِ راست تدریس دیسی لوگوں کو ’’روشن خیال‘‘ اور ’’مہذّب‘‘ بنانے کے طویل المیعاد عمل کا پہلا مرحلہ تھی۔ یہ مرحلہ انگریزی کو تہذیب کے یورپی مثالیے کے طور پر پیش کرنے اور باور کرانے کے باوجود، کئی اعتبار سے محدود تھا۔

انگریزی زبان و ادب کی تدریس سب سے پہلے برصغیر میں شروع کی گئی۔ یہ ایک تجربہ تھا۔ یہ انگریزی کی ایک حد کا بیان ہے۔ برّصغیر کے لوگ اپنی کلاسکی زبانوں سے مذہبی جذبات وابستہ رکھتے تھے اور ان کے نزدیک علم حاصل کرنے کا مطلب کلاسکی زبانوں کا علم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کی زیادہ تر مخالفت مذہبی بنیادوں پر کی گئی۔ خود انگریزی زبان اور اس کی تدریس میں عیسوی عنصر شامل تھا، جس کا ادراک دیسی باشندوں کو بھی تھا۔ جیمز برائس نے لکھا ہے کہ ’’سب جانتے ہیں کہ ہندوستانی لوگوں کی تبدیلی مذہب کا معاملہ کچھ سالوں سے متعدد مذہبی اور لامذہبی تنظیموں کے لیے گہری دل چسپی کا حامل رہا ہے، تقریباً ہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ واحد قابلِ عمل منصوبہ بالواسطہ یعنی بذریعہ تعلیم ہے __ یہ کہ پہلے ہل چلایا جائے جو اب تک ناقابلِ نفوذ زمین کو نرم کرے، جس میں ایک دن عیسائیت کا بیج جڑ پکڑ لے گا۔ ۲۴ لہٰذا انگریزی زبان اور اس کی تعلیم جب روشن خیالی اور عیسائیت کے فروغ کو بہ یک وقت اپنا منشا بناتی تھی تو اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتی تھی۔ اس کے لیے اس تضاد کو وقتی طور پر چھپائے رکھنا آسان تھا، مگر اس کو حل کرنا مشکل تھا کہ روشن خیالی اور عیسائیت یا سیکولر اور مذہبی فکر ایک

قالب میں کیسے سما سکتے ہیں؟ اس تضاد کی وجہ ہی سے انگریزی کو ایک نئی زبان کم اور استعماری زبان زیادہ سمجھا گیا۔ ہر چند مذکورہ تضاد کے حل کی ایک صورت یہ تھی کہ عیسوی مذہب اور اس کے اختیار کرنے کے عمل ہی کو عقل مندانہ، کشادہ نظری اور روشن خیالی قرار دیا جائے اور یہ صورت اختیار بھی کی گئی، مگر یہ تبدیلی مذہب کی براہِ راست صورت تھی اور فقط اس تبدیلی کا نفسیاتی جواز تھی۔

انگریزی کی تعلیم کی شد و مد سے وکالت کرنے والوں کو جلد ہی ان حدود و قیود کا احساس ہو گیا جو مذکورہ وجوہ سے موجود تھیں۔ لہٰذا یورپی ثقافتی بیانیے کو برصغیر کے ثقافتی لاشعور میں اتارنے کی قابلِ عمل صورت یہ سوچی گئی کہ دیسی زبانوں میں یورپی تعلیمات کو فروغ دیا جائے۔ دیسی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے؛ ان میں یورپی متون کے تراجم کیے جائیں اور ان کی تدریس کی جائے۔ چارلس ٹریویلین نہایت خوشی کے ساتھ اپنی پالیسی کی کامیابی کا اظہار کرتا ہے۔

> دیسی زبان اپنی اصلاح شدہ حالت میں فروغ پانے لگی؛ ترجمہ و نقل کثرت سے سامنے آئے اور تخلیقی فطانت کو گاہے ماہے شاہکار تخلیق کرنے کی تحریک ہوئی۔ [25]

ترجمہ و نقل، یورپی نوآبادیاتی اثرات کے سب سے اہم مظہر اور وسیلہ ثابت ہوئے۔ چناں چہ ان کے ذریعے یورپ سے متعلق ہر خیال، علم اور شخص کو قابلِ توجہ قرار دیا گیا۔ اور انھیں دیسی زبانوں میں منتقل کرنے پر کمر باندھی گئی۔ انھوں نے اس متوازن تشکیک کے ذہن میں پیدا ہونے کا ہر ممکن راستہ بند کیا، جو ہر اجنبی خیال اور علم کی ثقافتی قدر و قیمت اور معاصر صورتِ حال میں ان کی معنویت طے کرنے پر آدمی کو اُکساتی ہے۔

یورپ بہ طور کبیری بیانیے کی عمل آرائی میں بڑا کردار، معنی آفرینی کے ایک خاص طریقے کا تھا جسے ہر کبیری بیانیہ اپنے بطن سے جنم دیتا ہے۔ کبیری بیانیہ، لسانی طلاقت، خطابت، سیاسی طاقت، علمی فتوحات، ثقافتی برتری کے ملے جلے عناصر کا حامل ہوتا ہے اور اس لیے یہ اہلیت اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے کہ اپنے تضادات کو چھپا سکے۔ کبیری بیانیہ زمان و مکاں کا پابند اور مخصوص انسانی گروہ کے تجربات سے تشکیل پاتا ہے، مگر خود کو آفاقی و مثالی بنا کر پیش کرتا ہے۔ چناں چہ اپنی تاریخی صورتِ حال کو عمومی انسانی صورتِ حال کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ وہ نہایت گھن گرج کے ساتھ یہ عظیم دعویٰ کرتا ہے کہ وہ پوری انسانیت کا نمایندہ ہے؛ تمام انسانی مسائل کا حل اس کے پاس ہے کہ اسے عقلی وسائل پر دست رس حاصل ہے۔ اس دعوے کو تسلیم کرانے کے لیے معنی آفرینی کا وہ طریقہ ایجاد کیا جاتا ہے جو بڑی حد تک مجازِ مرسل سے عبارت ہے؛ یعنی کبیری بیانیے یا یورپ سے قربت رکھنے والی ہر شے آفاقی، مثالی اور قابلِ تقلید ہے۔ یہ قربت مکانی، جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی ہر قسم کی ہو سکتی ہے۔ چناں چہ یورپی جمہوریت، انگریزی، شیکسپیئر، یورپی نشاۃ ثانیہ کا ماڈل سب مثالی اور آفاقی ہیں، اور جو کچھ یورپ سے دُور، مختلف ہے، وہ یورپی طرز پر قابلِ اصلاح ہے۔

یورپ بہ طور کبیری بیانیے میں یورپ اور مشرق/ ایشیا/ ہندوستان کی تفریق بنیادی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بیانیے کی شعریات کی تشکیل میں اس تفریق نے مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ تفریق ہی وہ مرکز اور منبع تھا جہاں سے بیانیے کی شعریات کے تمام اجزا نمو پاتے تھے اور ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہوتے تھے۔ لہٰذا یہ ایک مرکز آشنا ساخت تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مرکز ایک بنیادی قوّت اور حقیقی تفاعل کے طور پر پوری شعریات میں سرایت کیے ہوئے تھا اور اسی بنا پر بیّن اور واضح نہیں تھا۔ یورپ سے متعلق ہر بات، ہر چیز، ہر واقعہ، شخص، خیال، مستند، طاقت کا حامل، تہذیب آموز، روشن خیال، قابل تقلید و تحسین تھا اور مشرق/ ہندوستان سے وابستہ ہر بات، ہر چیز ان کے برعکس خصوصیات رکھتی تھی۔ اس بات پر بہت کم غور کیا گیا کہ یورپ اور مشرق/ ہندوستان کی ایک دوسرے کو بے دخل کرنے والی خصوصیات کا منبع، خود یورپ اور مشرق نہیں، بلکہ ان کے درمیان قائم کی گئی تفریق تھا، جسے یورپ بہ طور کبیری بیانیے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت دی گئی تھی۔

یورپ بہ طور کبیری بیانیے نے برصغیر میں کئی بیانیوں کو تحریک دی۔ ان کی حیثیت زیادہ تر صغیری بیانیوں کی تھی۔ اس لیے کہ برصغیر میں متجانس عناصر کا حامل انتہائی مربوط کبیری بیانیہ خلق نہ ہو سکا، جس قسم کا یورپ بہ طور کبیری بیانیہ تھا۔ یہ کہنا تو مبالغہ ہو گا کہ یہاں یورپ سے متعلق بھانت بھانت کی بولیاں تھیں، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برصغیر میں اصلاح پسند، احیا پسند بیانیے رائج ہوئے۔ بہ ظاہر متبائن مگر بہ باطن یکساں تھے۔ ان بیانیوں کے باہمی اختلافات دراصل یورپ کے کبیری بیانیے کی دو مختلف تعبیروں کا نتیجہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں انیسویں صدی سے برصغیر کی ذہنی قوّتوں کا سب سے بڑا مصرف یورپ کے کبیری بیانیے کی مختلف ڈھنگ سے تعبیریں ہی رہا ہے۔ دونوں کا اختلاف اس نکتے پر رہا ہے کہ نوآبادیاتی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے کس 'مرکز' کی طرف رجوع کیا جائے، اصلاح پسند یورپ کو اور احیا پسند مشرق کو مرکز قرار دیتے ہیں۔ گویا دونوں اس نکتے پر متفق رہے کہ مرکز سے اٹوٹ وابستگی لازم ہے اور مرکز کا یہ تصوّر اس مفہوم میں تفریقی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ یورپ کے کبیری بیانیے کی تعبیر کے بنیادی اصول اسی بیانیے سے ماخوذ تھے۔ تفریق آشنا مرکز نے جب ثقافت، انسانی علوم اور ادبیات میں بنیادی علمیاتی اصول کا درجہ حاصل کر لیا تو اس سے استعماری صورتِ حال کے شکنجے سے آزاد ہونے کا ایک آسان راستہ دریافت ہو گیا۔ اصلاح پسندوں اور احیا پسندوں کو ان بہت سی الجھنوں اور بکھیڑوں سے گویا نجات مل گئی جو نوآبادیاتی صورتِ حال کی تفہیم کے کسی دوسرے اصول سے لازماً پیدا ہوتے۔ اصلاح پسندوں کے لیے پورا یورپ اور احیا پسندوں کے لیے پورا مشرق، استعماری حالت سے نجات کا ذریعے تھے۔

سرسیّد کا یہ بیانیہ:

''جو شخص اپنی قومی ہمدردی سے اور دور اندیش عقل سے غور کرے گا، وہ جانے گا کہ ہندوستان کی ترقی، کیا

علمی اور کیا اخلاقی، صرف مغربی علوم میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرنے پہ منحصر ہے۔ اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کر دیں، ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے، یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم ہمارے دست مال ہوں، ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں۔ ہم اپنی قدر، اپنی عزت کی قدر خود آپ کرنی سیکھیں۔ ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اس کو اپنی محسن و مربی سمجھیں۔'' ۲۶

اور آزاد کے یہ خیالات:

''نئے انداز کے خلعت اور زیور جو آج کے مناسب حال ہیں، وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔'' ۲۷

نیز

''ہندوستانی بھائیوں کو اس دن کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ عربی فارسی کے لفظ جواب تک ہمارے تمھارے باپ دادا بولتے رہے آئندہ ان کی جگہ اس کثرت سے انگریزی لفظ نظر آئیں گے کہ عربی فارسی کے لفظ خود جگہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔'' ۲۸

اصلاح پسندوں کے تفریق آشنا مرکز کی عمومی مثال ہیں۔ دوسری طرف اکبرالٰہ آبادی کے یہ اشعار احیا پسندوں کے تفریق مرکز کی مثال پیش کرتے ہیں:

کر چکا ختم جب میں اسپنسر   مجھ پہ پڑنے لگی ہر اک کی نگاہ
پوچھا استاد نے کہ سمجھے بھی   ان دقایق نے دل میں کی کچھ راہ
کہ دیا میں نے اس کا کل مطلب   صاف ہے لا الٰہ الا اللہ
ماسٹر نے کہا کہ تو کو دن ہے
حق پکارا کہ واہ اکبر واہ

نیز

سنا کہ چند مسلماں جمع تھے یک جا   خدا پرست خوش اخلاق اور بلند نگاہ
کہا کسی نے یہ ان سے کہ یہ تو بتلاؤ   تمھاری عزت و وقعت کا کس طرح ہے نباہ
نظر کرو طرفِ اقتدارِ اہل فرنگ   کہ ان کے قبضہ میں ہے ملک و مال و گنج و سپاہ
انھیں کا سکہ ہے جاری یہاں سے لندن تک   انھیں کی زیرِ نگیں ہے ہر اک سفید و سیاہ
کلیں بنائی ہیں وہ وہ کہ دیکھ کر جن کو   زبانِ خلق سے بے ساختہ نکلتی ہے واہ
تمھارے پاس بھی کچھ ہے کہ جس پہ تم کو ہے ناز   کہا انھوں نے کہ ہاں لا الٰہ الا اللہ ۲۹

برصغیر اور آگے چل کر پاکستان اور بھارت کی ذہنی دنیا کی تشکیل میں انھی دو صغیری بیانیوں نے حصّہ لیا۔ ہندووں

میں آریہ سماجیوں سے آر ایس ایس تک اور مسلمانوں میں علمائے دیو بند سے موجودہ طالبان کی تحریک تک تفریق آشنا مرکز ایک انداز میں اور ہندوؤں میں ماسٹر رام چندر سے موجودہ عہد کے اصلاح پسندوں تک اور مسلمانوں میں سرسیّد سے ڈاکٹر مبارک علی تک، تفریق آشنا مرکز کا تصوّر ایک دوسرے انداز میں کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔

مرکز آشناخت کا تصوّر اس وقت خوف ناک ہو جاتا اور تفریق آشنا مرکز کا تصوّر اس وقت تباہ کن صورت اختیار کر جاتا ہے، جب انھیں ثقافت و ادب میں بنیادی علمیاتی اصولوں کا درجہ دے دیا جائے اور ان کی بنیاد پر اپنے تصورِ کائنات کی تشکیل کی جائے۔ تفریق آشنا مرکز کے تباہ کن ہونے کا کچھ اندازہ اسپنسر کے مطالب ﷺ کے جواب میں لا الٰہ اللہ کہنے ہی سے ہو جاتا ہے۔ یہ فقط سماجی ارتقا کے مفکّر کے نظریات کے مقابلے میں نعرۂ توحید بلند کرنے یا انسانی عقل کے ذریعے انسانی سماج کی ساخت و ارتقا کو سمجھنے کی کوشش کے مقابلے میں مذہبی متن کے استناد پر زور دینے کا معاملہ نہیں بلکہ سماجی فکر میں پیدا ہونے والے چیلنج کو محض ایک یورپی مظہر قرار دے کر اپنی مذہبی شناخت پر اصرار کرنے کا معاملہ ہے۔ یہ سارا کیا دھرا تفریق آشنا مرکز کا ہے، جس میں مسلمانوں کو محدود مذہبی تشخّص دیا گیا اور مسلمانوں کی تاریخ سے سائنسی فکر کے عنصر کو منہا کیا گیا۔ سائنسی فکر، انسان کی مجموعی عقلی میراث کی بجائے یورپی مِلک سمجھی جانے لگی اور مسلمانوں کے پاس تفاخر کے لیے فقط مذہبی عقائد رہ گئے۔ اگر مذہبی عقائد کو شکست خوردہ سماج کی نفسیاتی تسکین اور روحانی تسلّی ہی کا ذریعہ سمجھا جاتا، نیز انھیں اپنے اخلاقی اعمال کی تطہیر کے لیے بروے کار لایا جاتا تو یہ ایک مستحسن عمل ہوتا، مگر جب مذہبی عقائد کو سماجی، ادبی، یہاں تک کہ سائنسی متون کی تعبیر کی بنیاد بنایا جانے لگا تو گویا تفریق آشنا مرکز کی تہ میں چھپی چنگاریاں اپنا کام دکھانے لگیں۔ تاہم تفریق آشنا مرکز کے تباہ کن ہونے کے اصل شواہد ہمیں بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں نظر آتے ہیں، جب اسلامی ادب کی تحریک نے انسانی مساعی کے بہترین مظہر یعنی ادب کی تعبیر مذہبی تصور کے تحت کرنا شروع کی اور ضیا دور میں سائنس کو 'اسلامائز' کرنے کی تحریک سامنے آئی۔

یورپ بہ طور کبیری بیانیے کی تعبیریں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے صغیری بیانیے اس عہد کے تاریخی جبر کا نتیجہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں اس کبیری بیانیے کا متبادل بیانیہ پیش کرنے کی کوشش ہوئی۔ کبیری بیانیے کی تعبیروں میں، اس بیانیے کی اصل ساخت کو قائم رکھا گیا، مگر متبادل بیانیے میں اس ساخت کو توڑا گیا۔ مرکز کے تفریقی تصوّر کی جگہ مرکز کے غیر تفریقی، مماثلتی تصوّر کو پیش کیا گیا۔ آخر الذکر تصوّر ایک طرف مرکز پر کسی ایک گروہ کے اجارے کا انکار کرتا تھا اور دوسری طرف ایک مرکز کو دوسرے مرکز یا مراکز سے تصادم و آویزش کی حالت میں دیکھنے میں بھی یقین نہیں رکھتا تھا۔ یہ مراکز کے اختلاف سے صرفِ نظر نہیں کرتا تھا، مگر ان اختلافات کو انسانی فکر کے حتمی و مطلق زمرے تسلیم نہیں کرتا تھا۔ چناں چہ اس کی نظر ان امکانات کی طرف زیادہ تھی، جو مرکز کی شناخت کو قائم رکھتے ہوئے، اشتراکات کو ابھارتے اور باہمی مکالمے اور عمل کی راہیں روشن

کرتے ہیں۔ یہ متبادل بیانیہ ابتدائی صورت میں ہمیں اقبال کے یہاں ملتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اقبال کے یہاں احیا پسند صغیری بیانیے کے اثرات موجود ہیں اور عالم اخوندمیری کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''اقبال کے کلام کے ایک حصے نے یقیناً مشرق کے Myths کو طاقت بخشی ہے اور مشرق و مغرب کے تصادم میں ایک غیر متوازن فضا پیدا کی ہے۔'' ۳۰ بایں ہمہ اردو دنیا میں اقبال ہی پہلے شاعر اور مفکر ہیں، جنھوں نے یورپ کے کبیری بیانیے کا متبادل بیانیہ پیش کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا۔

اصل یہ ہے کہ یورپ کے کبیری بیانیے نے مشرق/ ہندوستان میں تشخّص کا بحران پیدا کیا تھا۔ افراد اور قومیں ہمیشہ کثیر تشخّصات کی حامل ہوتی ہیں اور انھی کی وجہ سے وہ نئے زمانے کی آزمائشوں سے عہدہ برا ہوتی اور اپنا سفر آگے جاری رکھتی ہیں، مگر جب ان پر محدود شناخت تھوپ دی جاتی اور وہ اس کو قبول کر لیتی ہیں تو نئے زمانے سے اجنبی ہو جاتی اور آگے بڑھنے کے بجائے ماضی کی طرف شدّت پسندانہ مراجعت کرنے لگتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرق میں تشخّص کا بحران ایک عظیم چیلنج تھا اور اصلاح پسند و احیا پسند بیانیے، اس چیلنج کا جواب تھے، مگر جتنا بڑا چیلنج تھا، اتنے ہی محدود اور کم زور جواب تھے۔ دونوں میں محدود تشخّص سے آزاد ہونے کی کوشش کی گئی تھی، مگر جس کا نتیجہ دوسری طرز کے محدود تشخّص کو اختیار کرنے کی صورت میں نکلا۔ ان صغیری بیانیوں میں 'یورپ' اور 'مشرق' مثالی تھے اور ہر سوال کا جواب تھے اور اس مفہوم میں یہ دونوں محدود تشخص کے حامل تھے کہ درپیش صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پہلے سے ''موجود و مکمل'' نظام کو اختیار یا بحال کرنے پر زور دیتے تھے۔ اقبال کا طرزِ فکر اس ضمن میں جدا تھا۔ اقبال پہلے آدمی ہیں جنھوں نے تشخص کے بحران کو ایک بڑے چیلنج کے طور پر شدّت سے محسوس کیا اور اس کا موزوں جواب دینے کا جرأت مندانہ اقدام کیا۔ اس جواب یا متبادل بیانیے کا ایک رُخ تو ان کے اس معروف شعر میں ظاہر ہوا ہے:

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر   فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

پہلے دونوں صغیری بیانیوں میں دراصل 'بے زاری' اور 'حذر' کے رویّے تھے جو انھیں اس اصول سے بے گانہ کرتے تھے کہ ہر نئی صورتِ حال یا نیا زمانہ رات کی طرح ہوتا ہے؛ ایک ظلمت، راستے کی تاریکی، فکر کا انتشار یا انجماد کی صورت ہوتا ہے، جِسے بدلنے کا تقاضا خود فطرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ یعنی رات کو سحر میں بدلنا یا خدا کے ساتھ عمل تخلیق میں شریک ہونا، Co-creater بننا (تو شب آفریدی چراغ آفریدم) انسانی تقدیر ہے۔ اس کے لیے مشرق اور مغرب سے استمداد میں قطعاً قباحت نہیں، مگر یہ استمداد اس تنقیدی شعور کے ساتھ ہو جس کا سب سے زیادہ مظاہرہ خود اقبال کرتے ہیں۔ وہ دونوں کے نقائص اور محدودات پر چوٹ کرتے ہیں۔ ہم ان نقائص اور محدودات سے پوری طرح شاید اتفاق نہ کریں، مگر اقبال کے بنیادی نقطہء نظر اور اس کے پیغمبرانہ طرز کے اظہار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اقبال کا بنیادی نقطہء نظر، تہذیبی اساس کو قائم رکھتے ہوئے، مختلف تہذیبوں اور معاصرِ

علوم و ادبیات سے ربط ضبط قائم کرنے سے عبارت ہے۔ اقبال نے اپنے چھٹے خطبے میں اسے ایک اصول کے طور پر پیش کیا ہے:

''اس کے ؓ شر ؓاس کچھ تو اس قسم کے دوامی اصول ہونے چاہیں جو حیاتِ اجتماعیہ میں نظم و انضباط قائم رکھیں کیوں کہ مسلسل تغیر کی اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی کے ساتھ جما سکتے ہیں تو دوامی ہی کی بدولت۔ لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس سے تغیّر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے۔ ۳۱

دوامی اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے تغیّر کا ساتھ دینا، دراصل اپنے کثیر تشخصات کی حفاظت ہے۔ دوامی اصولوں پر ایسا اصرار کہ تغیّر کی نفی یا اس سے گریز ہو، محدود تشخص میں گھر جانے پر منتج ہو جاتا ہے، جب کہ اپنی حیات اجتماعیہ اس نظم و انضباط کو قائم رکھتے ہوئے، ''دیگر'' اور ''نئے'' سے معاملہ کرنا، تہذیبی اقدار کو نئے تشخصات سے ہم کنار کرنا ہے۔ اقبال کے نزدیک حیاتِ اجتماعیہ کی اقدار مذہبی ہیں۔ چناں چہ ان کے نزدیک تغیّر کا ساتھ دینے کا دوسرا نام اجتہاد ہے۔ لہٰذا اجتہاد مذہبی اقدار کو نئے تشخّصات دے سکتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال کا متبادل بیانیہ ــــ یورپ کے کبیری بیانیے کے مقابل متبادل بیانیہ پیش کرنے کا اوّلین اقدام ثابت ہوتا ہے، مکمل اور آخری نہیں۔ اس لیے کہ بیسویں صدی میں کتنے ہی ایسے معاشی، فکری، تہذیبی، اقداری تغیّرات ہوئے ہیں، جنھیں فقط مذہبی تعبیروں کے ذریعے قابلِ قبول بنایا نہیں جا سکتا۔ یا تو انھیں ردّ کرنا پڑے گا یا پھر اپنی اساسی اقدار کے تصوّر میں تبدیلی لانا ہوگی۔

حوالہ جات

۱   رواں بارت (Roland Barthes) کا یہ اقتباس، ان کی کتاب کے انگریزی ترجمے سے لیا گیا ہے، متعلقہ اقتباس یہ ہے:

"Narrative is present in myth, legend, fable, novella, epic, history, tragedy, drama, comedy, mime, painting, ….stained glass window, cinema, news item, conversation. Moreover, under this almost infinite diversity of forms, narrative is present in every age, in every place, in every society; it begins with the very history of mankind and there nowhere is nor has been a people without narrative….caring nothing for the division between good and bad literature, narrative is international, transhistorical, transcultural: it is simply there, like life itself."

ؓ۱۹ء Image, Music, Text، ہل اینڈ وینگ، نیویارک، ص ۷۹)

۲۔ شینک وابیلسن (Schank, R. C. and Abalsan. R.P) بحوالہ ژانوس لیزلو، ۲۰۱۰ء، The Science of Stories روٹلیج، نیویارک ولندن، ص ۷

۳۔ یہ رائے ژانوس لیزلو (Janus Laszlo) کی ہے۔ اس کے اپنے لفظوں میں:

"In order for a representation to qualify as a narrative, be it mentle or linguistic - semiotic it must have two basic properties: it must have some sort of a reference, and some sort of a temporal structure."

رضی اللہ عنہ The Science of Stories، ص رضی اللہ عنہما

۴۔ یہ خیال ایرک سیلبن (Eric Selbin) کا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ دیکھیے:

"The promise of the most compelling stories is the creation of a present in which the past and future exist simultaneously and thus everything seems possible."

رضی اللہ عنہ ۲۰ء، Revolution, Rebellion, Resistance، لندن و نیویارک، زیڈ بکس، ص ۵ رضی اللہ عنہما

۵۔ ٹریویلین (Charles Edward Traveylan) کے اپنے الفاظ ہیں:

"One of these is, through the medium of revolution, the other, through that of reform. In one, the forward movement is sudden and peaceable. One must end in a complete alienation of mind and separation of interests between ourselves and the natives; the other is a permanent alliance, founded on mutual benefit and good-will."

رضی اللہ عنہ ۱۸ء، On The Education of the Poeple of India، لندن، لانگ مین، ارمی، براؤن، گرین اینڈ لانگ منیز، ص ۱۹۲-۹۳ رضی اللہ عنہما

۶۔ ٹریویلین کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"They will then cease to derive and aim at independence on the old Indian footing. A sudden change will be then impossible; and a long continuance of our present connection with India will ever be assured to us"

رضی اللہ عنہ اً ، ص ۹۳ رضی اللہ عنہما

۷۔ ایرک سیلبن (Eric Selbin) کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"Western Culture … is a distinctive complement of arts, sciences, political practices, and philosophical and religious principles which set it apart from other civilizations."

رضی اللہ عنہ ۱۰ء، Revolution, Rebellion, Resistance، لندن، نیویارک، زیڈ بکس، ص ۹۸ رضی اللہ عنہما

۸۔ ایضاً ، ص ۴۰

۹۔ لارڈ تھامس بیننگٹن میکالے، ۱۹۸۶ء ''مقالۂ میکالے'' مشمولہ، میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم (مرتّبہ سید شبیر بخاری) لاہور، آئینہ ادب، ص ۳۱

۱۰۔ ایرک سیلبن، Revolution, Rebellion, Resistance، ص ۹۸

۱۲۔ چارلس ٹریویلین کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"The Arabian or Mohammedian system is based on the exercise of power and the indulgence of passion. Pride, ambition, the love of rule and of sensual enjoyment are called in to the aid of religion.

On The Education of The People of the India رضی اللہ عنہ، ص ۱۸۸-۸۹ رضی اللہ عنہما

۱۳۔ امرتیا سین، (۲۰۰۹ء) تشخّص اور تشدّد (ترجمہ مقبول الٰہی)، لاہور، مشعل، ص ۳۰

۱۴۔ میکالے کے اصل الفاظ درج ذیل ہیں:

"to the literature of Britain… the most durable of all the glories of our country, to that literature, so rich in precious truth and precious fiction… to that literature which has exercised an influence wideer than that of our commerce and mightier than that of our arms….. to that literature, before the light of which impious and cruel superstitions are fast taking flight on the banks of the Ganges."

The Miscellaneous writing Speeches and Poems of Lord Macaulay رضی اللہ عنہ، ۱۸۸۰ء، جلد سوم، لندن، لانگ منیز گرین اینڈ کو، ص ۳۹۰-۹۹ رضی اللہ عنہما

۱۵۔ چارلس ٹریولین کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"Familiarly acquainted with us by means of our literature, the Indian youth almost cease to regard us as foreigners. They speak of our great men with the same enthusiasm as we do. Educated in the same way, interested in the same objects, engaged in the same pursuits with our selves, they become more English than Hindus, just as the Roman provincials became more Romans than Gauls or Italians."

On the Education of the Poeple of India رضی اللہ عنہ، ص ۵ رضی اللہ عنہما

۱۶۔ لارڈ تھامس بیتنگٹن میکالے، مقالہ میکالے، ص ۴۵

۱۷۔ ہومی بھابھا کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"Hybridity is the sign of the productivity of colonial power, its shifting forces and fixities… Hybridity is the revaluation of the assumption of colonial identity through the repetition of discriminatory identity effects."

رضی اللہ عنہ ۲۰ء، The Location of Culture، ص ۷ رضی اللہ عنہما

۱۸ یہ خیالات چارلس ٹریویلین کے ہیں۔اس کے اپنے لفظوں میں:

"The instances in which nations have worked their way to a high degree of civilization from domestic resources are extremely rare, compared with those in which the impulse has been communicated from without, and has been supported by the extensive study and imitation of the literature of foreign countries."

On the Education of the People of In، ص۶

۱۹ لارڈ تھامس بینگٹن میکالے، مقالہ میکالے، ص۴

۲۰ چارلس ٹریویلین، On the Education of the People of India، ص۱۹۵

۲۱ متعلقہ دستاویز میں اصل الفاظ یہ ہیں:

"In mentioning that the tendency of public measures in India is directed towards the ultimate relaxation of the independence which has so long marked the connection between England and the Asiatic possessions of the Crown, it would be folly to affirm that complete independence will ever be accorded to the millions of Hindostan. As much for their safety as far her own, England must ever remain the protectress and arbiter of the Eastern world, or other nations will soon essay to re-impose the yoke of physical as well as moral bondage, under which for centuries India has laboured."

Experiment Policy of the Indian G، ص۱۵۱-۲

۲۲ قرارداد کے اصل الفاظ یہ ہیں:

".... The great object of the British government ought to be the promotion of European literature and science among the natives of India, and that all the funds appropriated for the purpose of education would be best employed on English Education alone."

الہ چارلس ایڈورڈ ٹریویلین، On the Education of the People of India، ص۶

۲۳ تعلیمات عامہ کی کمیٹی کے اصل الفاظ یہ تھے:

"We are deeply sensible of the importance of encouraging the cultivation of the vernacular languages....we conceive the formation of a vernacular literature to be the ultimate object to which all our efforts must be directed...the study of English, to which many circumstances induce the natives to give the preference, and with it the knowledge of the learning of the West, is therefore daily spreading. This as it appears to us, is the first stage in the process of which India is to be enlightened."

اً ، ص۷

۲۴ جیمز برائس (James Bryce) کے اپنے لفظ یہ ہیں:

"It is well known, that the conversion of the people of Hindoostan has been for some years a subject of intense concern with various religious and secular bodies; nearly all of whom are now agreed, that the only feasible plan, is the indirect one by means of education that pioneer __ plough, which is destired to break up the hitherto impenetrable soil, or which the seed of Christianity will one day took root."

"Native Ecucation in India, in connection with church of Scotla، مشمولہ The Oriental heralds and colonial Intellegencies، لندن، جلد ۱۷، جولائی دسمبر ۱۸۳۸ء، ص ۸۷-۸۸

۲۵ چارلس ایڈورڈ ٹریویلین کے اپنے لفظ یہ ہیں:

"....the vernacular tongue began to be cultivated in its improved state; translation and imitation sprang up in abundance, and creative genius accordingly caught the impulse, and struck out masterpiece of its own."

On the Education of the People of Ind، ص۷

۲۶ سرسیّد احمد خاں، (۱۹۶۳ء) مقالات سر سیّد، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۲۶

۲۷ محمد حسین آزاد، نظمِ آزاد، لاہور، شیخ مبارک علی تاج کتب، ۱۹۴۷ء، ص ۲۵

۲۸ محمد حسین آزاد، آبِ حیات (مرتبہ ابرار عبدالسلام)، ملتان، زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۴

۲۹ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، کراچی، پنجاب پبلشرز، س ن، ص ۱۸۴-۱۸۵

۳۰ پروفیسر عالم خوندمیری، (۲۰۱۰ء) اقبال: انسانی تقدیر اور وقت، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ص ۱۴۱

۳۱ علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، (ترجمہ سید نذیر نیازی) لاہور، بزم اقبال، ص ۲۲۷-۲۲۸

¤ ¤ ¤

خادم علی ہاشمی (ملتان)

الاصمعی، عبدالملک بن قریب

ناہرِلسان العربی، ماہرحیوانیات، نباتیات، بیطاری۔ پیدائش: بصرہ 123ھ/ 741ء؛ متوفی: 213ھ/ 828ء

ابوسعید عبدالملک بن قریب کی نسبت ''**اصمعی**'' اُس کے آباء واجداد میں سے ایک سے ماخوذ ہے، جس کا نام اصمع تھا اور الباہلی ایک بدنام قبیلہ ''الباہلہ'' سے لی گئی ہے۔ اس رشتے کے بارے میں ایک ہم عصر شاعر نے ایک ہجو میں اشارہ کیا ہے۔ ایک حکایت میں اس نے اپنے آپ کو ابواعصُر بن سعد بن قیس عیلان کی اولاد میں سے ظاہر کیا ہے۔ اصمعی اور اُس کے ہم عصر ابوعبیدۃ اور ابوزیدالانصاری باہم مل کر تین آدمیوں کا ایک گروپ بناتے ہیں، جنھوں نے عربی، **علم اللغۃ** اور **علم الشعر** کے سلسلے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ یہ تینوں بصرے کے سربرآوردہ ماہر لغۃ ابوعمرو بن ابی العلاء کے شاگرد ہیں۔ ان کے کثیر تعداد شاگردوں میں الجاحظ بھی شامل ہے، جس نے ان کی علمی قابلیت کی بہت تعریف کی ہے۔

حیرت انگیز حافظہ اور غیر معمولی تنقیدی طبیعت اصمعی کی امتیازی شان تھی۔ تاریخی واقعات، قصے کہانیاں اور لسانی معاملات میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جب شاعر ابونواس کو معلوم ہوا کہ اصمعی اور ابوعبیدہ ہارون الرشید کے دربار سے منسلک ہوگئے ہیں تو اس نے کہا کہ مؤخرالذکر تو قدیم اور جدید تاریخ بیان کرے گا جب کہ اصمعی اپنی شاعری سے دل موہ لے گا۔۔ ابن شبّا کو اصمعی نے خود بتایا کہ اسے سولہ ہزار رجزیہ اشعار یاد ہیں۔ اسحٰق الموصلی کا کہنا ہے کہ اس نے اصمعی کو کسی ایسے علم کو جاننے کا دعویٰ کرتے نہیں سنا، جس کے بارے میں اسے یقین نہ ہو کہ اس سے بہتر اور کوئی نہیں جانتا۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق اصمعی سوار ہوکر دیہات میں بدوّں سے ملنے جایا کرتا تھا، تا کہ ان کے منہ سے اشعار کے قطعات سن کر جمع کرے۔۔ ابھی وہ نوجوان ہی تھا کہ طالبانِ علم اُس کی تلاش میں رہنے لگے اور اس وقت اس کی ''مجلس'' دور دور تک مشہور ہوچکی تھی۔ علم اللسان کے مختلف شعبوں میں سے، جو اس وقت تک ترقی پا چکے تھے، اس کا ذہن علم اللغۃ سے خاص مطابقت رکھتا تھا۔

خاصی املاک کا مالک ہونے کے باوجود ایرانیوں کے ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کے مقابلے میں اصمعی سادہ اور ایک مفلس شخص کی طرح رہنے پر اصرار کرتا تھا۔ وہ اس سادہ بود و باش کو جو حضرت عمرؓ بن خطاب اور الحسن

البصری کی ؒ سے منسوب ہے عرب کی خالص زندگی کا نمونہ سمجھتا تھا۔ اس کے ہم عصر اور بعد کے مصنفین سب اس بات پر متفق ہیں کہ اصمعی ایک راسخ العقیدہ سنی تھا۔ ابراہیم الحربی کا کہنا ہے کہ بصرے کے ماہرینِ لسان میں صرف چار شخص گزرے ہیں جو پوری طرح سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند تھے اور ان میں ایک اصمعی تھا۔

کہتے ہیں کہ خلیفہ ابوجعفر منصور (۷۰۹ء تا ۷۷۵ء) کا حافظہ بہت عمدہ تھا۔ وہ کسی نظم کو ایک بار سن کر یاد کر لیتا۔ اس نے ایک مقابلے کا اعلان کیا کہ جو کوئی نئی نظم سنائے، جسے خلیفہ نے پہلے کبھی نہ سنا ہو ایسے شاعر کو ایک معقول انعام دیا جائے گا۔ جب شاعر کلام سنانے کے لیے آئے تو خلیفہ نے ایک لڑکے کو اپنے تخت کے عقب میں پردے کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ یہ لڑکا کوئی بھی نظم دو مرتبہ سن کر یاد کر لیتا۔ اسی طرح ایک کنیز جو کسی بھی نظم کو تین مرتبہ سن کر سنا دیتی، اسے بھی اس لڑکے کے برابر جگہ دی۔

مقابلے کے دن سلطنت بھر سے شعرا دربار میں جمع تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش تھی کہ وہ اپنا تازہ ترین کلام سنا کر جسے خلیفہ نے ہرگز نہ سنا ہوگا، انعام حاصل کرے۔ پہلا شاعر جو خلیفہ کے سامنے کلام پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا قطعی طور پر پُر امید تھا کہ وہ انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔ کیوں کہ وہ رات بھر نئی نظم تیار کرتا رہا تھا جسے کسی اور نے نہیں سنا تھا۔ جب اُس نے خلیفہ کے سامنے اپنی نظم پیش کر کے خلیفہ کی جانب اس امید پر بڑھا کہ اب اسے انعام سے نوازا جائے گا۔ تو اسے اس وقت سخت صدمہ پہنچا جب خلیفہ نے کہا کہ یہ نظم تو میں نے پہلے بھی سنی ہے۔ اور خلیفہ نے وہی نظم پوری کی پوری بغیر کسی غلطی کے سنا دی۔ اس پر شاعر پر شدید حیرانی طاری ہوگئی اور اس نے کہا ''یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے ساری رات لگا کر یہ نظم ترتیب دی ہے''، اور دل میں کہا کہ خلیفہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ نظم پہلے بھی سنی ہے۔ خلیفہ نے حیرت زدہ شاعر سے کہا ''تم حیران نظر آتے ہو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے یہ نظم پہلے بھی سنی ہے۔ میں اور لوگوں کے بارے میں بھی جانتا ہوں جنھوں نے اسے پہلے سنا ہے''۔ اس پر خلیفہ نے پردے کے پیچھے کھڑے ہوئے لڑکے کو طلب کیا۔ شاہی محافظ اس لڑکے کو بلا لائے۔ خلیفہ نے اس سے پوچھا کیا تم نے یہ نظم پہلے سنی ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا، تو خلیفہ نے اسے نظم سنانے کو کہا۔ لڑکے نے وہ نظم بغیر کسی غلطی کے سنا دی۔ کیونکہ اس لڑکے نے یہ نظم دو بار سنی تھی۔ ایک مرتبہ شاعر کی زبانی اور دوسری مرتبہ خلیفہ کے منہ سے۔

شاعر کی حیرت اور بے یقینی کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے، خلیفہ نے کہا ''دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے یہ نظم سنی ہوئی ہے'' اور خلیفہ نے کنیز کو طلب کیا، جو پردے کے پیچھے موجود تھی اور جس نے یہ نظم تین بار سنی تھی، شاعر، خلیفہ اور پھر اُس لڑکے کی زبانی۔ خلیفہ نے اس کنیز سے پوچھا کیا اس نے وہ نظم پہلے سنی ہے؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا اور پوری نظم بغیر کسی غلطی کے سنا دی۔ دربار کی پیچیدگیوں سے بے بہرہ شاعر دربارِ سے بے نیل و مرام واپس لوٹ گیا۔

انعام حاصل کرنے کی غرض سے آنے والے ہر شاعر کے ساتھ خلیفہ یہی سلوک کرتا رہا۔ ایک ایک کر کے سلطنت کے کونے کونے سے آئے ہوئے شاعر نا کام واپس لوٹتے رہے۔ بہت نا کام شاعر دربارِ خلافت کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کو یقین تھا کہ اس نے نئی نظم خلیفہ کی خدمت میں پیش کی ہے، جسے کسی نے پہلے نہیں سنا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ خلیفہ، لڑکا اور کنیز نے پہلے کبھی سنا ہو۔ چنانچہ وہ حیرت زدہ بیٹھے صورتِ حال پر تبصرہ کرنے لگے۔ دربارِ خلافت کے باہر اس اجتماع کو دیکھ کر ادھر سے گزرتے ہوئے اصمعی رکا اور صورتِ حال معلوم کرنے پر وہ اصل بات سمجھ گیا۔ اصمعی دربار میں داخل ہوا اور اس نے خلیفہ کی اجازت سے یہ نظم سنائی:

صوت صفير البلبلى ☆ هيج قلبى الثملى
الماء والزهر معا ☆ مع زهر الحظِ المُقلى
وأنت يا سيد لى ☆ وسيدى و مولى لى
فكم فكم تيمنى ☆ غُزيل عقيقلى
قطَفته من وجنة ☆ من لثم ورد الخجلى
فقال لا لا لا لا لا ☆ وقد غدا مهر ولى
والخُوذ مالت طربا ☆ من فعل هذا الرجلى
فو لو لت و ولولت ☆ ولى ولى يا ويل لى
فقلت لا تولو لى ☆ وبينى اللؤ لى
قالت له حين كذا ☆ انهض و جد بالقلى
وفتية سقوننى ☆ قهوة كالعسل لى
شممتها بأ نافى ☆ أزكى من القر نفلى
فى وسط بستان حلى ☆ بالزهر والسرور لى
والعود دندن دنا لى ☆ والطبل طبطب طب لى
لبطب طب طبطب ☆ طب طبطب طبطب طب لى
واسقف سق سق سق لى ☆ والرقص قد طاب لى
شوى شوى وشاهش ☆ على ورق سفر جلى
و غرد القمرى يصيح ☆ ملل فى مللى
ولو ترانى راكبا ☆ على حمار اهزلى
يمشى على ثلاثة ☆ كمشية العرنجلى

والناس ترجم جملى ☆ فى السوق بالقلقللى
والكل كعكع كعكع ☆ خلفى و من حويللى
لكن مشيت ها ربا ☆ من خشية العقنقلى
إ لى لقاء ملك ☆ معظم مبجلى
يأ مر لى بخلعة ☆ حمراء كالدم دملى
اجر فيها ماشيا ☆ مبغد دا للذيلى
انا الأ ديب الألمعى من ☆ حى ارض الموصلى
نظمت قطعا زخرفت ☆ يعجز عنها الأدبولى
أ قول فى مطلعها ☆ صوت صفير البلبلى

اب خلیفہ کے حیران ہونے کی باری تھی۔ اس نے اس قسم کی نظم پہلے کبھی نہیں سنی تھی، جس میں صوتی وضع کی ایسی ترکیبیں تھیں کہ انہیں یاد کرنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ خلیفہ نے لڑکے اور کنیز کو طلب کیا اور پوچھا کیا انہوں نے ایسی نظم پہلے کبھی سنی ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا تو خلیفہ نے انعام کی رقم اصمعی کو دینے کا حکم دے دیا۔

اصمعی سے بہتر طور پر کبھی کسی نے صحرائے عرب کے محاوروں کی وضاحت نہیں کی۔ اُس کی بیشتر کتابیں جو چھتیس ہیں، زبان اور صرف و نحو پر ہیں۔ اس نے ایک کتاب گھوڑوں پر بھی لکھی، اور مختلف کتابیں کئی دوسرے جانوروں پر، مثلاً اونٹ، بھیڑ، وحشی درندوں وغیرہ پر اور ان کی فزیالوجی پر مرتب کیں۔ اصمعی نہ صرف ماہرِ لسانیات تھا، بلکہ اس نے حیوانیات، نباتیات اور بیطاری (Animal Husbandry) میں اہم اضافے کیے۔ وہ پہلا مسلمان سائنس دان مانا جاتا ہے جس نے ان علوم میں کام کیا۔ اُس کی معروف تصانیف میں **کتاب الابل**؛ **کتاب الخلیل**؛ **کتاب الوحوش**؛ **کتاب الشاء**؛ اور **کتاب خلق الانسان** شامل ہیں۔ مؤخر الذکر تصنیف، جو انسانی اناٹومی (تشریح الاعضاء) پر ہے، اس موضوع پر اُس کی معلومات اور مہارت کی آئینہ دار ہے۔

گھوڑے اور اونٹ پالنے اور ان کی نگہداشت کرنے کے عربوں کے مشاغل کی بنا پر ساتویں صدی عیسوی کی ابتداء ہی سے سائنسی انداز میں ان جانوروں کے بارے میں مطالعات کی بنا پڑی۔ اموی خلفاء کے دور میں متعدد سائنس دانوں نے جانوروں اور پودوں کے طرزِ عمل اور درجہ بندی کا مطالعہ کیا اور اسے ضبطِ تحریر میں لائے۔ نویں اور دسویں صدی کے سائنس دانوں میں اصمعی انتہائی مقبول تھا۔

کتابیات: اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، لاہور۔

http://sunniforum.com, Arabic Poetry

احسان سہگل (ہالینڈ)

جمیل الرحمٰن کی

چالیس سالہ شاعری کا سفر اور نتیجہ

جمیل الرحمٰن جن کے چند مجموعے مخصوص فکری منظر پس منظر کے حوالے سے شائع ہو چکے ہیں، گزشتہ سال ان کا آزاد نظموں کا ایک مجموعہ ''خواب، ہوا اور خوشبو'' شائع ہوا ہے۔ان کی نظموں پر کچھ لکھنے سے پہلے ان کے ایک وضاحتی نوٹ پر کچھ عرض کرنا مناسب لگتا ہے۔انہوں نے اپنے وضاحتی نوٹ کے دوسرے پیرا میں لکھا ہے:

''اگرچہ ہر نظم کو لکھتے ہوئے میں نے روایتی عروض اور پنگل سے حسبِ ضرورت کام لیا ہے مگر جہاں خیال اور جذبے کی ترسیل میں کسی معیّن لفظ کے استعمال کے بارے میں عروضی تقاضوں نے کوئی اڑچن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تو میں نے لفظ کی ناگزیریت کو عروض کی ثانویت پر ترجیح دی ہے۔عکس اور پرچھائیں ایسے قریب المفہوم الفاظ میں ان کی اپنی معنویت کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق ہے۔کسی ایک لفظ کی جوہری اکائی نہ صرف معیّن بلکہ ہر دوسرے لفظ سے مختلف ہوتی ہے۔لہٰذا اگر کہیں ایک معیّن لفظ کا استعمال ناگزیر ہو جائے تو وہاں اس کا متبادل لفظ استعمال کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔خیال و جذبے کا جمال لفظ کے بنیادی جوہر کو بروئے کار لا کر ہی نکھر سکتا ہے۔میری رائے میں جہاں لفظ کے بنیادی جوہر کے امکانات کو بروئے کار لانے کا مسئلہ درپیش ہو، ایک نظم گو کے لیے عروض کی حیثیت ثانوی ہو جانی چاہیے۔''

جمیل الرحمٰن نے اپنے وضاحتی نوٹ میں اس رائے کا اظہار کر کے اس بات کا اقرار کر لیا ہے کہ وہ قادر الکلام شاعر نہیں ہیں۔یہ بات ممکن ہی نہیں کہ ایک شاعر کے پاس کوئی متبادل اور بہتر دوسرا لفظ نہ ہو، جو عروضی اور معنوی دونوں لحاظ سے درست بیٹھتا ہو۔عروض شاعری کی بنیاد ہے۔انہوں نے لفظ کی ناگزیریت کو عروض پر فوقیت دی ہے، یہ ان کی اپنی ناقص رائے ہے۔کلاسیکل شعراء اس نکتے پر دوسری طرح سوچتے ہیں۔یہاں صرف مرزا غالب کی ایک مثال دوں گا، جس سے جمیل الرحمٰن کے استدلال کی مکمل نفی ہوتی ہے۔غالب کا ایک مشہور شعر ہے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غالبؔ کے شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ ''درد'' استعمال ہوا ہے جو صرف عروض کی مرکزیت کو قائم کرنے کے لیے ہے۔ورنہ یہاں لفظ ''مرض'' معنوی لحاظ سے بھرپور مفہوم کا حامل ہوتا، لیکن اس سے وزن کا خانہ خراب ہو جاتا۔جیسا کہ جمیل الرحمٰن نے اپنی کئی نظموں میں لفظ کی ناگزیریت کا سہارا لے کر کیا ہے۔

جمیل الرحمٰن کے ایک تعارفی نوٹ میں اس بات کا ذکر بھی ہے کہ وہ اردو زبان و ادب، علم المعانی و علم البیان میں بھی خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنی نظموں میں اس بات کا کس حد تک خیال رکھا ہے، ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔پہلی غلطی ان کے وضاحتی نوٹ کے آخری جملے میں موجود ہے۔

''ایک نظم گو کے لیے عروض کی حیثیت ثانوی ہو جانی چاہیے''

یہاں انہوں نے مصدر ''جانا'' چاہیے کو ''جانی'' چاہیے، لکھا ہے جو قواعد کی رُو سے غلط ہے۔

ان کی ایک نظم ''نامکمل بیاں'' کی ایک لائن ہے: ''درمیاں میں زمانوں سے ہوتی ہوئی''

یہاں موصوف نے درمیاں میں لکھا ہے، جو غلط ہے جبکہ درمیاں کا مطلب ہی بیچ میں ہے۔جیسے: دراصل، اصل میں۔۔درحقیقت، حقیقت میں۔۔اسی طرح درمیان، میان میں، یعنی بیچ میں۔

نظم ''اک مٹھی آٹا لا دینا'' کی سطریں

ناوقت صدائیں دینے لگے /　　　بے طلب دعائیں دینے لگے

''ناوقت'' کون سی زبان ہے۔یہاں بے وقت ہی فصیح ہوتا۔

نظم ''کہاں ہے وہ جس کے لیے'' کی آخری سطر:

''الجھتے ہوئے خواب کی ہر گرہ کھولنی ہے''

یہاں ''کھولنا'' مصدر ہے۔موصوف نے کئی دوسری نظموں میں بھی مصدر کو غلط باندھا ہے۔

نظم ''بستی اور مسافر'' کی آخری سطریں:

کون ہے جو اڑتے بادل کو ٹوک سکا ہے　　　کون ہے جو بہتی خوشبو کو روک سکا ہے

یہاں ''بہتی خوشبو'' کی بجائے ''مہکی خوشبو'' شاید بہتر رہتا۔بہتی شے کو کسی نہ کسی طرح تھوڑا بہت روکا جا سکتا ہے۔

نظم ''ماہی گیر'' کی سطر　　　مری طرح سے وہ بھی بہت اکیلا ہے

یہاں ''مری طرح سے'' غلط ہے۔''مری طرح'' درست ہے۔

نظم ''دل کے افق پر، ہوا سے پہلے'' کی سطر　　　''تیزیٔ غم سے پھوٹ بہیں پھپھولے''

یہاں تیزیٔ غم غلط ہے، کیونکہ فارسی و عربی لفظ کے ساتھ اردو و ہندی لفظ پر اضافت جائز نہیں لیکن جمیل الرحمٰن اسے درست خیال کرتے ہیں۔اس عیب سے بچنے کے لیے یہاں ''سرعتِ غم'' لایا جا سکتا تھا۔اور بھی کئی نظموں میں انہوں نے اردو اور ہندی الفاظ پر اضافت لگائی ہے جو اساتذہ کے نزدیک فصیح اور مستحسن نہیں ہے۔البتہ اردو اور ہندی اسم کے ساتھ اضافت کو جائز قرار دیا گیا ہے اور اساتذہ نے برتا بھی ہے۔

نظم ''میں خود سوچتا ہوں'' کی سطریں۔

بلا ریب کوئی نہیں جانتا /　　　میں خود سوچتا ہوں مجھے ایک مدت سے کیا ہو گیا ہے

''بلا ریب'' کونسی زبان ہے۔لا ریب تو سنا اور برتا دیکھا ہے لیکن بلا ریب نہیں۔اس کی جگہ ''حقیقت میں کوئی نہیں جانتا'' درست ہوتا۔دوسری سطر وزن میں نہیں ہے۔وہی لفظ کی ناگزیریت والی بات لاگو ہو گئی ہے۔حالانکہ یہ

سادہ سی سطراس طرح بھی ہوسکتی تھی جس سے وزن بھی قائم رہتا ہے۔

''سوچتاہوں میں خودبھی، مجھے ایک مدت سے کیا ہوگیا ہے''

نظم ''نئے زینے کی تلاش'' کی سطریں:

''اک نئے زینے کی خواہش پردبے پاؤں قدم رکھتی رپسِ پردہ پھیلی تنہائی کی چادرکولپیٹے ر
گھر کے اندرلوٹ جاتی ہورکوئی تارہ افق پر ہو''

پہلی سطر میں ''دبے پاؤں'' کے بعد ''قدم رکھتی'' کیا بات ہوئی؟ یہاں ''قدم رکھتی'' معنوی اور ترکیبی لحاظ سے اضافی اورغیرضروری ہے۔ ''قدم رکھتی'' کے بغیرہی سطردرست ہے، یعنی:

''اک نئے زینے کی خواہش پردبے پاؤں رپسِ پردہ پھیلی تنہائی کی چادرکولپیٹے
گھر کے اندرلوٹ جاتی ہورکوئی تارہ افق پر ہو''

نظم ''فنا کے بےاسم راستے پر'' کی سطر:

''غبارِفرسِ خیال کی طرح ایک دھندسی مسافتوں میں اُگی ہوئی تھی''

یہاں ''غبارِفرسِ خیال'' وزن میں نہیں کیونکہ فرس کی ''ف'' اور ''ر'' متحرک ہے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جمیل الرحمٰن کے نزدیک اگرایک معیّن لفظ کا ستعمال ناگزیر ہو جائے تو وہاں اس کا متبادل لفظ اختیار کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔دوسرے اس بحر میں کسی قسم کا خلط جائزنہیں۔یہاں ''غبارِاسپِ خیال'' کی ترکیب درست رہتی۔اس سطر میں دوسرا عیب ''اُگی ہوئی تھی'' ہے۔کوئی بتائے کہ دھندکبھی اُگتی بھی ہے؟

نظم ''پھولوآ ؤ کب آ ؤ گے'' کی پہلی دوسطریں غورطلب ہیں۔

سانسوں کی آہٹ مدھم ہےرسینے میں شورِتلاطم ہے

یہاں اگر ''مدھم'' اور ''تلاطم'' قافیہ ہےتو یہ غلط ہے، کیونکہ تلاطم کے ''ط'' پر پیش ہے، زبرنہیں۔

نظم ''جہنم'' کی سطر: نہ ملتا ہے افق کوئی کہیں پر

یہاں ''کہیں پر'' غلط ہے۔کہیں، کہاں، یہاں، وہاں، یہیں اور جگہ کے ساتھ ''پر'' نہیں لگایا جا سکتا اورنہیں لگانا چاہیے۔

ایسی اغلاط سے ہٹ کرجمیل الرحمٰن نے جونئی نئی تراکیب استعمال کی ہیں، وہ بہت ہی ناقص اورحقیقت سے دوراور معنوی طور پرانتہائی کمزور ہیں، بلکہ غلط بھی ہیں۔اب ہمیں کوئی بتائے کہ ''برفیلے سورج'' بھی ہوا کرتے ہیں؟ دہشتِ کم خرام''، ''گھنگورااداسی'' یہ کیسی تراکیب ہیں اوران کے کیا معنی ہیں۔ ''طعنِ رنجِ سفر'' اوراسی قسم کی دوسری تراکیب کیا معنی رکھتی ہیں۔یہ نہ صرف جمیل الرحمٰن کی ناقص کوشش ہے بلکہ انہوں نے اپنی صلاحیت کوغلط سمت موڑا ہے۔ان کی اکثرنظمیں عام سی نظمیں ہیں، کئی نظموں میں تسلسل نہیں، نہ لفظی اورنہ معنوی۔کئی سطریں بے تعلق اور بے ربط ہیں جونظرِ ثانی چاہتی ہیں۔

یہاں تک تو ایک طائرانہ نظر سے تنقیدی پہلوکواجاگرکیا گیا ہےلیکن اس کا یہ مطلب ہرگزنہیں کہ جمیل الرحمٰن

اصلی اور معتبرشاعرنہیں ہیں۔وہ واقعی شاعر ہیں اورانہوں نے اچھی نظمیں بھی کہی ہیں۔جمیل الرحمٰن نے آزادنظم کی روایت کواپنے فکری اورشعوری تناظر میں سمجھنے اور برتنے کی پوری اور مستحسن کوشش کی ہے۔ان نظموں میں جہاں دھیما پن ہے، وہاں کہیں کہیں لہجہ بلند آہنگ بھی ہے۔

شیر کی شہ پر ہے گرگِ بدنہاد اپنی فتح پرنعرہ زن رلے رہے ہیں کتنے اطمینان سے جنگل کے سارے جانورر گردشِ شام وسحر سے دم بدم اپنی زباں بندی کی دادراور چلاتی ہے دامِ گرگ میں بزرالجہاد والجہاد والجہاد (**فلسطین**)

ان کی بعض نظموں میں بلا کی سلاست اورروانی ہےجس سے قاری ایک خوش کن حظ سے ہمکنار رہتا ہے۔

ان کی نظمیں ''کیا عجب تماشا ہے''، ''خاموشی کا سچ''، ''مگر ہے بابا فلسطین''، ''اجازت''، ''عکسِ بے نشاں''، ''اندیشہ''، ''خوف رواں'' اور ''ناراض روشنی سے روٹھی ہوئی نظمیں'' اہم نظمیں ہیں اور اعلیٰ معیار کی حامل ہیں۔جمیل الرحمٰن نے اپنی شاعری میں تنہائی کے احساس کوایک انوکھے انداز میں پیش کیا ہے، جس سے قاری کا ذہن متاثر ہوئے بغیرنہیں رہ سکتا۔

خواب زدہ زمین پرروقت کی بات رہ گئی ردیدۂ غم کے روبرورہجر کی رات رہ گئی ر

چہرۂ خاک پہ مرتسم رایک جہانِ خواب تھارا ور جہانِ خواب تک رفاصلہ بےحساب تھا

(ناراض روشنی سے روٹھی ہوئی نظمیں)

مجموعی طور پرجمیل الرحمٰن کا یہ مجموعہ آزادنظم کی تاریخ میں اپنی خامیوں کے باوجودایک مخصوص اہمیت کا حامل ثابت ہوگا۔جمیل الرحمٰن نے مجموعے کے آخر میں چندطویل نثری نظمیں بھی شامل کی ہیں، جونثری نظم کم اورمختصرافسانہ زیادہ لگتی ہیں۔

تجھے حمد و ثنا زیبا ہے پیارے که تونے کام سب میرے سنوارے
ترے احساں مِرے سرپر ہیں بھارے چمکتے ہیں وہ سب جیسے ستارے
گڑھے میں تونے سب دشمن اتارے ہمارے کر دیئے اونچے منارے
مقابل میں مرے یہ لوگ ہارے کہاں مرتے تھے پر تونے ہی مارے
شریروں پرپڑے ان کے شرارے نہ اُن سے رُک سکے مقصد ہمارے
اُنہیں ماتم، ہمارے گھر میں شادی

فسبحان الذی اخزی الاعادی

(**درِّ ثمین** سے انتخاب)

ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)

خالد سہیل ۔۔ محبت اور انسانیت کا استعارہ

کچھ نام لفظوں سے مل کر وجود میں آتے ہیں اور کچھ لفظ ناموں سے وجود پاتے ہیں مگر کچھ نام ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ساخت اور تشکیل میں الفاظ سے زیادہ ایک منفرد معنویت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اظہار میں الفاظ کی تشکیل تو کرتے ہیں مگر اُن کی تخلیقی جبلت بہت جلد اُنہیں لفظوں کے ظاہری ڈھانچے سے نکال کر اُس کے باطنی معنوں سے ہم کنار کر دیتی ہے اور پھر اُن کے لیے الفاظ، جیسے کسی کیمیائی عمل کے دوران حصہ لینے والے محض ساختی عناصر کا اور اُن سے پیدا ہونے والے معنی، سارے سماجی ڈھانچے پر اثر انداز ہونے والے کمپاونڈ کا سا احساس کچھ یوں رکھتے ہیں کہ وہ کسی سائنسدان کی طرح اس سارے کیمیائی عمل کے بہترین نتائج کے لیے اپنی ساری عمر داؤ پر لگا دیتے ہیں ۔۔معنوں کی تشکیل میں مبتلا ایک ایسا ہی سماجی سائنسدان ڈاکٹر خالد سہیل ہے جو اپنی زندگی کی پچھلی تین دہائیوں سے ایک ایسے انسانی معاشرے کا خواب دیکھ رہا ہے جس میں لفظ ''انسانی معاشرہ'' اپنی اصلی معنویت میں واقعتاً اس کائنات میں اپنا وجود رکھتا ہو۔ وہ لگ بھگ پچھلے تیس سالوں سے اپنے تخلیق کے تمام تر سوتوں سے معنوں کی ایک ہی مضبوط گٹھان کو بار بار باندھ رہا ہے جس کے ہر ایک بَل میں انسانیت رنگ، نسل اور مذہب کے مصنوئی دھاگوں کے بجائے محبت کے قدرتی رنگوں کے دھاگوں سے گسی ہوئی ہو۔ اُس گٹھان کی تمام تر ساخت میں لفظ خالد اور سہیل محض انسانیت اور محبت سے بدل کر اپنی تخلیقی شکل کو مسلسل متعین کر رہے ہیں۔ پچھلے تیس سالوں سے وہ اپنے تخلیق کے تمام تر عناصر کو، چاہے وہ نظم ہو یا غزل، افسانہ ہو یا ناول، مضمون ہو یا ترجمہ، انٹرویو ہو یا مباحثہ صرف ایک ہی بائی پروڈکٹ کے حصول کے لیے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ استعمال کر رہا ہے اور وہ ہے ۔۔انسانیت اور محبت۔ خالد سہیل کے نام میں شامل دونوں لفظ اب اپنی لغت کے روائتی قد و خال کو توڑ کر بالترتیب انسانیت اور محبت میں اُتر کر تخلیقی دنیا کے لیے وہ خوش بخت فکری اشارہ بن گئے ہیں کہ زندگی کو دیکھنے اور بدلنے کی جمالیاتی نظر میں تبدیلی محض طویل تر تخلیقی تربیت، نت نئے علمی تجربات اور تھکا دینے والے فکری عمل سے ہی ممکن ہے۔

انسانیت اور محبت کے استعارہ خالد سہیل کی ساری زندگی ہجرت سے علامت ہے مگر یہ ہجرت بنیادی طور پر جسمانی سے زیادہ فکری ہے کہ انسانیت اپنی پرتوں میں ہجرت کرے یا ترک مکانی، سوائے محبت کے کسی اور منزل کا سراغ نہیں پاتی اور فطرت نے یہ راز اُن کی پیدائش سے قبل ہی ہجرت کے تجربوں کی صورت اُن کے اجداد پر منکشف کر دیا تھا۔ یہی فکر، تجربوں کی صورت پھر اُن کی جین میں ایک انقلابی رویہ بنی اور سوچ کے اُس دھارے کو جنم دیا جو اپنے تخلیق کے قوس اور زاویے متعین کرتی ہے۔ اُن کی پیدائش سے قبل ہونے والی اُن کے اجداد کی کشمیر سے پنجاب اور پھر امرتسر سے لاہور کی تلخ ہجرت اپنے واقعہ میں اُن کی روحوں کو ذخمی کر دینے والے موروثی تجربے بو گئی اور پھر پیدائش کے بعد لاہور سے کوہاٹ کی لسانی، تہذیبی اور معاشی ہجرت، تلخ و شیریں سوالات کی صورت اُن کی نشو ونما پر گہرے اثرات چھوڑ گئی۔ انسانیت اور محبت کے اِس مجنوں کے خمیر میں ہجرت تھی ایسی ہجرت جو اپنی علامت میں فکر کا استعارہ بن گئی۔ فکر، جو زبان، نسل اور مذہب کی بوسیدہ اقدار کے لیے پہلے پہل تو سوال اور پھر اپنی منزل کو نہ پا کر محبتوں میں اپنی جگہ ڈھونڈنے لگی اور جب روائتی معنوں سے ناامید ہوگئی تو بالاخر جواب کی صورت اپنی نئی منزلوں کے لیے ایک بار پھر ہجرت میں مبتلا ہوئی۔ اِس بار فکر کا سفر اپنی ساخت میں زبان، نسل اور مذہب کے علاوہ محبت کے وسیع ترین معنوں کے لیے بھی تھا۔ چاہے وہ خود کو تخلیق دینے والی ماں کی محبت کے لیے تھا یا تخلیق کے بعد نشو ونما دینے والی دھرتی ماں کے لیے، دونوں ہی صورتوں میں اُن کی تخلیقی جبلت نے اُن کا اپنی ماؤں سے وہ رشتہ پیدا کیا جو پھر کرب کی صورت اُن کے افسانوں 'دھرتی ماں اداس ہے'، 'اپنے دور کی یوسف ماں' اور 'تسبیح کے دانوں' میں ظاہر ہوا۔

فکر خود اپنی جبلت میں علم کے سوا کچھ نہیں، شائد یہی وجہ ہے کہ اپنی منزل کی تلاش میں مبتلا خالد سہیل کی فکر نے سوال کے بجائے جواب بننے کے عمل کے لیے ادب، فلسفہ، مذہب اور نفسیات جیسے سخت اور پتھریلے اور خاردار راستے کو اختیار کیا جس کے منڈھیروں پر فیض، ساحر، جوش، ناصر کاظمی اور مجید امجد کے سائے پھیلے ہوئے تھے، جس کے کناروں پر اُگی ہوئی جنگلی بوٹیوں میں کرشن، منٹو، بیدی، عصمت اور قراۃ العین کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں اور جس کی زمین پر بکھری ہوئی مٹی میں فرائڈ، برٹنڈ رسل، الفریڈ ایڈلر، اقبال، مودودی اور ابوالکلام آزاد کی محبتیں بسی ہوئی تھیں۔ خداؤں کے ایمان پر سوال اُٹھاتی ہوئی شاعری ہو یا دھرتی ماں کی امن و آشتی کا سُراغ پانے کے لیے تخلیق کردہ مضامین، انسانیت کے پیار میں ڈوبے ہوئے خالد سہیل کے مجنونانہ محبت نامے ہو یا خارجی دنیا کے وحشت زدہ شور سے انسانی روح کی موسیقیت کے مرجانے کا خوف، خالد سہیل کے اندھے پیار کی گرمی اُس کے قلم کے لیے ایک لامتناہی توانائی کا سبب گئی۔ یہ توانائی ہی تو تھی جو کبھی لکھاری کے روپ میں تو کبھی مقرر کی شکل میں، کبھی ماہر نفسیات کی طرح تو کبھی ہیومنسٹ بن کر مشرق اور مغرب دونوں ہی کی دانشمندی کے ملاپ سے انسانی ارتقاء کی اُس نشونما کا خواب دیکھ رہی تھی جس کی آخری منزل انسانیت کے لیے امن و آشتی اور

پیار و محبت ہے۔

خالد سہیل کی پوری زندگی مسلسل محنت اور مستقل فکر سے عبارت ہے۔ اُن کی شخصیت کے تمام تر گرین زون ڈائمینشن زکی توانائی کا ممبع درحقیقت ایک دہکتا ہوا سُرخ زون ڈایمنشن ہے جو اپنی ذات کی ارتقاء میں 'تلاش' سے طلوع ہوا، 'زندگی میں خلا' سے ہمکنار رہا، 'بھگوان، ایمان اور انسان' کی تلاش میں کسی درویش کی صورت آوارہ ہوا، کبھی 'دو کشتی میں سوار' کسی 'ٹوٹے ہوئے آدمی' کی صورت تو کبھی 'امن کی دیوی' بن کر 'خدا، مذہب اور ہیومنزم' کے فلسفوں میں الجھ کر 'دھرتی ماں کی اداسی' کا راز جاننے کے لیے 'ہر دور میں مصلوب' انسانیت کو آزاد کر کے اُنہیں امن و آشتی کے نئے 'سمندر اور جزیروں' پر پہنچانے کا خواب خود میں سمیٹے ہوئے ہے۔

خالد سہیل کا سرخ زون ڈائمنشن اپنی معنویت میں نفسیات کی روائتی اصطلاح سے مختلف تخلیقی توانائی کا وہ استعارہ ہے جو ساری کائنات کو اُن کے نام کی معنویت سے بدل کر انسانیت اور محبت کے گرین زون ڈائمنشن میں ایک دن جذب کر دے گا کیونکہ یہ اُن کا ہی نہیں میرا بھی یقین ہے کہ۔۔ دنیا میں اتنی ہی سچائیاں ہیں جتنے خود انسان اور اتنی ہی حقیقتیں ہیں جتنی اُن انسانوں کی دانشمندانہ نگاہیں۔۔۔ (ڈاکٹر خالد سہیل)

مجھے یہ خاکے نہ نفسیاتی لگے نہ تجزیاتی، محاکاتی، وارداتی وغیرہ۔ میرے نزدیک ان کی نوعیت تذکراتی، تبصراتی اور واقعاتی ہے مگر مصنف کے کمالِ فن نے ان کو جو افسانوی ''تڑکا'' لگایا ہے اس سے یہ تحریر رسمی سوانحی یا دستاویزی نہیں رہی بلکہ ایک تخلیقی ادب پارے میں ڈھل گئی ہے اور ذاتی اور واقعاتی کینوس کے ان خاکوں میں..........اس شخص کی نگاہ کی براقی اور اظہار کی بلاغت نے خصوصیت کے حصار میں عمومیت کی ایک عجیب وسعت اور کشادگی پیدا کر دی ہے۔ اس نے پیڑ گنوانے سے نہیں بیر کھلانے سے سروکار رکھا مگر بیر کچھ اس طرح سینت سینت کر کھلائے کہ قاری کی نظر پیڑ کی جڑ تک جا پہنچتی ہے۔ مجھے اکبر حمیدی کے خاکے کچھ اپنے محترم حکیم محمد سعید صاحب کی طرح لگے کہ وہ گورنر تھے مگر گورنر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، جناب مظفر علی سید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، عذرا اصغر، جناب منشا یاد، ڈاکٹر رشید امجد اور انہی کی طرح کی دوسری نامور شخصیتوں کے خاکوں کو پڑھوا لینا کچھ مشکل نہیں کہ کم لوگ ان کو خود ان کی ''بھاپ'' پر پڑھ جاتے ہیں لیکن اکبر حمیدی نے جس گرفت کے ساتھ اپنے قارئین کو اپنے بزرگانِ خاندان کے ساتھ پڑھوا لیا ہے اس کمال کی جتنی داد دی جائے کم ہوگی۔ اس حصے کو انہوں نے اس قدر جاذبِ توجہ بنا دیا ہے کہ اب نہ صرف اکبر حمیدی پر خاکہ لکھنا آسان ہو گیا ہے بلکہ ان کے خاندان میں رشتے ناطے کی بات طے کرنی بھی سہل معلوم ہوتی ہے۔ تفنن برطرف کتاب کے اس حصے میں اکبر حمیدی نے پنجاب کے دیہات کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کشی کی ہے۔ میرے اہلِ وطن کی موجودہ نسل اس کو غور سے پڑھ لے کہ کچھ عرصہ بعد یہ زمین شاید اس زندگی سے محروم ہو جائے۔ (**سید ضمیر جعفری** کے مضمون **''چند قدم۔۔۔ قدِ آدم کے ساتھ''** سے اقتباس)

ڈاکٹر انجم ضیاءالدین تاجی کھام گانو (انڈیا)

سہراب سپہری، عارف جدید ایران

سہراب سپہری سعدی شیرازی کی طرح جہاں دیدہ شاعر ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ سعدی حکیم و دانا، انسان دوست عارف و مصلح ہیں اور سہراب ان کے برعکس ایک دکھی آتما، مرگ اندیش اور سماج بیزار عارف ہیں۔ سپہری کی دنیا ابنائے نوع کی بجائے نباتات، حشرات، جمادات کی دنیا ہے، انھوں نے اپنی زندگی میں ایران کے تین سیاسی انقلابات دیکھے، مگر وہ ان کے متعلق یکسر خاموش رہے اور شبدر، گل و سنگ، سمنو اور سوسن کی بات کرتے رہے۔ ان کی ہر نظم ایک مختصر انی میشن کی مانند ہے۔

حیات اور تعلیم و تربیت

سہراب سپہری کا وطن کاشان تھا۔ ان کے دادا نصر اللہ خان سپہری ٹیلی گراف آفس میں افسر تھے۔ ان کے بعد یہی ملازمت ان کے والد اسد اللہ خان سپہری کو بھی حاصل ہوگئی۔ ان کی والدہ فروغ سپہری، میرزا محمد تقی سپہر کی بیٹی تھیں۔ میرزا تقی سپہر نے ناصر الدین شاہ قاچار کے حکم پر ناسخ التواریخ لکھی۔ سہراب کی نانی حمیدہ سپہری شاعرہ تھیں اور ان کا کلام قاچاری دور میں شائع ہوا۔

سہراب ۱۵ر مہر ۱۳۰۷ھ/ ۷ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو کاشان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم کی غرض سے تہران گئے۔ یہاں انھوں نے پہلے ٹیچرس ٹریننگ کا دو سالہ کورس کیا اور وطن واپس لوٹے، جہاں انھیں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ سہراب نے ۱۹۴۸ء میں ملازمت سے استعفیٰ دیا اور تہران آ کر فائن آرٹس کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۳ء میں وہ گریجویٹ ہوگئے اور وزارت صحت میں انھیں ڈزائینر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی عالمی نمائشوں میں اپنے ملک کی نمایندگی بھی کی۔ سپہری نے ۱۹۶۲ء میں سفر جاپان سے واپسی کے بعد سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، تاکہ ادب اور مصوری کی خدمت انجام دے سکیں۔

جنوری ۱۹۷۹ء میں جب ایران میں اسلامی انقلاب آیا، وہ سرطان الدم میں مبتلا ہوگئے اور اسی مرض کے باعث ۲۱ر فروری ۱۹۸۰ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اخلاق وعادات

سہراب سپہری نے تجرد کی زندگی گزاری، وہ بڑے شرمیلے اور عزلت پسند تھے۔ان کے شرمیلے پن کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی ہی تصاویر کی نمایشوں کی کسی افتتاحیہ تقریب میں شریک نہیں ہوئے۔انھوں نے کبھی کسی اخبار یا مجلّے کو انٹرویو نہیں دیا۔وہ بس ایک شاعر اور مصور تھے اور اپنی مخصوص دنیا میں مگن تھے۔صنف نازک کے ساتھ ان کا کیا تعلق رہا، بتانا مشکل ہے،مگر ایک پراسرار خاتون کے متعلق ان کی چند نظموں میں اشارے ملتے ہیں۔

سہراب مزاجاً نہایت خلیق ومہربان تھے۔وہ اپنے اعزا واقربا کا خیال رکھتے اور دوستوں کی خاطر تواضع کرتے تھے۔عام لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔سہراب کو مناظر فطرت اور کائنات کی ہر مخلوق سے عشق تھا۔وہ کسی چیز کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ان کے بھانجے جعفر کے بقول ''دوران سیر وتفریح وہ کانٹوں، حشرات اور پیڑ پودوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے تھے۔وہ پتھر جمع کرتے تھے،انھوں بڑے عجیب وغریب پتھر تلاش کیے تھے،وہ تمام مظاہر طبیعت سے عشق کرتے تھے۔''[1] سہراب کا یہی عشق تھا،جس کے باعث انھیں نیویارک سخت ناپسند آیا، کیوں کہ وہاں آسمان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

سہراب کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت زا پہلو یہ ہے کہ وہ سیاسی ہی نہیں سماجی معاملات سے ہمیشہ گریزاں رہے۔وہ ہمیشہ صرف اس ایک سوال کا جواب ڈھونڈتے رہے کہ ''مرگ چیست؟''۔ان سے پہلے ایرانی ادیب صادق ہدایت بھی اسی قسم کی فلسفیانہ بھول بھلیوں میں گرفتار رہا۔یہی معاملہ سہراب کے پیشوا نیما یوشیج کا بھی تھا۔وہ گوتم بدھ سے ارادت رکھتے تھے اور ذن اور مراقبہ کو نجات کا ذریعہ باور کرتے تھے۔اسی فکر کا اثر سہراب پر بھی ہوا اور انھوں نے ہندوستان کا سفر صرف اس لیے کیا کہ وہ اس مقام کی زیارت کریں جہاں گوتم بدھ کو نروان حاصل ہوا تھا۔

مطالعہ

ایرانی شعرا اور ادبا کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ انھیں مطالعے کا بڑا شوق رہا ہے۔اسی خوبی سے سہراب بھی متصف تھے۔انھوں نے ایام جوانی ہی میں اپنے بھائی منوچہر سپہری کے کتب خانے کی تمام نو ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ان میں قرآن مجید اور اسلامی کتب کے علاوہ بعض دیگر مذاہب کی کتب اور صوفیہ اور فلاسفہ کی تالیفات بھی شامل تھیں۔بدھ مذہب سے ان کی واقفیت جوانی ہی میں ہو گئی تھی۔انھوں نے ماہیانہ فرقے کے مراقبت (دھیان) کے متعلق مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہوئے۔

سہراب کا ایک کتابچہ ''اطاق آبی'' ہے۔اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ ہندو اور بدھ ثقافت سے کس درجہ متاثر تھے۔تعمیر مکان کے متعلق ہندو ثقافت میں ایک مخصوص علم ہے، جسے وستو شاستر (علم تعمیر architecture) کہا

جاتا ہے۔اس کی روشنی میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے بدھ مت میں لوک پالوں[2] کی ساخت کو اس کی اصل شکل میں دیکھا۔آبی رنگ جنوب میں تھا۔اور ہمارے گھر کا اطاق آبی (نیلا کمرہ) بھی جنوب میں ہے۔میں نے ایک جگہ ہندو مت میں اور ایک جگہ بدھ مت میں سفید رنگ کو شمال میں دیکھا۔ہمارے گھر کا شمال میں واقع پنجدری کمرہ بھی سفید ہے۔کس قدر عجیب اور دل پذیر مشابہت ہے کہ ہمارا گھر بھی جہان خورد کا نمونہ ہے۔''[3]

سہراب کی ہندو مت اور بدھ مت سے دلچسپی کے اور بھی کچھ شواہد اس کتابچے میں ہیں۔مثلاً انھیں سانپوں سے بچنے کا اتھر وید کا ایک منتر یاد تھا،اس لیے وہ یقین کرتے تھے کہ مجھے سانپ کبھی نہیں ڈس سکتا یا میں اس کے زہر سے نہیں مر سکتا۔[4] اسی طرح انھوں نے لکھا کہ ''میرے چچا اس بات سے ناواقف ہیں کہ جنوبی ہند کے باشندے کے لیے جفتی کرتے سانپوں کا دیدار کس قدر معنی خیز ہے،وہ ہاتھ جوڑ کر اور دوزانو ہو کر دعا کرتا ہے۔[5]

سہراب نے دراوڑوں کے متعلق لکھا کہ وہ بانجھ عورت کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ اس نے گذشتہ جنم میں کسی ناگ کو ہلاک کیا ہوگا۔علاوہ ازیں وہ اپنی والدہ کو شوہر کے تئیں وفاداری میں ''رینوکا'' سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری والدہ پاکباز تھیں اور ہمیشہ پاکباز رہیں۔وہ رینوکا کی مانند اپنے ہاتھ سے شوہر کے لیے پانی لا سکتی تھیں''[6]

سہراب نے فارسی کے تمام اکابر شعرا کے دواوین کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ان کی بہن پریدخت سپہری کے بقول ''وہ مولوی کو تاریخ شرق کا بزرگ ترین شاعر اور صوفی تسلیم کرتے تھے اور دیوان شمس کے پرجوش اشعار کے والہ وشیفتہ تھے۔نیز غزلیات حافظ کی ستایش وتحسین کرتے تھے۔''[7] وہ مغربی شعرا میں لامارٹن، گوئٹے، امیل زولا (Émile Zola)، شاتو بریان (Chateaubriand) اور ہوگو جیسے رومانی شعرا کا کلام پسند کرتے تھے۔

مصوری

سہراب سپہری کو بچپن ہی سے مصوری کا شوق تھا۔انھیں درجہ اول کے معلم نے اس شوق کی وجہ سے سزا بھی دی تھی۔وہ کوئلے سے تصویریں بنا کر گھر کی دیواروں کو سیاہ کر دیتے تھے۔ہائی اسکول کے زمانے میں انھیں مصوری کا وقفہ ہفتے بھر کی ظلمت میں نور کا ایک نقطہ نظر آتا تھا۔

سہراب نوجوانی کے زمانے میں اپنا بیشتر وقت مصوری میں گزارتے،مگر ان کی تصاویر فنکاری سے عاری تھیں۔وہ قدرتی مناظر کی تصویر کشی کرتے تھے۔۱۹۴۸ء میں ان کی ملاقات منوچہر شیبانی سے ہوئی۔منوچہر

بڑے پایے کے مصور تھے، ان کی صحبت سے سہراب کی مصوری میں نکھار آیا۔ بعد از آں انھوں نے فائن آرٹس میں داخلہ لیا۔ مگر ان کی مصوری فنی ندرت سے خالی رہی۔ مگر انھیں ملکی اور بین الاقوامی نمایشوں میں ایران کی نمایندگی کا موقع ملا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس زمانے میں سہراب نے مصوری کا آغاز کیا، ایران میں شعرا تو بہت تھے، مگر مصور بہت کم تھے، اس لیے اوسط درجے کا مصور بھی اہل ذوق کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا تھا۔

شاعری

سہراب سپہری نے سترہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز روایتی اصناف سخن سے کیا۔ اس دور میں مشفق کاشانی ان کے استاد تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''در کنار چمن یا آرامگاہ عشق'' ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس وقت سہراب صرف انیس سال کے تھے۔ اس میں اسی عنوان سے ایک حزنیہ مثنوی ہے، جو ۴۱۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے ''بیژن اور شہلا'' کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ اس کی زبان نرم و رواں اور اس دور کے شعرا کے بالمقابل انداز بیان پاکیزہ ہے۔

اس مجموعے کے دستیاب اشعار سے پتا چلتا ہے کہ سہراب میں روایتی اصناف میں شعر کہنے کی زبردست صلاحیت تھی، اگر وہ اسے اختیار کیے رہتے، تو اس میں بھی اپنا مقام بنا لیتے۔ اس مجموعے میں کچھ غزلیں بھی شامل تھیں، مگر اسے انھوں نے اپنی کلیات میں شامل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنا روایتی اصناف سخن میں لکھا باقی کلام نذر آتش کر دیا۔

سہراب نے تہران میں بابائے شعر نو نیما یوشیجکی صحبت پائی، اس وقت تہران میں احمد شاملو، مہدی اخوان ثالث اور فروغ فرخزاد کا طوطی بول رہا تھا۔ ان سے بھی سہراب کی دوستی ہوگئی۔ اس صحبت کا اثر ہوا کہ انھوں نے روایتی اصناف سخن کو ترک کر کے نیما کی پیروی اختیار کر لی۔ طرز نیما کے علاوہ انھوں نے انگریزی شعرا میں ٹی. ایس. ایلیٹ اور عزرا پاؤنڈ کی آزاد نظموں کی پیروی بھی کی۔ [9] ان کی اس شعری زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دور اول میں پہلے چار مجموعے یعنی مرگ رنگ، زندگی خوابہا، آوار آفتاب اور شرق اندوہ منظر عام پر آئے اور دور دوم میں باقی چار مجموعے یعنی صدائے پائے آب، مسافر، حجم سبز اور ماہیچ ما نگاہ شائع ہوئے۔ ان آٹھوں مجموعوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سہراب ایک ایسے شاعر تھے، جو فکری سفر میں مسلسل محور ہے۔ ان کی فکر کا اتمام ان کے ساتویں مجموعے ''حجم سبز'' پر ہو جاتا ہے۔

سہراب کا شعر نو کا پہلا مجموعہ ''مرگ رنگ'' ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ یہ بائیس منظومات پر مشتمل ہے۔ اس کی زیادہ تر نظمیں شعر نیمائی میں ہیں۔ کچھ چہار لختیاں ہیں۔ اس مجموعے کی منظومات سے ان کے دل میں موجود خوف و ہراس سے آگاہی ہوتی ہے۔ وہ اسرار حیات کے جویا تھے، مگر انھیں ان اسرار پر دبیز پردہ نظر آ رہا

تھا، اس لیے ان کا دل خوف و اندیشوں سے بھر گیا تھا۔ وہ نظم ''قیر شب'' میں کہتے ہیں:

رخنہ ای نیست در این تاریکی/ در و دیوار بہم پیوستہ است/ سایہ لغزد اگر روی زمین/ نقش وہمی است ز بندی رستہ/ نقش آدمہا/ سر بہ سر افسردہ است/

روزگاری است در این گوشہ پژمردہ ہوا/ ہر نشاطی مردہ است [9]

ایک رخنہ بھی نہیں، اس تاریکی میں/ در و دیوار بہم پیوستہ ہیں/ گر لرزتا ہے زمیں پر سایہ/ نقش وہمی ہے کہ جو قید سے آزاد ہوا/ نقش انسانوں کے/

ہیں سر بہ سر افسردہ یہاں/ اک زمانہ ہوا، اس مرجھائی فضا میں مجھ کو/ ہر خوشی ہے مردہ

سہراب کا دوسرا مجموعہ ''زندگی خوابہا'' ۱۹۵۴ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ اس کی منظومات کے متعلق بعض ناقدین کی رائے ہے کہ یہ شعر سپید (White Verse) ہیں۔ یہ صنف اردو کی نثری نظم کے مشابہ ہے۔ فارسی میں اس کا آغاز احمد شاملو نے کیا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وزن عروضی کی رعایت نہیں کی جاتی، مگر موسیقی اور لے ہوتی ہے۔ محمدی ہاشم کی رائے میں ''زندگی خوابہا'' کی نظمیں نہ تو شعر نیمائی ہیں اور نہ ہی نثر مسجع یا مرسل، بلکہ ان کے دونوں کے درمیان کی کوئی چیز ہیں۔'' اس مجموعے کی پہلی نظم ''خواب تلخ'' ہے۔

مرغ مہتاب/ می خواند	مرغ مہتاب گنگناتا ہے
ابری در اتاقم می گرید!	میرے کمرے میں ابر روتا ہے
گل ہای چشم پشیمانی می شکفد	میری آنکھوں کا پھول گلشن میں
	شرم کے ساتھ کھلتا جاتا ہے
در تابوت پنجرہ ام پیکر مشرق می لولد	اور کھڑکی کے بند بکسے میں
	پیکر شرق جلوہ فرما ہے
مغرب جان می کند،	ہچکیوں پر ہے آ گیا مغرب
می میرد.	اس پہ حالت نزع کی طاری ہے
گیاہ نارنجی خورشید	اور سورج گیاہ نارنجی
در مرداب اتاقم می روید کم کم	میرے کمرے کی جھیل کے اندر
	دھیرے دھیرے اگاتا جاتا ہے
بیدارم	میں ہوں بیدار اپنے بستر پر
نپندار یم در خواب	مجھ کو سویا گماں کرو نہ تم
سایۂ شاخہ ای بشکستہ	ایک ٹوٹی سی شاخ کا سایہ

آہستہ خوابم کرد	(لوری گا کے) مجھے سلاتا تھا
اکنون دارم می‌شنوم	مرغ مہتاب کا مدھر آہنگ
آہنگ مرغ مہتاب	اپنے کانوں میں اب بھی سنتا ہوں
وگل ہای چشم پشیمانی را پرپر می کنم۔[10]	شرمسار آنکھ کے ہر ایک گل کو
	پنکھڑی پنکھڑی میں کرتا ہوں

مرگ رنگ کے مقابلے میں اس مجموعے میں شاعر کے خوف و ہراس میں کمی واقع ہوئی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ اسے مغرب کے کھوکھلے پن اور مشرق کی ٹھوس حقانیت کا علم ہوگیا ہے۔مگر ابھی وہ فکری لحاظ سے پختہ نہیں ہوا۔اس لیے وہ تنہا اپنے تخیل کے پیچھے دوڑتا نظر آتا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرلے۔اس مقصد کے لیے اسے جس راہ پر چلنا چاہیے تھا، وہ اس سے آگاہ نہیں ہے،اس لیے عاجز ہوکر کہتا ہے۔

و من ویران شدم/ پردہ نفس می کشید/ دیوار قیر اندود/ از میان برخیز/ پایان تلخ صداہای ہوش ربا/ فرو ریز/ تا دوزخ ھا بشکافند/ سایہ ھا بی پایان شوند/ تا نگاہم رہا گردد/ درہم شکن بی جنبشی ات را/ واز مرز ہستی من بگذر/ سیاہ سرد بی تپش گنگ[11]

اور میں اجڑ گیا/ پردہ سانس لیتا تھا/ تارکول چڑھی دیوار/ بیچ میں سے ہٹ جا/ تلخ اور ہوش ربا صداؤں کے سرے/ نیچے اتر/ تاکہ دوزخ کو پھاڑ دیں/ سائے بے سرے ہوجائیں/ تاکہ میری نظر رہا ہوجائے/ تو اپنے جمود کو توڑ دے/ اور میری ہستی کی کھیتی سے گزر جا/ سیاہ سرد بے حرارت گونگے

سہراب نے ۱۹۵۵ء میں چند جاپانی ہائکوؤں کا ترجمہ کیا۔یہ نظمیں مجلّہ ''سخن'' کی زینت بنیں۔اسی سال چند فرانسیسی نظموں کو بھی فارسی قالب پہنایا۔علاوہ ازایں انھوں نے چینی زبان کی بھی چند نظموں کا ترجمہ کیا۔وہ رگ وید کا بھی منظوم ترجمہ کرنا چاہتے تھے،مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔

سہراب نے اپنی منظومات کا تیسرا مجموعہ ''آوار آفتاب'' ۱۹۵۸ء میں مرتب کرلیا تھا،مگر یہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔یہ بتیس نظموں پر مشتمل ہے۔انھوں نے اس میں مقدمہ بھی شامل کیا تھا،مگر اسے بعد میں حذف کردیا۔سہراب نے مقدمے میں مختلف مذہبی پیشواؤں اور فلسفیوں کے اقتباسات دیے۔اس سے ان کی تحول پذیر فکر کا انداز لگایا جاسکتا ہے۔سپہری نے ''زندگی خوابہا'' میں شعر نیمائی کو ترک کردیا تھا،مگر اس مجموعے کی اکثر نظمیں نیمائی ہیں اور ایک مخصوص وزن میں ہیں۔دیگر منظومات میں کچھ نثری نظمیں ہیں،کچھ چہار لختیاں ہیں۔اس مجموعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اب عرفان وتصوف کی راہ پر گامزن ہے۔

سہراب کی منظومات کا چوتھا مجموعہ ''شرق اندوہ'' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔اس میں ان کی پچیس نظمیں ہیں اور سب ایک ہی وزن میں ہیں، نیز زیادہ تر مقفّٰی ہیں۔جس زمانے میں سہراب نے یہ نظمیں لکھیں،وہ اس وقت دیوان شمس کے مطالعے میں مستغرق تھے۔اس لیے اکثر مقامات پر اس میں دیوان شمس کی گونج سنائی دیتی ہے۔مگر نظریاتی طور پر سہراب مولوی رومی سے زیادہ گوتم بدھ کے نزدیک نظر آتے ہیں۔اس کی منظومات میں ''شکپوی''،''شورم را'' اور ''بودھی'' کی بنیاد بدھی فلسفہ ہے۔

بدھی (Bodhi) کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

آنی بود،درھا واشدہ بود/ برگی نہ،شاخی نہ،باغ فنا پیدا شدہ بود/ مرغان مکان خاموش،این خاموش، آن خاموش،خاموشی گویا شدہ بود۔

آن پہنہ چہ بود: بامیشی،گرگی ہمپا شدہ بود/نقش صدا کم رنگ،نقش ندا کم رنگ، پردہ مگر تا شدہ بود؟/ من رفتہ،او رفتہ،مای ما شدہ بود۔

زیبایی تنہا شدہ بود/ ہر رودی،دریا/ ہر بودی،''بودا'' شدہ بود۔[12]

وقت وہ عجیب تھا،در کھلے ہوئے تھے سب/ پتا اور نہ کوئی شاخ،ظاہر ہوا فنا کا باغ/ مرغ مکاں خموش تھا،یہ بھی تھا چپ،وہ بھی تھا چپ،خاموشی گویا ہوگئی۔

کتنی عجیب تھی وہ جا،بھیڑ بھیڑیے کے پاس،کھڑی تھی خوف کے بنا/شکل صدا کی زرد تھی،صدائے شکل میں دم نہ تھا،پردہ اٹھا ہوا تھا کیا؟

میں بھی گیا،وہ بھی گیا،ہم ''بے ہم'' ہوگئے/حسن تنہا رہ گیا/ دریا بحر بن گیا/ وجود ہر ایک ''بدھ'' بنا۔

سہراب سپہری کی ایک طویل نظم ''صدای پای آب'' ۱۹۶۵ء میں مجلّہ ''آرش'' میں شائع ہوئی۔اسی نظم سے ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے ان کی شناخت ہوئی۔اس کے مصرعے بحر رمل میں ہیں،مگر شاعر نے اس بحر کا استعمال اپنی پسند کے مطابق کیا۔اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق فطرت سے تھا اور وہ ہر شے میں،خواہ وہ حقیر و قبیح ہی کیوں نہ ہو،حسن و جمال کا نظارہ کرتے تھے۔سہراب میں فطرت پسندی سے زیادہ فطرت پرستی کا یہ عنصر بدھی فلسفے کے اثرات کا نتیجہ تھا۔بدھی فلسفے تک ان کی رسائی جاپان کے عرفان فطرت (nature Mysticism) کے وسیلے سے ہوئی تھی۔''صدای پای آب'' سے ان کی اس فکر کا اظہار ہوتا ہے۔اس کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیے:

اہل کاشانم	کاشان کا رہنے والا ہوں
روزگارم بد نیست	حالات مرے ہیں بہتر
تکہ نانی دارم،خردہ ہوشی،سر سوزن ذوقی	مجھ کو ہے میسر نان سکوں
	جیتا ہوں جسے میں بس کھا کر

	تھوڑی سی ذہانت رکھتا ہوں
	اور ذوق ہنر بھی شمہ بھر
مادری دارم بہتر از برگ درخت	اور ماں ہے مجھ پر سایہ فگن
	محروم ہیں جس سے برگ و بر
دوستانی، بہتر از آب روان	ہیں یار میرے جتنے بھی یہاں
	سب آب رواں سے ہیں بہتر
وخدایی کہ در این نزدیکی است؛	اور ایک خدا کی نزدیکی
	محسوس میں کرتا ہوں اکثر
لای این شبوھا، پای آن کاج بلند.	ان پھولوں میں جن پر کہ ہے
	اس اونچے صنوبر کی چھتر
روی آگاہی آب، روی قانون گیاہ	دستور میں پیڑوں پودوں کے
	اور آب رواں کے عرفاں پر
من مسلمانم	اور میں ہوں مسلماں قبلہ مرا
قبلہ ام یک گل سرخ	صحرا کا سرخ حسیں لالہ
جانمازم چشمہ، مہرم نور	مسجد ہے مری اک چشمہ آب
	ہے مہر مری نوری ہالہ
	(ان کے علاوہ سن لو تم)
دشت سجادۂ من	ہر کھیت مصلاّ ہے میرا
من وضو با تپش پنجرہ ھامی گیرم.	کرتا ہوں وضو اس پانی سے
	کھڑکی کے پٹوں سے جو گرتا
در نمازم جریان دارد ماہ، جریان دارد طیف.	قوس قزح اور گردش مہ
	ہیں میری نمازوں کے سورے
سنگ از پشت نمازم پیداست.	چٹان ہر ایک اس جنگل کی
	ہوتی ہے کھڑی میرے پیچھے
ہمہ ذرات نمازم متبلور شدہ است.	روشن ہیں بہت تابندہ ہیں

	یہ میری نمازوں کے ذرّے
من نمازم را وقتی می خوانم	کرتا ہوں نماز اس وقت ادا
کہ اذانش را باد، گفتہ باشد سر گلدستۂ سرو	دیتی ہے اذاں جب باد صبا
	ہے ماذنہ سرو کا گلدستہ
من نمازم را پی ''تکبیرۃ الاحرام'' علف می خوانم.	تکبیر کا ذمہ دار علف
پی ''قد قامت'' موج.	اور باندھ کے میں ہوتا ہوں کھڑا
	ہر موج بلند کے پیچھے صف
کعبہ ام بر لب آب،	پانی کے کنارے کعبہ مرا
کعبہ ام زیر اقاقی ہاست.	اور کعبہ ببولوں کے نیچے
کعبہ ام مثل نسیم، می رود باغ بہ باغ، میرود شہر بہ شہر.	ہر دم ہے رواں وہ مثل صبا
	ہر باغ میں اور ہر قریے میں
''حجر الاسود'' من، روشنی باغچہ است۔[13]	اور حجر اسود میرے لیے
	اک روشنی ہے، بس باغوں کی

اس بات کا اعتراف سہراب کرتے ہیں کہ ان کا وطن کاشان ہے، مگر وہ دوسری طرف اس بات کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ

اہل کاشانم اما/شہر من کاشان نیست/شہر من گمشدہ است۔[14]:

کاشان کا رہنے والا ہوں پر شہر مرا کاشان نہیں ہے شہر مرا کھویا ہوا

ڈاکٹر عباس احمدی سہراب سپہری کی اس فکر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سپہری کا یہ کاشان گمشدہ مولوی کے نیستان گمشدہ کے مشابہ ہے۔ وہی نیستان، جو ''نے'' (روح بشر) کا اصلی وطن ہے۔ یہی نکتہ حافظ شیرازی کے یہاں ''باغ ملکوت'' کی شکل میں ہے۔ خواہ نام کوئی رکھ لیں، یہ وہ مقام ہے، جس میں انسان حالت فراق میں ہے اور ہر انسان کی آرزو صرف اور صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کی طرف مراجعت کرے، گویا یہ انسان کا ''شہر آرزو'' ہے۔[15] اسی کی تلاش میں سہراب سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ اور نظم کے آخر میں کہتے ہیں:

کار ما شاید این است/ کہ میان گل نیلوفر و قرن/ پی آواز حقیقت بدویم.[۱۶]

ہے کام ہمارا ہم دوڑیں بس بیچ میں پھولوں پر بت کے آواز حقیقت کے پیچھے

اسی حقیقت کی تلاش پر مبنی ان کی دوسری طویل نظم ''مسافر'' ہے، جو ۱۹۶۶ء میں مجلّہ ''آرش'' کی زینت بنی۔ یہ ایک بے حد خوبصورت نظم ہے۔ اس میں انھوں نے نیما یوشیج کا تتبع کیا اور یہ بحر مجتث (مفاعلن ،فعلاتن......) میں ہے۔ اس میں شاعر نے ہندوستانی تلمیحوں کو استعمال کیا، اس لیے بعض ناقدین کی نظر میں یہ عنصر اس کی غیر مقبولیت کا سبب بنا۔

مسافر ایک علامت ہے، جو ہر اس چیز کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے، جو کسی مرحلے پر قیام نہیں کرتی۔ مسافر نہر کے تازہ و شفاف پانی کی مانند رواں رہتا ہے۔ اس نظم سے ہمیں ان صوفیہ کی یاد آتی ہے، جو حقیقت کی تلاش میں اہل دل اور اہل عقل و دانش کے پاس پہنچے تا کہ حقیقت تک پہنچ سکیں۔ اس نظم میں سہراب نے بعض امور کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی۔ مسافر سفر کرتے ہوئے ایک جگہ قیام کرتا ہے۔ میزبان اس سے سوالات کرتا ہے اور وہ بڑے دلکش جوابات دیتا ہے۔ مثلاً خوبصورتی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ''قشنگ یعنی تعبیر عاشقانۂ اشکال''۔[۱۷] وہ اپنے غم کا سبب یہ بیان کرتا ہے:

وغم تبسم پوشیدۂ نگاہ گیاہ است/ وغم اشارہ محوی بہ رد وحدت اشیاست[۱۸]

مجھے رنج ہے کہ چشم شجر، ہے محروم خندۂ بشر/ ہے غم کہ وحدت خلق کی، تردید میں پیش کرتے ہیں، ہر دلیل مردہ سی

میزباں کہتا ہے کہ کس قدر خوش نصیب ہیں نباتات کہ وہ عاشق نور ہیں۔ اس پر مسافر کہتا ہے کہ

نہ وصل ممکن نیست/ ہمیشہ فاصلہ ای است[۱۹]

نہیں وصل کا امکاں ذرا، (نور اور نباتات میں) / رہے گا ان میں فاصلہ، ہے جیسا دن اور رات میں

یعنی اگرچہ وہ عاشق نور ہیں، مگر ان کے اور نور کے درمیان وصال ممکن نہیں ہے، ہمیشہ ایک فاصلہ قائم رہے گا۔ یہ ٹھیک وہی تصور ہے، جو وحدت الشہود کے حامل صوفیہ کے یہاں پایا جاتا ہے کہ خدا اور مخلوق میں اب وصال کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اسی ابدی فراق کی وجہ سے مولوی رومی کی ''نے'' ہمیشہ افسردہ اور غمگین آواز نکالتی ہے۔

سہراب سپہری نے اس نظم میں اپنے مختلف اسفار کا ذکر کیا ہے۔ ان کے لیے روحانی لحاظ سے وہ سفر نہایت اہمیت کا حامل ہے، جب وہ بین النہرین (دجلہ و فرات کے درمیان کا علاقہ)، بابل اور یروشلم گئے اور پھر ہندوستان، تبت اور کوہ ہمالیہ کی سیاحت کی۔ انھوں نے سفر ہند کے تذکرے میں کئی اساطیری اشارے کیے

ہیں، مثلاً ''بانیان'' سے گوتم بدھ کے نروان کی طرف اشارہ ہے:

سفر مرا بہ زمین ھای استوایی برد/ و زیر سایۂ آن ''بانیان'' سبز تنومند/ چہ خوب یادم ہست/ عبارتی کہ ییلاق ذہن وارد شد:/ وسیع باش وتنہا، و سر بہ زیر، وسخت.[۲۰]

میں پہنچا، کرتا ہوا سفر، منطقہ حارہ میں/ زیر سایہ میں رہا، اس ہرے برگد کے پیڑ کے/ یہ عبارت ہو گئی ،ذہن میں داخل وہاں/ رہو کشادہ دل، عزلت گزیں، منکسر اور سخت

سہراب سفر ہند کے دوران تاج محل اور شہر بنارس بھی گئے۔ اس سفر کا اختتام ایک عورت سے ملاقات پر ہوتا ہے۔ نظم کا یہ حصہ ابہام کا حامل ہے۔ اس میں شاعر نے رمز و استعارے کا استعمال کیا ہے، تاہم یہ نہایت دلکش ہے:

من از کنار تغزل عبور می کردم/ و موسم برکت بود/ و زیر پای من ارقام شن لگد میشد/ زنی شنید،/ کنار پنجرہ آمد، نگاہ کرد بہ فصل/ در ابتدای خودش بود/

و دست بدوی از شبنم دقایق را/ بہ نرمی از تن احساس مرگ بر می چید/ من ایستادم/ و آفتاب تغزل بلند بود/ و من مواظب تبخیر خواب ھا بودم/

و ضربہ ھای گیاہی عجیب را بہ تن ذہن/ شمارہ می کردم:/ خیال می کردیم/ بدون حاشیہ ہستیم. خیال می کردیم/ میان متن اساطیری تشنج ریباس/ شناوریم/

و چند ثانیہ غفلت، حضور ہستی ماست/ در ابتدای خطیر گیاہ ھا بودیم/ کہ چشم زن بہ من افتاد: صدای پای تو آمد، خیال کردم باد/

عبور می کند از روی پردہ ھای قدیمی./ صدای پای تو در حوالی اشیا/ شنیدہ بودم[۲۱]

میں چل رہا تھا تغزل کے ساحل پر/ وہ تھا موسم برکت/ کنکریاں ٹھوکریں کھاتی تھیں پانو کے نیچے/ سنا عورت نے/ قریب کھڑکی کے آئی، فصل کو دیکھا/

عنفوان شباب اس پہ طاری تھا/ اٹھا رہی تھی وہ شبنم دست نازک سے/ کہ آ گیا میرے دل میں خیال مرگ سنو/ میں رک گیا فوراً/ بلند ہو گیا پھر آفتاب تغزل/

میں دیکھتا تھا خیالوں میں خواب کی تبخیر/ تن ذہن پہ کسی پیڑ کی ضربیں شمار کرتا تھا/ خیال کر رہے تھے ہم/ شاید بے حاشیہ ہیں ہم/ خیال کر رہے تھے ہم/

ریباس[۲۲] کے کپکپاتے اساطیری متن کے بیچ/ تیرتے ہیں/ ذرا سا تغافل ہماری ہستی کو/ بنا کے رکھ دے گا پودوں کی زیست کا خطرہ/

نظر اٹھا کے مجھے دیکھا اس پری وش نے اور کہا/ صدا تھی پا نو کی تیرے، اسے میں سمجھی ہوا/ ہلا رہی ہے جو قدیم پردوں کو/

صدا پا نو کی تیرے، چیزوں کے آس پاس/ میں سن چکی تھی

سہراب نے ۱۹۶۷ء میں اپنی نظموں کا ایک اور مجموعہ ''حجم سبز'' شائع کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ شاعر کی اسی طرح شناخت بن گیا، جس طرح احمد شاملو کی شناخت ''ہوای تازہ'' منوچہر آتشی کی ''آہنگ دیگر'' فروغ فرخزاد کی ''تولیدی دیگر'' اور یداللہ رویائی کی ''شعر ہای دریائی'' ہے۔

سہراب ابتدا میں ایک الم پرور شاعر تھے، وہ بتدریج نور تک پہنچے۔ وہاں سے ان کی رسائی ''حجم سبز'' تک ہوئی۔ محمدی ہاشم کے بقول ''یہ منظومات ملکوتی، محبت آفریں اور مہر انگیز ہیں اور بدھی تصوف کے افکار یعنی تمام اشیا میں زیبائی مطلق کے انکشاف اور انسان اور دیگر مخلوقات کے درمیان عشق و محبت کی وابستگی سے لبریز ہیں۔''[۲۳] علاوہ ازایں وہ عیسائیت اور زرتشتیت سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ نظم ''و پیامی در راہ'' ملاحظہ فرمائیے:

روزی/ خواہم آمد، و پیامی خواہم آورد./ در رگ ہا، نور خواہم ریخت./ وصدا خواہم در داد: ای سبد ہا تان پُر خواب! سیب آوردم، سیب سرخ خورشید./

خواہم آمد، گل یاسی بہ گدا خواہم داد./ زن زیبای جذامی را، گوشواری دیگر خواہم بخشید./ کور را خواہم گفت: چہ تماشا دارد باغ[۲۴]

ایک دن/ میں آؤں گا اور پیام لاؤں گا/ نور رگوں میں بھر دوں گا/

اور پکاروں گا: اے لوگو، جن کی ٹوکریاں ہیں خوابوں سے پر، میں نے لایا ہے اک سیب، سیب سرخ خورشید/ میں آؤں گا، اور گل یاسی گدا کو دوں گا/

خوبصورت جذامی عورت کو، دوسری بالیاں پہناؤں گا/ اور بتاؤں گا اندھے کو کہ باغ کا منظر کیسا ہے

اسی مجموعے کی ایک اہم نظم ''نشانی'' ہے، جو راہ سلوک کے مراحل پر مبنی ہے۔ سہراب بھی صوفیہ کی مانند حسن و عشق کے ذریعے خدا کا تقرب چاہتے تھے، مگر ان کا مجاز کائنات کی تمام مخلوقات پر محیط ہے۔ انھوں نے اس نظم میں حافظ کی مانند خدا کے لیے ''دوست'' کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ صبح سویرے سالک خانۂ دوست کی تلاش میں نکلتا ہے، لیکن خانۂ دوست کی تمام علامتیں اور نشانیاں مبہم ہیں، وہ ایک ''گل تنہا'' کی طرف پلٹتا ہے، گل تنہا بدھ مذہب کا ایک مخصوص اشارہ ہے۔ اس کے بعد وہ ایک بچے سے اپنے دوست کے گھر کا پتا پوچھتا ہے۔

''خانۂ دوست کجاست؟'' در فلق بود کہ پرسید سوار./ آسمان مکثی کرد./ رہگذر شاخۂ نوری کہ بہ لب

داشت بہ تاریکی شن ہا بخشید.

و بہ انگشت نشان داد سپیداری و گفت:/ ''نرسیدہ بہ درخت/ کوچہ باغی است کہ از خواب خدا سبز تر است/ و در آن عشق بہ اندازہ پر ہای صداقت آبی است./

می روی تا تہ آن کوچہ کہ از پشت بلوغ سر بہ در می آرد/ پس بہ سمت گل تنہایی می پیچی/ دو قدم ماندہ بہ گل/ پای فوارۂ جاوید اساطیر زمین می مانی و ترا ترسی شفاف فرا می گیرد/

در صمیمیت سیال فضا خش خشی می شنوی:/ کودکی می بینی/ رفتہ از کاج بلندی بالا جوجہ بردارد از لانہ نور/ و از او می پرسی/ خانہ دوست کجاست؟''[۲۵]

''دوست کا گھر ہے کہاں؟'' صبح کاذب کے سمے، پوچھتا تھا یہ سوار/ آسماں نے سیے لب/ راہ پر ایک طرف، شاخ پر نور تھی جو، خوب تاریکیوں کو، بخشتی تھی وہ ضیا/

پس سپیدار کی سمت، اس نے انگلی سے کیا، ایک اشارہ یہ کہا/ پاس اس پیڑ کے تو، کیا ابھی تک نہ گیا/ باغ ہے ایک وہاں، سبز تر اس سے نہیں، دیکھنا خواب خدا/

اس پہ ہے سایہ فگن، عشق لبریز ہے جو، نیلی سچائی سے وہ،/ جب تو پہنچے گا وہاں/ پائے گا ایک ہی گل/ گل سے دو چار قدم، دور ذرا بھر کو ٹھہر/

دور اسطور کا ہے، چشمہ خلد وہاں/ تجھ پہ چھا جائے اگر، سایۂ خوف عیاں/ سخت آواز سے جب، گونج اٹھے وہ خلا/ آئے گا تجھ کو نظر، طفل معصوم وہاں/

وہ صنوبر سے جہاں، لانۂ نور ہے اک، چوزہ لائے گا اٹھا/ اس سے دریافت کر/ دوست کا گھر ہے کہاں؟

اس مجموعے کی دیگر نظمیں بھی عارفانہ افکار کی حامل ہیں اور بے حد مقبول ہوئیں۔ سہراب کی منظومات کا آخری مجموعہ ''ما ہیچ ما نگاہ'' حجم سبز کے دس سال بعد شائع ہوا۔ اس دس سالہ وقفے میں انھوں نے صرف ۱۴ نظمیں لکھیں۔ اس کی زیادہ تر نظمیں منظومات سفید ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ سہراب کے فکری سفر کا اختتام ''حجم سبز'' پر ہو گیا اور ان کا ذہن اپنی اس فکر کو مزید ترقی دینے سے عاجز تھا۔ اس لیے متعدد ناقدین کی رائے میں یہ سہراب کا پست ترین مجموعہ ہے۔ اس لیے وہ اسے شائع نہ کرتے یا کم از کم اپنی کلیات کا حصہ نہ بناتے تو بہتر ہوتا۔

کچھ ناقدین کی رائے میں سہراب پر اس آخری دور میں surrealism کا اثر ہو گیا تھا۔ یہ ایک ثقافتی تحریک تھی، جس کا آغاز ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا اور اس کا سب سے بڑا مرکز پیرس تھا۔ جنگ عظیم اول اور Dadaism اس فکر کے محرکات تھے۔ اس تحریک نے نہایت قلیل مدت میں ادب، مصوری اور فلم کو متاثر کیا۔ اس فکر کے پیروؤں کی

رائے ہے کہ کوشش ارادی کو ترک کر دینا چاہیے، یعنی بے ارادہ جو کچھ ہوتا ہے، اسے قبول کرنا چاہیے۔ اس کا ایک اصول ''automatic writing'' تھا، جسے سہراب ''نوشتۂ خود کار'' کہا کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ہوا خواہوں نے نوشتۂ خود کار رچا یا شاعری کی تخریب کے ساتھ۔ جو کچھ ظاہر ہوا، محض ایک تجربہ ہے۔''

حقیقت بھی یہی ہے کہ ان منظومات میں شاعر نے اکثر بے معنی اور بے ربط الفاظ لکھ دیے ہیں۔ کہیں کوئی عبارت با معنی نکل آئی تو اس کا کوئی معنوی تعلق اگلی عبارت سے نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے شاعر پر حالت جذب طاری ہے اور وہ مجذوبوں کی مانند کچھ مبہم الفاظ منہ سے نکال رہا ہے، اب ارادت مندوں کا کام ہے کہ وہ اپنی فکر اور اپنے مزاج کے مطابق ان سے معانی و مطالب اخذ کریں۔

مختصر یہ کہ سہراب جدید دور کا وہ شاعر ہے، جس نے انسان کی اس قدیم فکر کو یعنی ''راز آفرینش سے آگاہی حاصل کرے'' اختیار کیا۔ یہ فکر ممکن ہے، ان کے ذہن بچپن اور نوجوانی کے عمیق مطالعے کا نتیجہ ہو۔ اس نے اس حوالے سے قدیم و جدید تمام مذہبی پیشواؤں اور فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا اور جو کچھ سمجھا اسے ابنائے نوع کے سامنے پیش کر دیا۔ اس طرح فارسی شاعری میں موجود متصوفانہ خیالات کا ایک نئے انداز میں احیا ہوا۔

☆☆☆☆☆

حواشی:

۱۔ مجلّہ ''پروین'' انٹرویو با پسران خواہر سہراب، آبان ۱۳۸۱، شمارہ ۹، ص ۴

۲۔ بدھ مذہب کی کتابوں میں چار لوک پالوں کا ذکر ہے، یعنی مشرق، مغرب، شمال اور جنوب

۳۔۶: اطاق آبی، انٹرنیٹ سے ڈاؤنلوڈ کی گئی pdf فائل سے

۷۔ سہراب سپہری، پر یدخت، ص ۸، انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈیڈ

۸۔ The expanse of Green:Poems of Sohrab Sepehri, David L. Martin,p.vii,

۹۔ سہراب سپہری، مجموعہ سرودہ ھا، ص ۱۹۔۲۰، نشر شادان تہران

۱۰۔ ہمان، ص ۶۷۔۶۸ ۱۱۔ ہمان، ص ۷۷۔۷۸

۱۲۔ ہمان، ص ۱۹۰ ۱۳۔ ہمان، ص ۲۰۱۔۲۰۹

۱۴۔ ہمان، ص ۲۱۹ ۱۵۔ انٹرنیٹ سے، Persianblog.ir

۱۶۔ مجموعہ سرود ھا، ص ۲۲۹ ۱۷۔ ہمان، ص ۲۳۵

۱۸۔۱۹۔ ہمان، ص ۲۳۶ ۲۰۔ ہمان، ص ۲۴۵

۲۱۔ ہمان، ص ۲۴۹۔۲۵۰ ۲۲۔ ریوند چینی ۲۳۔ راہنمای کتاب، جلد ۱۲، ص ۵۲

۲۴۔ مجموعہ سرودہ ھا، ص ۲۵۹ ۲۵۔ ہمان، ص ۲۷۳۔۲۷۴

ہاجرہ بانو (اورنگ آباد)

غالب کی کہانی، حالات کی زبانی

مرزا غالب کے دادا قوقان بیگ شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے۔ زبان تو ترکی تھی لیکن اس میں عربی و فارسی کی کثرت شامل تھی۔ اور آج بھی یہی زبان ازبک اور تاتاری زبانوں میں اپنی مٹھاس گھولتی ہے۔ قوقان بیگ نے جب دلی میں قدم رکھا تو وہاں سخت افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ امراء کی کشمکش اور رسہ کشی جاری تھی۔ جن میں ایرانی و تورانی سرفہرست تھے۔ امیر ایران نجف خاں ذوالفقارالدولہ کا پلڑا ذرا بھاری تھا۔ وہ خود بھی نو وارد مغلوں کی دل و جان سے قدر کرتا تھا۔ اس نے قوقان بیگ کو دلی کوئی سو کلومیٹر پر ایک زرخیز پرگنہ پہاسوان کے اپنے اور رسالے کی تنخواہ کے لیے سرکار کی جانب سے مقرر کر دیا۔ لیکن یہ سرکاری عنایات صرف ان کی زندگی تک ہی قائم رہی۔ ان کی آل اولاد اس سے کوئی استفادہ حاصل نہ کر سکی۔

قوقان بیگ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹے نصراللہ بیگ خاں نے اپنے والد سے زیادہ عزت و حیثیت پائی۔ ان کی شادی حکومت دلی کے امیر نواب احمد بخش کی بہن سے ہوئی تھی جو انگریز کمانڈر انچیف سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے بیٹے عبداللہ بیگ خاں سنجیدہ، مذہبی اور سیدھے سادے انسان تھے۔ ان کی شادی آگرہ کے باعزت گھرانے میں ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ سسرال میں ہی گزارا۔ وہاں سے لکھنؤ گئے اور پھر ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن وہاں کے شیعہ اثرات انہیں راس نہیں آئے تو انہوں نے ترک ملازمت کے بعد حیدرآباد جانے کی ٹھان لی۔ یہاں امراء کی خانہ جنگی ان کی سادگی پر بھاری پڑی اور انہوں نے دلی کے قریب ریاست الور کو اپنا مسکن بنا لیا۔ ابھی برائے ملازمت سرگرداں تھے ہی کہ ایک اندرونی معرکے میں کام آ گئے۔ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ عرف مرزا نوشہ ان ہی عبداللہ بیگ کے بیٹے تھے جن کی پیدائش آگرہ میں 27 دسمبر 1797 کو ہوئی۔ عبداللہ بیگ کا جب انتقال ہوا تو غالبؔ کی عمر صرف پانچ یا چھ سال کی تھی۔ چچا نصراللہ بیگ خاں لاولد تھے۔ انہوں نے غالب کی سرپرستی کی۔ غالبؔ ابھی عمر کے آٹھویں برس میں قدم رنجہ فرمانے ہی والے تھے کہ نصراللہ بیگ ایک لڑائی میں ہاتھی سے گر کر ہلاک ہو گئے چچا کی وراثت تقسیم ہوتے ہوتے غالب کے حصے میں صرف 750 روپے سالانہ آئے۔ نانا کی سرپرستی میں داخل ہو کر کئی سال آرام سے گزرے۔ نانا جاگیردارانہ حیثیت رکھتے تھے۔ ماں تعلیم یافتہ اور مذہبی، امور خانہ داری میں ماہر خاتون تھیں۔ لیکن یہ بھی چار دن کی چاندنی ثابت ہوئی

اور پھر غالبؔ قرضداری کے بوجھ تلے دبتے گئے لیکن اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے رہے۔

مرزا غالبؔ کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ساری تعلیم گھر پر ہوئی۔ وُہ صرف بنیادی فارسی و عربی آگرہ کے ایک لائق مولوی محمد معظم کے مکتب میں سیکھی۔ لیکن ان کے اطراف واکناف اہل علم کا سمندر تھا۔ ''گلاب خانہ'' محلّہ اس وقت فارسی زبان کا مرکز کہلاتا تھا۔ غالبؔ کے خطوط سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے محلے اور اہل علم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔

فارسی زبان سے لگاؤ غالب کو ان کے بچپن سے ہی تھا۔ اس ضمن میں ایک موقع پر انہوں نے لکھا بھی ہے کہ مجھ میں فارسی کا ذوق ایسے بھرا جیسے فولاد میں جوہر۔ اس لیے دس برس کی عمر میں فارسی میں اشعار کہہ لینا کسی اور کے لیے تو ناممکن تھا لیکن غالبؔ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ عربی اور دینیات سے متعلق ان کی دلچسپی کم ہی نظر آئی۔ ان کے پاس فہم وادراک کا ایسا سمندر تھا کہ کبھی اساتذہ کی خدمت کرنے یا اصلاح لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پدرانہ شفقت اور استادانہ اصلاح ان کی قسمت میں نہیں تھی۔

میرؔ نے جب اس بارہ تیرہ سالہ لڑکے کا کلام دیکھا تو کہا تھا ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔''

''بے استادے'' کہنے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے غالب نے ایک پارسی استاد ہرمزد (عبدالصمد) کا نام مشہور کر دیا اور بتایا کہ دو برس انہوں نے غالب کے گھر پر رہ کر انہیں قدیم فارسی کی تعلیم دی اور ادب کے باریک نکات سے آگاہ کیا۔ لیکن بعد میں غالبؔ کے مختلف بیانات کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ہرمزد ایک فرضی نام تھا۔

غالب نے ابھی عمر کا تیرہواں سال بھی پورا نہیں کیا تھا کہ چچا کے سسرال میں ہی ان کی شادی طئے کر دی گئی۔ فیروز پور، جھرکہ اور لوہارو ریاستوں کے والی نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش معروف جو دلی میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان کی اپنی تو کوئی جاگیر نہ تھی، بڑے بھائی ہی باحیثیت تھے۔ لیکن شعرو سخن، علم وفضل اور مذہب وتصوف میں کوئی ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ الٰہی بخش کی بیٹی امراؤ بیگم گیارہ سال کی ہی تھیں کہ غالبؔ سے رشتہ ازدواج میں بندھ گئیں۔ وہ عبادت گزار، مذہبی اور خانہ داری میں ماہر خاتون تھیں۔ غالبؔ کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کبھی قائم نہ ہوسکی۔ عاشق شرابی شوہر کے ساتھ ہر وقت عقبیٰ کی فکر کرنے والی عورت کیسے گزر بسر کرسکتی تھی۔ اولاد بھی دو سال سے زیادہ نہ جی سکی جو امراؤ بیگم کا سہارا بن سکتی۔ غالبؔ نے اپنے ازدواجی رشتہ کو ہمیشہ بوجھ سمجھا اور کوچہ جاناں کی تلاش میں خاک چھانتے رہے۔ 1858ء کے ایک خط میں اس بات کا برملا اعتراف انہوں نے کیا کہ ''..........تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ ساری زندگی اسی چپقلش میں گزری اور سارا انہاک شعر کی زلف سنوارنے میں لگ گیا۔'' اور یہیں سے اردو ادب کو ایسا عظیم شاعر ملا جس کے رگ رگ سے مصرعوں کے موتی ٹپکتے تھے۔

اپنے دل کے دکھ سمیٹ کر یہ گراں قدر شاعر ۱۵ فروری ۱۹۳۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حیدر قریشی (جرمنی)

''فلسفی'' کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی

(عمران شاہد بھنڈر کی مضحکہ خیزیاں، جعل سازیاں اور سرقہ)

علم وادب کی دنیا میں کبھی کبھار سامنے کی صورتحال کے عقب میں بھی بعض حقائق موجود ہوتے ہیں جن کے سامنے آنے کے بعد سامنے کی صورتحال کا از سرِ نو جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون اسی سلسلہ میں لکھا جا رہا ہے۔ مضمون کا عنوان بے شک چٹ پٹا ہے لیکن کسی قسم کی سنسنی خیزی کے بغیر میں سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کروں گا اور نفسِ مضمون سے منسلک مختلف حقائق کو، جہاں ان کے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی بیان کرتا جاؤں گا۔ عنوان چٹ پٹا ہونے کا سبب ہمارے فلاسفر صاحب خود ہیں جن کی مضحکہ خیزی کے باعث یہی عنوان مناسب لگا۔

میں ذاتی طور پر ادب میں سرقہ اور جعلسازی کے خلاف ایک عرصہ سے متحرک ہوں۔ لگ بھگ 1999ء سے۔ مغربی دنیا میں سرکاری امداد پر زندگی گزارنے والے لوگ بھی آمد وخرچ کی سطح پر خود کفیل اور پاکستانی حساب سے خوشحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ وسائل کی دستیابی وخوشحالی کے باعث یہاں کے جعلی اور سارق شاعروں اور ادیبوں کا ٹولہ ہمیشہ میرے خلاف متحد رہا ہے اور اپنی ذہنی پستی کے لحاظ سے جو کچھ میرے خلاف کرسکتا ہے کرتا رہا ہے۔ تمام تر مخالفت کے باوجود میں نے سرقہ اور جعل سازی کو بے نقاب کرنے کا اپنا کام جاری رکھا۔ (اس وقت بھی انڈیا میں جوگندر پال کے افسانے کا سرقہ کرنے والے ایک کردار پر کام ہو رہا ہے)۔

اسی دوران مجھے کہیں سے بھنک پڑی کہ عمران شاہد بھنڈر نامی کسی صاحب نے ''پاکستان پوسٹ'' انگلینڈ میں کوئی مضمون لکھا ہے جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی بعض تحاریر کو مغرب سے ترجمہ بلاحوالہ قرار دیا گیا ہے۔ میں نے مضمون اور مضمون نگار کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ یہ مضمون ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' راولپنڈی کے سالنامہ 2006ء میں بھی چھپ چکا ہے اور یہ کہ موصوف انگلینڈ میں کہیں پڑھتے ہیں۔ اس دوران مجھے ''نیرنگِ خیال'' میں مطبوعہ مضمون ایک دوست نے فراہم کر دیا۔ مضمون بہ عنوان ''گوپی چند نارنگ مترجم ہیں مصنف نہیں'' میں ترجمہ بلاحوالہ اقتباسات کے ساتھ ظاہر ہو رہا تھا اس لیے عنوان کے ڈھیلے پن کے باوجود مجھے مضمون مناسب

لگا اور میں نے مضمون نگار عمران شاہد بھنڈر کو تلاش کر کے ان سے رابطہ کیا۔ انہیں اسی مضمون کو کچھ مزید لکھ کر جدید ادب کے لیے بھیجنے کو کہا۔ انہوں نے اپنے مضمون کو اسی عنوان کے ساتھ نہ صرف چند مزید اقتباسات شامل کر کے دوگنا کر دیا بلکہ اپنے تعارف کے طور پر ایک خصوصی نوٹ بھی ساتھ بھیج دیا۔ میں نے اپنے نوٹ میں اس میں سے صرف ایک حصہ شامل کیا جس کے مطابق موصوف برمنگھم یونیورسٹی سے **Postmodern Literary Theory** کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ (یہ اطلاع غلط تھی، تاہم اس کا انکشاف بعد میں ہوا اور اس پر مزید بات آگے چل کر ہوگی)۔ جدید ادب کے شمارہ نمبر 9 میں جیسے ہی موصوف کا مضمون شائع ہوا، علمی و ادبی حلقوں میں اس کا فوری نوٹس لیا گیا اور مختلف اخبارات و رسائل نے اس مضمون کے بلا حوالہ ترجمہ والے حصوں کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ (موصوف کے چھیڑے ہوئے دوسرے مباحث میں عمومی طور پر کسی نے دلچسپی نہیں لی)۔

تب تک میرے ذہن میں اتنا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ صاحب اس مضمون کو پڑھ کر کچھ اس قسم کا خط لکھ دیں گے کہ اس مضمون میں جن حوالہ جات کی غیر موجودگی کا ذکر ہے میں انہیں دیکھتا ہوں اور کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس شکایت کا ازالہ کر دوں گا۔ یہ ایک ادبی سلیقہ کی بات ہوتی اور مسئلہ بڑی حد تک یہیں پر ختم ہو جاتا۔ لیکن اس موڑ پر آ کر دو خرابیاں ہوئیں۔ ایک تو نارنگ صاحب نے اس قسم کی یا کسی بھی قسم کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دوسرے میرے ایک دوست جاوید حیدر جوئیہ صاحب نے نارنگ صاحب کی حمایت میں ایک مضمون لکھ ڈالا۔ انہوں نے نارنگ صاحب کی محبت میں مضمون لکھا ہوگا لیکن یہ نادان دوستی کا نمونہ تھا۔ اس کے جواب میں عمران شاہد بھنڈر سے مضمون لکھوانا پڑا۔ اس بار پھر عمران شاہد نے اپنے مزید تعارف کے طور پر بہت کچھ لکھ بھیجا جس میں سے میں نے اتنا حصہ شامل کیا:

''انہوں نے 2004ء میں یونیورسٹی آف سینٹرل انگلینڈ، برمنگھم سے ''انٹرنیشنل براڈ کاسٹ جرنلزم'' میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد 2006ء میں انہوں نے اسی یونیورسٹی سے ''انگلش لٹریری سٹڈیز'' میں ایم اے کی دوسری ڈگری حاصل کی۔ عمران بھنڈر نے اپنا مختصر مقالہ جرمن فلسفی عمانوئیل کانٹ کے فلسفہ جمالیات پر تحریر کیا اور فائنل مقالہ بیسویں صدی کی روسی تنقید پر لکھا جس میں انہوں نے لیون ٹراٹسکی کے نظریہ ادب کا ہیئت پسندوں کے نظریات سے تقابلی جائزہ لیا۔ اس وقت وہ پی ایچ ڈی کے مقالے پر کام کر رہے ہیں۔'' (**جدید ادب 10:**)۔۔۔ (عمران شاہد بھنڈر صاحب کے فراہم کردہ اس تعارفی نوٹ کے بارے میں بھی آگے چل کر ایک ساتھ بات ہوگی)۔

جاوید حیدر جوئیہ کے مضمون کے جواب میں لکھتے ہوئے موصوف اتنے رواں ہوئے کہ مضمون چھپ جانے کے بعد بھی مزید اقتباسات تلاش کراتے رہے۔ اس سلسلہ میں ایک شخصیت کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جس نے مغربی کتابوں کے اقتباسات اور نارنگ صاحب کی کتاب کے اقتباسات پر کافی کام کیا۔ محنت میں کسی اور کا حصہ

شامل تھا لیکن اس کا پھل بھنڈر صاحب اکیلے کھا رہے تھے۔ خیر یہ ان دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ عمران بھنڈر نے اس شخصیت کی محنت کا فراخدلانہ اقرار نہیں کیا تو یہ ان کا اپنا ظرف ہے۔ بات ہو رہی تھی ان کے رواں ہو جانے کی۔ چنانچہ جدید ادب کے شمارہ نمبر 10 کے بعد شمارہ نمبر 11 کے لیے بھی انہوں نے سرقات کے تناظر میں ایک مضمون فراہم کر دیا۔ اس مضمون سمیت ان کے ایسے سارے مضامین میں سرقات کی نشان دہی بہت کم ہوتی ہے اور دوسرا رطب و یابس بہت زیادہ ہوتا ہے۔ میں ان کے اس انداز سے تنگ تھا۔ پہلے تو میں نے شمارہ نمبر 10 میں ہی لکھ دیا تھا کہ:

''جہاں تک دوسرے اشوز کا تعلق ہے ذاتی طور پر میں عمران شاہد کے مقابلہ میں جاوید حیدر جوئیہ سے زیادہ قریب ہوں۔ لیکن یہاں ان پر ساری توجہ مرکوز کرنا نفسِ مضمون ''بلا حوالہ ترجمہ/سرقہ'' کی طرف سے توجہ ہٹا کر در حقیقت دوسرے مباحث میں الجھا دینا ہے۔'' (**جدید ادب** شمارہ نمبر 10۔ صفحہ نمبر 206)

لیکن ان کی زود گوئی اور فضول گوئی کا سلسلہ دراز تر ہوتا چلا گیا، چنانچہ ان کی بعض فضولیات کے جواب میں شمارہ نمبر گیارہ کا اداریہ بھی لکھنا پڑا جس میں ان کا نام لیے بغیر ان کے مادہ پرستانہ خیالات کا رد پیش کیا گیا۔ میں انہیں شروع سے ہی سمجھاتا آ رہا تھا کہ اپنی بات کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنا چاہیے۔ بلکہ دوستانہ انداز میں انہیں یہ تک کہا تھا کہ بندہ اگر دریا کو کوزے میں بند نہیں کر سکتا تو کوزے میں سے دریا کا منظر دکھانے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ بہر حال شمارہ نمبر گیارہ ہی میں مطبوعہ عمران کی بعض طویل فضولیات کے جواب میں نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہوا اپنا اداریہ یہاں بھی درج کیے دیتا ہوں۔

''ادب میں سامنے کی حقیقت کے عقب میں موجود حقیقت تک رسائی کی تخلیقی کاوش ایک طرح سے صوفیانہ رویہ رہا ہے۔ موجود مادی کائنات کے پارٹیکلز کی تہہ میں اس کے عقبی بھید موجود ہیں لیکن تا حال سائنس پارٹیکلز سے کوارکس (کلرز) تک پہنچ کر رُک جاتی ہے اور اس سے آگے اس کے ہونٹوں پر بھی ایک حیرت انگیز مسکراہٹ ہی رہ جاتی ہے۔ ہمارے جو صاحبانِ علم مادی دنیا سے ماورا کسی حقیقت کو مجہولیت سمجھتے ہیں، انہیں اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ ماورائیت کی پرچھائیوں کو مس کرنے کا تجربہ نہ رکھنے والے صاحبانِ علم اپنے علم کی حد کو کائنات کے بھیدوں کی آخری حد نہ سمجھیں۔ ایسے احباب کو ان کے مادی ذہن کے مطابق ہی بتانا مناسب ہے کہ انسانی دماغ کی کارکردگی کو دیکھیں تو اس کا 10 فی صد ہی ابھی تک کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس 10 فی صد دماغی کارکردگی نے انسان کو کتنی حیرت انگیز ترقیات کے دور تک پہنچا دیا ہے۔ اس سے دماغ کا جو 90 فی صد حصہ بظاہر خاموش پڑا ہے، اس کی بے پناہی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اچھے تخلیق کاروں کو اس 90 فی صد سے کبھی کبھار جو کچھ ملتا ہے، اس کا اندازہ تخلیق کار ہی کر سکتے ہیں۔ سو ماورائیت تو ہمارے باہر بے پناہ کائنات سے لے کر ایٹم کے اندر اس کے بلڈنگ بلاک کی تلاش تک مسلسل موجود ہے۔ اور انسانی دماغ

کا90فی صد خاموش حصہ بجائے خود ہمارے اندر ماورائیت کی کارفرمائی کا زبردست ثبوت ہے۔

ماورائیت کے نام پر یا صوفیانہ رمزیت کے نام پر اگر بعض لوگ سطحی یا بے معنی تحریریں پیش کر رہے ہیں تو اس نقلی مال کا مطلب بھی یہ نکلتا ہے کہ اصل بھی موجود ہے۔اصل کرنسی ہوتی ہے تو اس کی جعلی کرنسی بنانے والے اپنا کام دکھاتے ہیں۔حقیقت کے عقب میں موجود حقیقت کی جستجو رکھنے والوں کو ایک طرف تو مذہبی نظریہ سازوں کا معتوب ہونا پڑتا ہے دوسری طرف وہ لوگ بھی ان کے درپےَ رہتے ہیں جو بظاہر خود کو مذہبی نظریہ سازی کے استحصالی طرز کا مخالف کہتے ہیں۔لیکن عجیب بات ہے کہ حقیقت کے عقب میں موجود حقیقت اور زندگی کو اس کے وسیع تر مفہوم میں جاننے کی کوشش کرنے والوں کو دونوں طرف کے لوگوں سے ایک جیسی ملامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ مذہبی نظریہ سازوں کے مخالف ترقی پسندوں کا رویہ تو بعض اوقات خود مولویانہ طرزِ عمل سے بھی زیادہ مولویانہ ہو جاتا ہے۔امید ہے ہمارے ایسے صاحبانِ علم اپنے رویوں پر نظر ثانی کریں گے۔''

شمارہ نمبر 11 کے اداریہ میں جہاں میں نے ان کے خیالات سے اپنی بیزاری کو علمی سطح پر دلیل کے ساتھ ظاہر کیا، وہیں انہیں عملاً یہ بھی بتایا کہ اپنی بات کو کم سے کم الفاظ میں کہنے کا سلیقہ کیا ہوتا ہے۔ایک اور خرابی جو بھنڈر صاحب میں تکلیف دہ حد تک تھی وہ یہ تھی کہ ایک مضمون کو تین سے چار بار تک اضافوں کے ساتھ بھیجتے چلے جاتے تھے۔ایک بار مضمون بھیجا۔میں نے محنت کر کے اسے رسالہ کے سائز میں سیٹ کر لیا تو پھر نئی فائل بھیج دی کہ پہلا ورشن رہنے دیں، یہ ورشن شامل کر لیں۔ایسا تین سے چار بار تک ہو جاتا تھا۔چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ ان کا یہ رطب و یابس شمارہ نمبر گیارہ کے بعد بالکل نہیں چھاپوں گا۔رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب موصوف نے مدیر جدید ادب کے نام ایک طویل مکتوب لکھا۔میں نے اسے مضامین کے حصہ میں شامل کر لیا۔حسبِ معمول اس میں بھی بار بار اضافہ کر کے نیا ورشن بھیجا جا رہا تھا۔ایک ہی نام کی ملتی جلتی فائلز میں سے جو مجھے تازہ ترین لگی میں نے شامل کر لی۔رسالہ چھپنے کے لیے نہ صرف جا چکا تھا بلکہ پبلشر کی طرف سے رسالہ چھپ کر بائنڈنگ کے مرحلہ سے گزرنے کی اطلاع بھی آ چکی تھی۔اس دوران بھنڈر صاحب نے اپنے خط کا ذکر کیا تو میں نے بتایا کہ یہ خط انیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔تب موصوف چونکے اور کہنے لگے کہ یہ آپ نے پہلا یا دوسرا ورشن چھاپ دیا ہے۔نیا ورشن تو مزید بہت سارے صفحات پر مشتمل تھا۔ساتھ تقاضا کرنے لگے کہ انیس صفحات پر مشتمل خط کی بجائے اس کا اضافہ شدہ نیا ورشن شامل کیا جائے۔میں نے بتایا کہ رسالہ چھپ چکا ہے تو اصرار کرنے لگے کہ رسالہ دوبارہ چھپوا لیں۔میں نے صاف انکار کر دیا، البتہ انہیں مضامین والے حصہ کی فائل بھیج دی کہ اسے دیکھ کر اطمینان کر لیں۔میں نے یہ سب کچھ دوستانہ انداز سے کیا تھا لیکن یہاں ایک اور فتنہ کھڑا ہو گیا۔موصوف کو کسی کا مضمون اپنے خط سے پہلے دیکھ کر حفظ مراتب کا خیال آ گیا اور آگ سی لگ گئی۔خط کے ورشن کا مسئلہ بیچ میں رہ گیا اور اپنے خط کو آخر میں شامل کرنے پر نہ صرف شدید طور پر بگڑ گئے بلکہ ایک خاتون کے ای میل آئی ڈی سے مجھے غلیظ گالیوں کی

میلز بھیجنا شروع کر دیں۔میں وہ ساری ای میلز اشعر نجمی کو فراہم کر چکا ہوں۔اس بارے میں مزید کچھ نہیں لکھتا بس اتنا کہ ان صاحب کی شخصیت اور کردار کا یہ رخ اتنا گھناؤنا اور مکروہ تھا کہ اب بھی سوچتا ہوں تو گھن آتی ہے۔حفظ مراتب کے حوالے سے البتہ یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ جدید ادب میں مدیر جدید ادب کے نام کسی طویل خط کا انتخاب کر کے اسے مضامین کے حصہ میں عموماً آخر میں ہی لگایا جاتا ہے۔پھر ان مارکسسٹ مولانا کو تو میں نے ویسے بھی ہمیشہ آخری حصہ میں چھاپا تھا۔ان کی ایک ہی اہمیت تھی کہ وہ ترجمہ بلا حوالہ کے اقتباسات آمنے سامنے لا رہے تھے۔اور بس!

بہر حال میں جو پہلے ہی ان کے رطب و یابس سے تنگ آیا ہوا تھا اب بالکل طے کر لیا کہ ان کے ''افکارِ عالیہ'' کو جدید ادب میں شائع نہیں کرنا۔ان کے مضامین میں بار بار اضافہ سے مجھے ان کے اصل مسئلہ کا بھی اندازہ ہو گیا۔جب میں نے 1972 تا 1974ء کے دورانیہ میں ایم اے اردو کی تیاری کی تھی تب ''اقبال کا خصوصی مطالعہ'' کے تحت اقبال کے فلسفۂ خودی اور اسی پس منظر میں فلسفۂ زمان و مکان کے بارے میں تھوڑا بہت جاننے کا موقعہ ملا۔مجھے یاد ہے اس وقت ایسے لگتا تھا کہ میں علم سے لبا لب بھر گیا ہوں اور مجھے خان پور میں ایسے دوستوں کی تلاش رہتی تھی جن کے ساتھ اپنے سارے پڑھے ہوئے پر گفتگو کر سکوں۔یہ ایک عجیب سی اضطرابی کیفیت ہوا کرتی تھی لیکن ایم اے کر لینے کے بعد جب ان موضوعات پر مزید مطالعہ کا موقعہ ملا تو اپنے لبا لب بھرنے کی بجائے خالی ہونے کا احساس ہونے لگا۔تب اندازہ ہوا کہ وہ نصابی نوعیت کی طالب علمی کا کرشمہ تھا، اپنا پڑھا ہوا چھلکنے کو بے تاب ہوا کرتا تھا۔اپنے ذاتی تجربہ کے حوالے سے میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ عمران شاہد بھنڈر اپنی یونیورسٹی کے نصابی مطالعہ کے باعث ویسی ہی کیفیات سے گزر رہے تھے۔کسی نصابی مطالعہ کے بعد، کسی اسائنمنٹ کے بعد یا پروفیسر سے گفتگو کے بعد جو نئی باتیں ان کے سامنے آتی تھیں، وہ اس سارے پڑھے اور سنے ہوئے کو بھی اپنے مضمون میں کسی نہ کسی طور شامل کرنے لگتے تھے۔

ان کی ذات کی حد تک یہ معاملہ رہتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن جب وہ چھپے ہوئے رسالہ کو دوبارہ چھاپنے کا مطالبہ ''غنڈہ گردی'' کے انداز میں کرنے لگے اور وہ بھی اس لیے کہ ان کی ہفوات سے بھر پور باتوں کا اضافہ شاملِ اشاعت کیا جائے تو ان کے طرزِ عمل اور مکروہ ذہنیت کے بارے میں بڑے سخت الفاظ ذہن میں آتے ہیں۔میں تو آج تک خود کو طالب علم سمجھتا ہوں (یہ کوئی انکساری والی بات نہیں واقعتاً محض ایک طالب علم ہوں لیکن صرف کسی ایک فلسفے یا علم کے کسی ایک رُخ کا نہیں بلکہ اپنی استعداد کے مطابق جو کچھ سامنے آتا ہے، اچھا لگتا ہے اور پلے پڑتا ہے اس کو مزید سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں) اور ہمہ وقت علم کی دنیا میں کچھ نہ کچھ سیکھنے میں لگا رہتا ہوں۔عمران شاہد بھنڈر کا مسئلہ یہ ہے کہ انہوں اپنے ایم اے کے دوران جو کچھ پڑھا، وہ ان سے ٹھیک سے ہضم نہیں ہوا اور وہ پہلے ہلے میں ہی خود کو فلاسفر سمجھنے کے زعم میں مبتلا ہو گئے۔اس زعم کا حال ذرا آگے چل

کر۔۔۔۔ابھی واقعات کوان کے زمانی تسلسل میں ہی بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

شمارہ نمبر 11 کی اشاعت کے بعداور شمارہ نمبر 12 کی اشاعت کے دوران ڈاکٹر نارنگ صاحب نے اچانک شدید ردِعمل ظاہر کر دیا۔میں اسے حالات و واقعات کے تناظر میں بد قسمتی کہوں گا کہ وہ تب متوجہ ہوئے جب میری طرف سے معاملہ مکمل طور پر سمیٹا جا چکا تھا۔تب انہوں نے غیر ضروری طور پر شمارہ نمبر۱۲ پر ایک طرح سے سنسر شپ نافذ کرادی۔ مجھے اس کے نتیجہ میں جدید ادب کے شمارہ نمبر 12 کی کہانی لکھنا پڑ گئی۔اس کے بعد بھی میں ایک طرح سے صبر کر کے بیٹھ گیا تھا۔لیکن جب میرے مضمون کے ردِعمل میں لندن کے ایک نازیبا شخص نے غلیظ قسم کا مضمون لکھا اور اسے ''ادب ساز'' جیسے معقول جریدے نے شائع کرنے کی نامعقولیت کی تو پھر میرے دوستوں نے اور میں نے طے کر لیا کہ اب پوری جوابی کاروائی کی جانی چاہیے۔عکاس کا ڈاکٹر نارنگ نمبر ہماری طرف سے اسی کا جواب تھا۔لیکن عکاس کی بات بعد میں۔

پہلے یہاں عمران شاہد بھنڈر کی شخصیت اور کردار کا ایک اور رُخ بھی سامنے لاتا چلوں۔جن دنوں میں ہم لوگ ابھی مل کر چل رہے تھے،اور جدید ادب کے ذریعے موصوف کو خاصی پروجیکشن مل رہی تھی،عین انہیں دنوں میں موصوف کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ لندن کے اس نازیبا شخص سے پینگیں بڑھا رہے ہیں جس کے مضمون کے شدید ردِعمل میں ہم نے بعد میں عکاس کا نارنگ نمبر چھاپا تھا۔یہ بات میرے لیے حیران کن ہی نہیں افسوس ناک بھی تھی۔بے شک ادبی معاملات میں کسی سے رابطہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔لیکن جب معاملہ با قاعدہ جنگ و جدل جیسی صورت اختیار کر رہا تھا عین ان دنوں میں دوسری طرف ساز باز کرنا بجائے خود انسانی کردار میں غداری کی سرشت کی نشان دہی کرتا ہے۔یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ جس کو بھی عمران شاہد بہت زیادہ ٹیلی فون کالز کرتے ہیں بعد میں اسی کے خلاف زہر اگلتے ہیں۔اس کی ایک نہیں،دو نہیں،کئی مثالیں موجود ہیں۔جو شخص اپنے استاد ابن حسن کے بارے میں بھی الٹی سیدھی بات کرنے پر آجائے اس کے بارے میں مزید کیا کہا جائے۔بہر حال میرے سامنے ایک مشکل اور پیچیدہ صورتحال تھی ایک طرف عمران شاہد بھنڈر اپنی سرشت سے مجبور ہو کر ساز باز کر رہے تھے،دوسری طرف نارنگ صاحب کی طرف سے دباؤ پڑ گیا تھا۔تیسری طرف نارنگ صاحب کے نادان دوستوں نے ان کی حمایت کے نام پر ایک طوفان کھڑا کر دیا جو بہر حال خود ان کے اور نارنگ صاحب کے خلاف ہی گیا۔میں اس محاذ آرائی کے سارے کرداروں کو اور ساری صورتحال کو ممکنہ حد تک حکمت کے ساتھ نمٹ رہا تھا،جو اندر اور باہر دونوں طرح کے مخالفین کے ساتھ درپیش تھی۔خدا کا شکر ہے کہ وہ مرحلہ اپنے انجام کو پہنچا۔میں اپنے علمی و ادبی محاذ پر سرخ رو رہا۔

شہرت طلبی کے لیے اپنی دھوکہ باز سرشت کے باوجود عمران بھنڈر کو عکاس کے نارنگ نمبر میں ہمارا ساتھ دینا پڑا کیونکہ وہ لندن کے جس شخص کے ساتھ مل کر میرے خلاف ساز باز کر رہے تھے اسی نے اس

ساز باز کی بعض باتیں ظاہر کر کے ہمارے مارکسسٹ مولانا کے کردار کے دہرے پن کو ظاہر کر دیا تھا اور اب ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ عکاس کے نارنگ نمبر میں ہمارا ساتھ دیتے۔وہ جس حد تک ساتھ دے سکتے تھے دے رہے تھے اور ہماری طرف سے میرے دوستوں نے ان کے مصلحت پسندانہ ساتھ کے باوجود ان کی ادبی حیثیت کے بارے میں دوٹوک اور کھلی باتیں اسی نمبر میں لکھ دیں۔

ڈاکٹر نذر خلیق جو عکاس کے ڈاکٹر نارنگ نمبر کے مہمان مدیر تھے اور جن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ''اردو ادب میں سرقہ اور جعل سازی'' کے موضوع پر تھا،انہوں نے اپنے مہمان اداریہ میں عمران شاہد کی بہت ساری غلط فہمیوں (دراصل خوش فہمیوں) کے بارے میں برملا طور پر لکھا کہ:

''یہاں اس امر کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے کہ عمران شاہد اپنے مضامین میں گوپی چند نارنگ کے سرقوں کی نشاندہی کے علاوہ جن دوسرے متعلقات میں جاتے ہیں وہاں پر ان کے سرقوں کی نشاندہی کی داد دینے کے باوجود ان سے اختلاف کرنا پڑتا ہے۔**جدید ادب (شمارہ نمبر 10 صفحہ نمبر 206)** میں حیدر قریشی نے بھی **(نمبر ہذا ص 41 پر)** اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔اور یہاں بھی ان تحفظات کا اظہار ضروری ہے۔مثلاً فضیل جعفری صاحب نے دس سال پہلے سے یہ لکھ رکھا ہے کہ گوپی چند نارنگ جن کتابوں کے حوالے دے رہے ہیں لگتا ہے انہوں نے وہ اصل کتابیں پڑھی نہیں ہیں۔بعض دیگر ناقدین بھی یہ بات اپنے اپنے انداز میں کئی برس پہلے سے کہہ چکے ہیں۔جیسے سکندر احمد نے انہیں **''ادنیٰ ترین تراجم کی بدترین مثال''** قرار دیا۔احمد ہمیش نے **''انگریزی متن کے ناقص تراجم''** سے موسوم کیا۔اسی طرح ہمارے بہت سارے ناقدین نے مابعد جدیدیت کی محض رپورٹنگ نہیں کی۔اس قسم کے بیانات سے عمران شاہد بھنڈر کے اردو میں مطالعہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے وہ اپنی نصابی حدود میں جو کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں،اگر وہ ان کا پی ایچ ڈی کا موضوع نہ ہوتا تو وہ اپنے کسی اور سبجیکٹ تک ہی محدود ہوتے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے مابعد جدید مغربی تصورات سے بحث کرتے ہوئے محض رپورٹنگ نہیں کی۔'مصنف کی موت' کے تصور کو مکمل طور پر رد کیا' متن کی اہمیت کو شدت کے ساتھ اجاگر کیا۔فضیل جعفری اور وزیر آغا وغیرہ کی یہ صرف دو مثالیں ہیں۔اردو تنقید و ادب میں مزید کئی مثبت اور روشن مثالیں موجود ہیں۔سب کچھ منفی نہیں ہے۔اسی طرح عمران کے بعض دوسرے مباحث پر بھی ہمارے تحفظات ہیں۔خصوصاً جہاں ایسی غیر متعلقہ باتوں کی بھرمار ہے جن کا سرقہ کی نشاندہی کے بنیادی مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں اور جو ان کے یونیورسٹی نوٹس اور نصابی نوعیت کے مواد پر مبنی دکھائی دیتی ہیں۔تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عمران شاہد اردو تنقید میں اور کوئی کتنا اہم کام کر لیں لیکن گوپی چند نارنگ کے سرقوں کو بے نقاب کرنا ان کا سب سے اہم کام اور یہی ان کی ادبی شناخت رہے گا۔''

عمران بھنڈر کے ایسے دعوے کہ یہ کام صرف انہوں نے ہی سرانجام دیا ہے،اس اداریہ میں اسے رد کر دیا گیا تھا۔ان سے یہ سب کچھ اس لیے سرزد ہوا کہ یہ ان کے نصابی مطالعہ کا حصہ بنا تھا۔پھر اس سلسلہ میں ایک اور

شخصیت نے اقتباسات کی تلاش میں ان کی بہت زیادہ مدد کی، جس کا فراخدلانہ اعتراف کرنے کی بجائے عمران نے اپنی روایتی کم ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے۔تاہم ان کے بنیادی کام کے سلسلہ میں بھی یہ اضافہ کردوں کہ ناصر عباس نیر کے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں بھی اس موضوع کے مطابق نارنگ صاحب کے بعض اقتباسات اور حوالہ جات شامل تھے۔صرف نارنگ صاحب ہی کے نہیں ان کے مقالہ میں تو بیس سے زائد ناقدین کرام کے اس نوعیت کے ترجمہ بلاحوالہ کے شواہد پیش کیے جا چکے ہیں جبکہ ہمارے مارکسسٹ مولانا عمران بھنڈر صرف ایک نقاد کے حوالے پیش کر کے ہی اپنے آپے سے باہر ہو گئے اور پورے اردو ادب کو للکارنے لگے۔اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ عمران کے چھیڑے ہوئے دوسرے مباحث کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نذر خلیق نے بجا طور پر ان کے ہاں اردو میں مطالعہ کی کمی کا ذکر کیا۔صرف مطالعہ کی کمی ہی نہیں ان کی ادب فہمی پر بھی ایک بڑا سوالیہ نشان لگتا ہے۔ میں اس حوالے سے ذرا آگے چل کر بات کروں گا۔

عکاس کے اسی نمبر میں مدیر عکاس ارشد خالد نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی حمایت میں لکھے گئے ایک مکتوب نما مضمون ''کرگس کا جہاں اور ہے۔۔۔۔'' کو شائع کیا تھا۔یہ مضمون شمیم طارق کا لکھا ہوا تھا۔اس مضمون میں شمیم طارق نے عمران بھنڈر کے بارے میں بڑی عمدہ رائے دی تھی، ان کے بقول:

''عمران شاہد بھنڈر کو آپ نے دونوں شماروں میں جگہ دی ہے مگر ان کے دونوں مضامین پڑھ کر آنکھوں میں اس بوڑھی عورت کی شبیہ گھوم جاتی ہے جو اپنی گٹھری سنبھالتی ہے تو خود گر جاتی ہے اور خود کو سنبھالتی ہے تو گٹھری گر جاتی ہے۔موصوف موضوع پر قابو رکھنے کے بجائے موضوع کے سامنے بے قابو ہو گئے ہیں۔''

اس مضمون کو شائع کرتے ہوئے ارشد خالد نے ترجمہ بلاحوالہ والے صرف ایک نکتے پر اختلاف کرتے ہوئے شمیم طارق کے باقی مضمون سے لفظ بلفظ اتفاق کیا اور اپنے نوٹ میں لکھ دیا:

''اس مضمون میں علامہ اقبال پر عمران شاہد کے نامناسب اعتراضات کے جواب میں شمیم طارق نے بجا طور پر گرفت کی ہے۔ میں اس معاملہ میں **شمیم طارق سے لفظ بلفظ متفق ہوں،''**

نارنگ نمبر کی اشاعت کے بعد کسی حد تک توقع کے مطابق گھمسان کا رن پڑا۔ارشد خالد، ڈاکٹر نذر خلیق اور سعید شباب کی ہر ممکن مدد تو میرے ساتھ رہی، تاہم دوستوں کی اخلاقی اور تھوڑی بہت ممکنہ مدد کے باوجود بڑی حد تک مجھے یہ لڑائی چاروں طرف سے اکیلے ہی لڑنی پڑی۔عمران بھنڈر نے اس معاملہ میں معنی خیز خاموشی اختیار کیے رکھی۔صرف ایک موقعہ پر عمران بھنڈر نے اقبال نوید کے نام سے ایک جوابی مضمون لکھا تھا جو ظفر اقبال کے کالم کا جواب تھا۔ یہاں یہ واضح کر دوں کہ اقبال نوید انگلینڈ میں مقیم شاعر ہیں لیکن انہیں مابعد جدید مباحث کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔ان کے نام سے جو کچھ بھی چھپا ہے وہ سارے کا سارا عمران بھنڈر کا اپنا لکھا ہوا ہے۔اس کے باوجود وہ اپنی خوشی سے استعمال ہوتے ہیں تو ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی عمران بھنڈر کا ان کے نام سے لکھا ہوا انہیں کا مان

لیتے ہیں۔لیکن سلمان شاہد کے نام سے جو مضامین چھپے ہیں وہ سب عمران شاہد کے اپنے لکھے ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مجھے عمران بھنڈر نے بتایا تھا کہ سلمان شاہد میرا چھوٹا بھائی ہے اور جدید ادب بھیجنے کے لیے سلمان شاہد کا گوجرانوالہ کا ڈاک کا پتہ بھی دیا تھا لیکن جب ان کے آبائی شہر گوجرانوالہ میں ان کے قریبی احباب سے ذکر ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ ایڈریس تو ان کا ہے لیکن سلمان شاہد نام کا ان کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ہمیں ان کی ذاتی زندگی اور اس کے معاملات سے کوئی غرض نہیں۔اس سے بھی غرض نہیں ہے کہ سلمان شاہد بھنڈر حقیقت میں کون ہے؟ اس کا عمران شاہد بھنڈر سے دراصل کیا رشتہ ہے؟ لیکن اس بات سے غرض ضرور ہے کہ سلمان شاہد بھنڈر کے نام سے عمران کی حمایت یا ان سے اختلاف کرنے والوں کی مذمت کے طور پر لکھے گئے تمام مضامین عمران شاہد کے اپنے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ یہ صورتحال اقبال نوید کے نام کو استعمال کرنے سے یکسر مختلف ہو جاتی ہے۔اقبال نوید بہر حال ایک شاعر ہے، جبکہ سلمان شاہد سرے سے کوئی لکھنے والا ہے ہی نہیں۔سو اقبال نوید کے نام کی طرح سلمان شاہد کے نام سے عمران بھنڈر کی حمایت اور ان سے اختلاف کرنے والوں کی مذمت والے مضامین بھی عمران بھنڈر نے خود لکھے ہیں۔ایسے مضامین عمران بھنڈر کی تعریف تک محدود رہیں تو ان کی معصوم خواہش کا احترام کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ کسی کے خلاف ان ناموں کو استعمال کرتے ہیں تو علمی و ادبی سطح پر یہ بات مناسب نہیں رہتی۔عظمت کے کسی مصنوعی سنگھاسن پر بیٹھ کر دوسروں کے نام سے لوگوں کے خلاف لکھنے سے بہتر ہے کہ عمران بھنڈر خود ایسے مضامین لکھا کریں۔

عکاس کے ڈاکٹر نارنگ نمبر کی اشاعت کے بعد کی جنگ کا سارا حال میری کتاب ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' میں شامل ہے اور وہ سب معاملات اب ادب کی تاریخ کے سپرد ہیں۔

2010ء میں عمران بھنڈر کی پہلی کتاب ''فلسفہ مابعد جدیدیت'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔اس کتاب کا بنیادی سبب تو نارنگ صاحب کے ترجمہ بلاحوالہ کا موضوع ہی تھا لیکن حسبِ معمول اس میں دوسرا رطب و یابس زیادہ ہے۔لیکن اس سے بھی بڑا تماشہ یہ ہوا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد عمران شاہد بھنڈر نے باقاعدہ فلسفی ہونے کا دعویٰ کر ڈالا ہے۔فلسفہ کو اپنا موضوع قرار دے کر بندہ مشاعروں کے شاعروں جیسی حرکتیں کرے تو ویسے بھی اچھا نہیں لگتا۔موصوف نے کتاب چھپنے کے بعد اس کی رونمائی کا پورا اہتمام کرایا اس کے لیے ان کی بھاگ دوڑ کی پوری داستان ہے۔اس تقریب کی روداد چھپنے لگی تو اپنے نام کے ساتھ ''نوجوان فلسفی'' کا اضافہ کرایا۔ پاکستان گئے تو وہاں خاصی تگ ودو کے بعد اپنا ایک انٹرویو شائع کرایا، جو 22 دسمبر 2010ء کو ایک روزنامہ میں شائع ہوا۔اس میں بھی اپنے آپ کو خود ہی فلسفی قرار دے کر گفتگو فرمائی۔اخباروں میں ایک دو خبریں چھپوائیں تو ان میں اپنے نام کے ساتھ نوجوان فلسفی یا نوجوان اسکالر کے الفاظ اہتمام کے ساتھ لکھوائے۔اب ذہنِ جدید کے ایک حالیہ شمارہ (نمبر 58) میں بھی عمران شاہد بھنڈر کے بارے میں تعارفی طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سے دو باتیں

قابلِ ذکر ہیں۔ایک تو یہی کہ۔۔نوجوان فلسفی۔۔اور دوسری یہ کہ آپ انگلینڈ میں شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہیں۔پہلی بات مضحکہ خیز ہے اور دوسری بات یکسر جھوٹ۔

پہلے تو میں اپنے فلسفی کی نوجوانی کا ذکر کروں گا جس نے شیلا کی جوانی کو بھی مات دے دی ہے۔۴۰ سال کی عمر کے بعد خود کو نوجوان لکھنا جراتِ رندانہ کی طرز پر جرأتِ فلسفیانہ ہی کہی جا سکتی ہے۔ہر چند فلمی دنیا میں کم عمر اداکار کو بڑی عمر کا اور بڑی عمر کے اداکار کو کم عمر دکھایا جاتا ہے اور فلمی دنیا میں اس قسم کی رنگ بازی چلتی رہتی ہے،لیکن اس گانے کی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ کترینہ کیف تو ابھی ۳۰ برس کے لگ بھگ ہی ہے اور اس مناسبت سے شیلا کی جوانی والی بات درست اور قابلِ فہم ہے لیکن 40 سال سے اوپر ہو کر ''نوجوان فلسفی'' کی یہ کمال کی فلسفیانہ نوجوانی ہے۔فلسفی بن بیٹھنے پر بات بعد میں، پہلے شعبۂ تعلیم سے ان کی وابستگی کی حقیقت بھی بتادی جائے۔''ذہنِ جدید'' میں چھپنے کی تاریخ تک آپ کہیں بھی نہ لیکچرر ہیں، نہ ٹیچر ہیں حتیٰ کہ کسی پرائمری اسکول میں بھی نہیں پڑھا رہے۔اگر پرائمری اسکول کے طالب علموں سے لے کر کالج کے سٹوڈنٹس تک کو بطور طالب علم شعبۂ تعلیم سے وابستہ سمجھ لیا جائے تو ہمارے نوجوان فلسفی ابھی اس نوعیت کی بھی کوئی وابستگی نہیں رکھتے۔ڈبل ایم اے کر کے بیکار پھر رہے ہیں۔انٹرنیشنل براڈ کاسٹ جرنلزم میں ایم اے کیا ہوا ہے۔اس وقت دنیا بھر میں نئے نئے چینل کھل رہے ہیں لیکن افسوس ہمارے فلسفی کو ابھی تک اس شعبہ میں جاب نہیں مل سکی۔اسی طرح انگلش لٹریری سٹڈیز میں ایم اے کر کے انہیں کوئی لیکچررشپ یا ٹیچنگ جاب بھی نہیں مل سکی تو اس سے بڑھتی ہوئی بے روزگاری کا اندازہ ہوتا ہے اور افسوس ہوتا ہے۔لیکن جب ایسا کچھ نہیں ہے تو جھوٹ بتا کر اور جعل سازی سے کام لے کر کیوں اپنا جعلی تاثر قائم کر رہے ہیں؟

اور اب فلسفی بن بیٹھنے کا معاملہ!

مجھے عمران بھنڈرا اپنے تعارف کے طور پر جو کچھ لکھ کر بھیجتے رہے اس میں بہت سارا جھوٹ شامل تھا جو بعد میں ظاہر ہوا۔میں شروع میں شمارہ نمبر 9 اور 10 میں دیئے گئے ان کے تعارف کے حوالے سے ذکر کر چکا ہوں۔2007ء میں ان کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق **Postmodern Literary Theory** کے موضوع پر موصوف پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔نظام صدیقی نے اس بات کا مذاق اڑایا ہے کہ عمران بھنڈرا ابھی تک پی ایچ ڈی نہیں کر سکے،جبکہ ہمارے ساتھ مذاق یہ ہوا ہے کہ موصوف تو ابھی تک پی ایچ ڈی شروع ہی نہیں کر سکے۔انہوں نے جھوٹی اطلاع فراہم کی تھی۔ابھی تک ان کی پی ایچ ڈی کی رجسٹریشن ہی نہیں ہوئی۔سو ابھی تک،اس وقت تک موصوف کسی قسم کی کوئی پی ایچ ڈی نہیں کر رہے۔ایم اے کے سلسلہ میں جدید ادب شمارہ 10 میں ان کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق ''2004ء میں یونیورسٹی آف سینٹرل انگلینڈ، برمنگھم سے ''انٹرنیشنل براڈ کاسٹ جرنلزم'' میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد 2006ء میں انہوں نے اسی یونیورسٹی سے ''انگلش لٹریری سٹڈیز'' میں ایم اے کی دوسری ڈگری حاصل کی۔'' سو ایم اے سے آگے ابھی موصوف نے کچھ نہیں کیا۔بس ''دس جماعت پاس ڈائریکٹ حوالدار'' کی طرح ایم اے کر کے ''ڈائریکٹ فلسفی'' ہو گئے ہیں۔ M.A. English Studies کو اردو

میں ''ایم اے فلسفۂ انگریزی ادب'' کر کے وہ فلسفی بن سکتے ہیں تو پھر دنیا کا ہر ایم ایس سی سائنس دان ہے اور M.A. English Studies کرنے والا ہر طالب علم فلسفی۔موصوف کے فلسفی بن بیٹھنے سے بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ایک تو اپنے بزرگوں سے سنے ہوئے ایک معروف کردار ''بابا فلاسفر'' کے کئی جملے اور دلچسپ واقعات۔برمنگھم میں بھی کچھ دوست ایسے موجود ہیں جو'' نوجوان فلسفی'' عمران بھنڈر کو بابا فلاسفر کے گفتنی و ناگفتنی قصے سنا سکتے ہیں۔دوسرا اس نوجوان فلسفی کے برمنگھم یونیورسٹی میں استاد ڈاکٹر ڈیرک لٹل ووڈ کے وہ تاثرات یاد آ رہے ہیں جو انہوں نے میرے افسانوں پر رائے دیتے ہوئے لکھے تھے۔''نوجوان فلسفی'' کے استاد لکھتے ہیں:

Haider Qureshi's splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation. Qureshi is a philosophical story teller who ranges from the Ramayana to ecological fables and reflections on the experience of immigrant workers in Germany.His is a singular voice which deserves a wider audience. These stories are thoughtful and full of interest.

Dr. Derek Littlewood (Birmingham, ENGLAND.)

ڈاکٹر ڈیرک کے تاثرات سے مجھے خوشی ضرور ہوئی لیکن میں کسی ایسے خبط کا شکار نہیں ہوا کہ خود کو فلسفی افسانہ نگار سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہو جاؤں۔زندگی میں جو کچھ پڑھا ہے اس کے جو مختلف اثرات خود پر مرتسم ہوئے ہیں، جہاں جہاں داخلی طلب سامنے آئی ان کا اظہار ممکنہ حد تک سلیقے سے کر دیا۔1983ء میں شائع شدہ میرا افسانہ ''روشنی کی بشارت'' نطشے کی تمثیل کے ایک اقتباس سے شروع ہوتا ہے اور اس افسانہ میں میری طرف سے نطشے کے مشہور اعلان کو باطل ثابت کیا گیا ہے۔لیکن یہ سب کچھ نہ کسی مولویانہ طریق سے کیا ہے نہ کسی نوجوانی سے بھرپور فلسفیانہ طریقے سے۔بس اپنی حیثیت کے مطابق جتنی تخلیقی حد تھی اسی کے مطابق ایک افسانہ تخلیق کر دیا۔ادب کی دنیا میں ہر لکھنے والے کے اپنے مطالعہ، مشاہدہ اور تجربات کی اپنی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔مشاہدات اور تجربات کے وسیع جہان ہیں تو مطالعہ کا جہان بھی بہت وسیع ہے۔مطالعہ کے دائرہ میں ادب، مذہب (اپنے وسیع تر مفہوم میں)، سائنس (فلسفہ اسی کی ایک شاخ ہے)، تاریخ، اقتصادیات وغیرہا کا ایک ایسا جہان ہے جس میں کئی جہان آباد ہیں۔اب کون کس حد تک کس خطہ تک جاتا ہے، یہ اس کے مزاج اور دلچسپی پر منحصر ہے۔لیکن کسی ایک یا ایک سے زائد جہانوں کی سیاحت کرنے والا اپنے ''حاصل سیاحت'' کی بنا پر کسی دوسرے کی سیاحت اور سفر کو کھوٹا قرار نہیں دے سکتا۔ہر کسی کا اپنا اپنا ادبی سفر ہے اور اس سفر کا حاصل وہ تحاریر ہیں جو لکھنے والے نے ادبی دنیا کے سامنے پیش کر دی ہیں۔لیکن کسی ایک خطے کی سیر کرنے والے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس دیار میں نہ آنے والوں پر یا اس کے بارے میں جانکاری نہ رکھنے والوں پر زبانِ طعن دراز کرے۔

فلسفہ فی ذاتہ سائنس کے مختلف علوم میں سے ایک ہے۔تصوف، تاریخ، نفسیات، طبیعات، اقتصادیات، فلسفہ ۔۔۔۔کوئی ادیب ان سے اور ایسے ہی دیگر علوم سے تھوڑا بہت بہرہ ور ہے اور اس کے اثرات اس کی تخلیقات میں دکھائی دیتے ہیں تو یہ اس کی اضافی خوبی ہے۔لیکن اگر کوئی ان میں سے کسی میں دلچسپی رکھتا ہے کسی میں دلچسپی نہیں

رکھتا تو یہ اس کی ترجیحات کا معاملہ ہے۔کسی شعبہ سے عدم دلچسپی کو ادب کے دیار میں لاعلمی قرار دے کر جہالت سے جوڑنا بجائے خود ایک جاہلانہ رویہ ہے۔اگر کوئی صوفیانہ خیالات کا تخلیقی اظہار کرتا ہے اور تصوف کے علم کی کتابیں لکھنے والے کوئی صاحب مقاماتِ تصوف کی اشکال وتشریحات میں بحث کو الجھانا چاہیں تو اس کا ادب سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔کوئی شاعری میں حساب کتاب کی بات کرے اور اقتصادیات کا کوئی طالب علم اس پر ٹیکنیکل اعتراض شروع کر دے اور پھر یہ طعنہ زنی کر دے کہ اسے تو اقتصادیات کی مبادیات کا بھی علم نہیں۔جی ڈی پی کی شرح کا پتہ تک نہیں ہے تو اس نے حساب کے علم کو کیوں مَس کیا۔غالبؔ کی ایک ہی غزل میں دو مختلف جہانوں کی سیاحت موجود ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں؟　　　ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

ایک شعر میں تصوف کی دنیا موجود ہے تو دوسرے شعر میں سائنس کے سوال اٹھائے گئے ہیں۔اب کوئی مولانا جیسا بندہ تصوف اور سائنس کی دنیاؤں میں ہوتا تو یہاں بھی اعتراض کرتا کہ غالب کو نہ تو صوفیانہ تجربہ ہوا نہ ہی انہیں جملہ گیسز اور پانی کا فارمولا تک معلوم تھا۔پھر وہ کیوں بلاوجہ اس قسم کے شعر کہہ رہے ہیں۔

یہ حقیقت ہے اور آن ریکارڈ ہے کہ عمران بھنڈر کے ہاں مابعد جدیدیت کا نصابی نوعیت کا کچا پکا مطالعہ ہی بکھرا ہوا ہے۔اردو تنقید میں کسی فن پارے کی تفہیم کے انہوں نے کوئی اچھے نمونے پیش نہیں کیے۔اقبال کی نظم کا ایسا فضول مطالعہ پیش کیا جسے شمیم طارق نے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ایک تقریب میں فیض احمد فیض پر مضمون پڑھ آئے اور بعد میں فیض کے اشعار ڈھونڈ کر مضمون میں فٹ کرتے رہے۔یہ تنقید نہیں ہوتی ''منجی پیڑھی ٹھکالو''قسم کی مضمون نگاری ہوتی ہے۔اور تو اور مغربی تنقید کے بارے میں بھی ان کی معلومات کا دائرہ بالکل محدود ہے۔مغربی تنقید کے پس منظر اور اس کے مختلف ادوار کے حوالے سے انہوں نے کوئی قابلِ ذکر معلومات تک فراہم نہیں کی۔بس اپنی نصابی حد کے ''کنویں'' کے اندر نصابی علم وفضل کی موٹر سائیکل چلا کر کرتب دکھا رہے ہیں اور اسی کو سب کچھ سمجھ کر پوری اردو دنیا کو لعنت ملامت بھی کیے جا رہے ہیں۔ریکارڈ میں لانے کے لیے بتا دوں کہ عمران شاہد بھنڈر کے نام سے سب سے پہلا مضمون لندن کے ایک مقامی اخبار میں 27/جنوری 2005ء میں شائع ہوا تھا۔اس مضمون کے عنوان سے عمران کی نفسیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔یہ منصور آفاق کے ساتھ کسی اختلاف کی بنا پر لکھا گیا مضمون تھا،اور ان کے نام میں آفاق کی مناسبت سے انہیں ''فاقے'' کے نام سے للکارتے ہوئے ''کم آن فاقے'' کے زیر عنوان شائع کیا گیا تھا۔مجھے یہ مضمون رابطہ ہونے کے بعد موصوف نے بھیجا تھا۔میرا آج تک منصور آفاق سے کسی نوعیت کا رابطہ نہیں رہا،اس کے باوجود میں نے عمران بھنڈر کو شروع میں ہی کہا تھا کہ یہ عنوان بہت ہی نامناسب ہے۔اور اس سے مضمون نگار کے بارے میں کوئی اچھا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔کسی اور شخصیت کے ساتھ ایک بار اسی مضمون کے بارے میں بات ہوئی تو میں نے کہا تھا کہ عنوان سے ہی ایسا لگتا ہے جیسے گوجرانوالہ کا کوئی پہلوان لنگر لنگوٹ کے بغیر دھوتی کے ساتھ اکھاڑے میں اتر آیا ہو اور دھوتی کو آدھا اوپر

کر کے، لنگوٹ جیسا باندھ کر اپنے مخالف کو للکار رہا ہو۔اس میں ادب والی کوئی بات نہیں ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ پہلے مضمون کے عنوان سے لے کر اب تک کے ان کے مستعار افکار تک میں یہی پہلوان گیری کا انداز نمایاں ہے۔

پہلوان گیری کے ساتھ خوشامدانہ توصیف میں غیر معمولی انداز اختیار کر جانا بھی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔انگلینڈ کے ایک مقامی اخبار کی 31 مارچ 2006ء کی اشاعت میں انور مغل کے بارے میں مضمون میں لکھتے ہیں:''گزشتہ دنوں زندگی اور موت کی پیکار میں برمنگھم کی ایک عظیم علمی وادبی اور سماجی شخصیت موت کو کچھ ایسے ہی انداز میں شکست دینے میں کامیاب ہوئی۔۔۔''۔اہلِ ادب بخوبی جانتے ہیں کہ عمران بھنڈر کے ممدوح کیسی ''عظیم علمی وادبی'' شخصیت ہیں۔اس لطفِ ارزانی پر اب کیا کہا جا سکتا ہے۔

اگر انہیں ادب کی تفہیم کا اوسط درجہ کا شعور بھی نصیب ہے تو وہ اردو کے کلاسیکی ادب سے لے کر اب تک کے ادوار میں سے نظم ونثر کا کچھ ایسا انتخاب کر لیں جو ان کے نزدیک عمدہ ادب میں شمار ہوتا ہو۔پھر ان منتخب تخلیقات کا ادبی مطالعہ پیش کریں اور اس انداز سے پیش کریں کہ اردو ناقدین کی بازگشت معلوم نہ ہو۔ان کی تنقید نگاری کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔بطور نقاد ان کی حیثیت کا تعین بھی کسی نہ کسی حد تک ہو ہی جائے گا۔ورنہ اپنی نصابی حدود میں مابعد جدید فکر کی کچی پکی تشریحات پیش کر کے آپ فلسفی تو کیا اردو کے اچھے نقاد بھی نہیں کہلا سکتے۔احتشام حسین سے لے کر محمد علی صدیقی تک ترقی پسند نقادوں نے تنقید کے نام پر جو کچھ لکھا ان سے اختلاف کی کتنی ہی گنجائشیں ہوں لیکن ان سب کا ادب کی فہم کا اپنا اپنا ایک معیار تھا۔عمران بھنڈر کا المیہ یہ ہے کہ ان کے پلے ابھی تک اردو ادب کی فہم کے حوالے سے کچھ بھی نہیں ہے۔ان سے کہیں زیادہ تو سجاد ظہیر کے ہاں اردو ادب کی تفہیم کے بہتر معیار اور نمونے مل جاتے ہیں۔اسی لیے میں اصرار کر رہا ہوں کہ موصوف اردو ادب کا ایک اپنا پسندیدہ انتخاب کر کے ان کی تفہیم وتعبیر مضامین کی صورت میں پیش کریں۔میں ابھی سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ موصوف کیا گل کھلائیں گے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ہمارے مارکسسٹ مولانا اور بقلم خود فلسفی فی ذاتہ فلسفہ سے کس حد تک واقف ہیں۔چونکہ انہوں نے ایم اے کا مختصر مقالہ کانٹ کے حوالے سے لکھا تھا سو ان کی اب تک کی تحریریں اٹھا کر دیکھ لیں۔کانٹ سے بات شروع ہوگی، ہیگل سے ہوتی ہوئی مارکس تک آئے گی۔(اپنے فائنل مقالہ کی مناسبت سے بیسویں صدی کی روسی تنقید کے کچھ اشارے بھی دیتے جائیں گے) وہاں سے دریدا تک پہنچیں گے اور پھر اردو ادب کے خلاف دریدہ دہنی شروع کر دیں گے۔دریدہ دہنی کی صرف ایک مثال:

''اردو دنیا کے ادباء کی اکثریت بد دیانتی، بداخلاقی اور بے ہودگی کے حصار میں ہے۔''

کیا شاہانہ انداز ہے! قہر برپا کریں تو اردو ادباء کی اکثریت کو بد دیانت، بداخلاق اور بے ہودہ قرار دے دیں اور لطفِ ارزانی پر آئیں تو امین مغل صاحب عظیم علمی وادبی شخصیت قرار پا جائیں۔

مولانا نے اردو والوں کے بارے میں دعویٰ فرمایا ہے کہ

''یہ لوگ فلسفۂ جدیدیت کو نہیں سمجھ سکے تو مابعد جدیدیت ان کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے۔''

اس دماغی فتور پر موصوف کے ساتھ کسی قسم کی بحث کرنا وقت کا زیاں ہے لیکن انہیں ایک مشورہ ضرور دینا ہے کہ فلسفی بھائی صاحب! اردو دنیا تو بہت بری اور بے خبر ہے، آپ اپنی یہی شاہکار کتاب انگریزی میں ترجمہ کریں اور مغربی دنیا کے سامنے پیش کریں تا کہ اہلِ مغرب کو علم ہو کہ آپ جیسے بقلم خود فلسفی نے فلسفۂ مابعد جدیدیت میں کیا گراں قدر اضافے کیے ہیں۔اور انہیں اندازہ ہو کہ ان کے درمیان ایک فلسفی پیدا ہو چکا ہے۔جب موصوف نے اردو کتاب چھاپنے کا ارادہ کیا تھا تو ان کے والد صاحب نے افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ تمہیں انگلینڈ میں اردو کا ادیب بننے کے لیے بھیجا تھا؟۔سو جب وہ اپنی اسی کتاب کو انگریزی میں شائع کریں گے تو جہاں مغربی دنیا کو ایک نئے فلسفی کی بشارت ملے گی وہیں ان کے بزرگ بھی کچھ مطمئن ہو جائیں گے کہ چلو جو کچھ بھی لکھ رہا ہے انگریزی میں تو ہے۔

اردو کی حد تک عمران شاہد بھنڈر کا ایک ہی ادبی حوالہ ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے ترجمہ بلا حوالہ کو نشان زد کیا۔ یہ ادبی حوالہ پاکستان پوسٹ اور نیرنگِ خیال کے سالنامہ میں چھپا تو مضمون اور مضمون نگار دونوں ہی ان شماروں میں دفن ہو کر رہ گئے۔''جدید ادب'' نے اس مسئلہ کو جھاڑ پونچھ کر ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا تو اس کے بعد ادبی دنیا اس سے آگاہ ہوئی۔تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس معاملہ کو نارنگ صاحب کے نادان دوستوں نے غیر ضروری طول نہ دیا ہوتا تو بات پہلے مضمون کے ساتھ ہی ختم تھی۔اب جبکہ جنگ و جدل والی فضا نہیں ہے تو علمی و ادبی لحاظ سے مناسب ہوگا کہ اس سارے قضیہ کو اکیلے نارنگ صاحب پر فوکس کر کے دیکھنے کی بجائے ان سارے نقادوں کے تراجم بلا حوالہ کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جائے جنہیں اردو ہی کے متعدد ادیب مختلف اوقات میں نشان زد کرتے رہے ہیں۔جن کا ایک بڑا حصہ ڈاکٹر نذر خلیق اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں یکجا کر چکے ہیں اور ان سے بھی آگے جا کر بیس سے زائد نئے پرانے نقادوں کے تراجم بلا حوالہ کو ڈاکٹر ناصر عباس نیر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ میں نشان زد کر چکے ہیں۔سارے چھوٹے بڑے نام یکجا کر کے اور سب کے استفادہ شدہ اقتباسات کو سامنے رکھ کر پھر جو مجموعی فیصلہ کیا جائے بجا ہوگا۔کسی نام پر خاموشی، کسی نام پر معذرت خواہانہ رویہ، کسی کے لیے استثنیٰ اور کسی کو ملامت یہ منافقت نہیں چلے گی۔میری جو معرکہ آرائی ہوتی رہی ہے وہ نارنگ صاحب کے نادان دوستوں کی وجہ سے ہوئی ہے ورنہ علمی سطح پر جو نشان دہی ہونا تھی وہ ہو چکی۔اور تاریخ کے سپرد بھی ہو چکی۔سرقہ یا ترجمہ بلا حوالہ کی نشان دہی کے موضوع پر اردو میں مجموعی طور پر جو ڈھیروں ڈھیر کام ہو چکا ہے، اس کے مجموعی تناظر میں ہی عمران شاہد بھنڈر کی صرف ایک نقاد کے بارے میں نشان دہی کو جانچا جائے گا اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے گا۔سو عمران بھنڈر کا یہ کام حقیقتاً بہت ہی جزوی نوعیت کا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی سے لے کر بعض انگریزی/اردو اخبارات میں چھپنے والے تبصروں تک میں تبصرہ نگاروں نے عمران کی کتاب پر لکھتے ہوئے ان کے ''ترجمہ بلا حوالہ'' کے کام کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

عمران بھنڈر کے واحد کام ''ترجمہ بلا حوالہ'' کی نشان دہی کو بھی اب شاید پہلے جیسی اہمیت نہ ملے، کیونکہ وہ خود بھی ترجمہ بلا حوالہ کا ارتکاب کر چکے ہیں۔اگر ان کے نزدیک یہ سرقہ ہے تو کیوں ہے؟۔سرقہ نہیں ہے تو کیا

ہے؟ یہاں ایک وضاحت کو دہرا دوں کہ میری انگریزی کا خانہ خالی ہے اور میں نے اس بات کو کبھی نہیں چھپایا۔تاہم عمران بھنڈر کے ایک سرقہ کو نشان زد کرنے کے لیے میں نے جی کڑا کر کے نہ صرف انگریزی کے متعلقہ مضامین تلاش کر کے پڑھ ڈالے بلکہ اس سلسلہ میں عمران کے برمنگھم یونیورسٹی میں استاد ڈیرک لٹل ووڈ سے برقی خط و کتابت کر کے شواہد تک رسائی حاصل کر لی۔انگریزی مطالعہ کے اس دلچسپ تجربے کے دوران مجھے 1972ء کا زمانہ یاد آ گیا جب اپنے بی اے کے امتحان کے لیے میں زور و شور سے اپنی ڈھیلی ڈھالی انگریزی کی تیاری کر رہا تھا۔خیر بات ہو رہی تھی عمران بھنڈر کے سرقہ یا ترجمہ بلا حوالہ کی۔

رولاں بارت کا ایک مضمون Soap-powders and Detergents پچاس کی دہائی میں اخبار میں چھپا تھا جو بعد میں ان کی کتاب Mythologies میں شامل کیا گیا۔اس پر Catherine Belsey نے اپنی کتاب Poststructuralism: A Very Short Introduction میں تبصرہ کرتے ہوئے جو نکتہ ابھارا تھا، کیتھرین بیلسی کے اسی نکتہ کو عمران شاہد بھنڈر نے اپنے افکارِ عالیہ کے طور پر پیش کر دیا ہے۔پہلے رولاں بارت کے بارے میں عمران شاہد بھنڈر کا ترجمہ بلا حوالہ یا سرقہ کردہ ایک اقتباس دیکھ لیں:

''اپنے ایک اور مضمون Soap-powders and Detergents میں فرانسیسی معاشرے کی ایک انتہائی بنیادی نفسیاتی سرگرمی کو بورژوا آئیڈیالوجی کے ہاتھوں عجیب طریقے سے فطرت میں بدلتے ہوئے دیکھتا ہے۔۔۔بارت نے یہ دکھایا ہے کہ فرانسیسی گھروں میں جراثیم کو مارنے اور معروض کو ماحولیاتی گندگی سے الگ کرنے کے لیے کس طرح پاؤڈر اور ڈیٹرجنٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔۔بورژوا حکمران اس عمل کو آفاقی سطح پر استوار کرتا ہے۔وہ تیسری دنیا کے ان لوگوں کو جو خوراک کی کمی کی وجہ سے بدصورت بن چکے ہیں، انہیں اپنی جلد پر لگی ہوئی گندگی کی مانند تصور کرتا ہے۔جس کو مٹایا جانا معاشرتی حسن کے لیے از حد ضروری ہے۔''(مضمون ''ادبی نقاد رولاں بارتھ کی 'مائیتھالوجی' میں آئیڈیالوجی'' از عمران شاہد بھنڈر۔مطبوعہ ''دی نیشن''۔لندن۔22/مارچ 2007ء)

اس مضمون میں عمران نے بارت کے متن کو خوب مسخ کیا ہے۔پہلی بات تو یہ صاف محسوس ہوتی ہے کہ عمران بھنڈر نے بارت کی کتاب Mythologies میں شامل مضمون Soap-powders and Detergents کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔وگرنہ وہ یہ نہ لکھتے کہ ''اپنے ایک اور۔۔۔۔فطرت میں بدلتے ہوئے دیکھتا ہے۔''

بارت نے اس مضمون کا آغاز ستمبر 1954ء میں پیرس میں ہونے والی پہلی ورلڈ ڈیٹرجنٹ کانفرنس کے ذکر سے کیا ہے، جس کے بعد پاؤڈر اور ڈیٹرجنٹ کے اشتہارات نہایت کثرت سے سامنے آئے۔اب وہ فرانسیسی معاشرے میں اس حد تک رائج ہو گئے ہیں کہ ان کا نفسیاتی تحلیلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔بارت کے اصل اقتباس کا انگریزی ترجمہ دیکھیے:

These products have been in the last few years the object of such massive advertising that they now belong to a region of French daily life which the various types of psycho-analysis would do well to pay some attention to if they wish to keep up date.

اصل میں عمران بھنڈر نے کیتھرین بیلسی کی تعارفی نوعیت کی کتاب Poststructuralism: A Very Short Introduction پر ہاتھ صاف کیا ہے۔اور خاصی صفائی سے کام لیا ہے(آخر سوپ پاؤڈر اور ڈیٹرجنٹ کا معاملہ تھا!)اس پیراگراف کا پہلا جملہ بیلسی کی کتاب کے صفحہ 31 کے بعض جملوں کا چربہ اور سرقہ ہے: دیکھیے :

Because the form of ownership that determines the nature of our society is bourgeois, Barthes says, and it is the particular property of bourgeois ideology to efface itself.

جہاں تک آئیڈیالوجی کے فطرت میں بدلنے کا ذکر ہے تو آپ بیلسی ہی کا وہ جملہ پڑھ لیں جو متھ کے فطرت میں بدلنے سے متعلق ہے جسے ہمارے ''نوجوان فلسفی'' نے آئیڈیالوجی سے بدل دیا ہے۔جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

Myth,Barthes explains, converts histroy into nature .P 31

نتیجہ یہ ہے کہ اصل بات کچھ کی کچھ بن گئی ہے۔

اسی طرح عمران بھنڈر کہتے ہیں کہ ''بارت نے یہ دکھایا ہے کہ فرانسیسی گھروں میں جراثیم کو مارنے اور معروض کو ماحولیاتی گندگی سے الگ کرنے کے لیے کس طرح پاؤڈر اور ڈیٹرجنٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔''

کسی متن کو مسخ کرنے کی اتنی سفاکانہ مثال شاید ہی کوئی ہو؟ بیلسی بے چاری نے واضح کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ ''مارنے'' اور ''الگ'' کرنے میں فرق پیش نظر رہے مگر عمران بھنڈر اگر ان نازک علمی مسائل کی تفہیم کا ملکہ رکھتے اور ان سب باتوں کو انگریزی میں لکھتے تو آج مغربی دنیا میں ان کے نام کا ڈنکا بج رہا ہوتا۔خیر، پہلے بارت اور پھر اس کے خیالات کا خلاصہ کیتھرین کی زبانی سنیے:

Chlorinated fluids, for instance, have always been experienced as assort of liquid fire, the action of which must be carefully estimated; otherwise the object itself would be affected, 'burnt'. The implicit legend of this type of product rests on the idea of a violent, abrasive modification of matter: the connotations are of a chemical or mutilating type: the product 'kills' the dirt. Powders, on the contrary, are separating agents: their ideal role is to liberate the object from its circumstantial imperfection: dirt is 'forced out' and no longer killed; in the Omo imagery, dirt is a diminutive enemy, stunted and black, which takes to its heels from the fine immaculate linen at the sole threat of the judgment of Omo

(Roland Barthes, Mythologies,Translated by Annette Lavers, 1972(1957), The Noondaz Press,New York)

بارت کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پاؤڈر اور ڈیٹرجنٹ، Chlorinated fluids کے برعکس، ''مارتے'' نہیں، معروض (یعنی کپڑے) کو اس پر لگے داغ سے آزاد اور الگ کرتے ہیں۔دیکھیے بیلسی کیا کہتی ہے۔

Traditional domestic cleaning products that use bleach or ammonia 'make war' on germs , or 'kill' dirt. By contrast what was new in the imagery of household detergents available for the first time just after the Second World War, was that they separated the dirt from the fabric decisively but wothout 'violence'..Their ideal role is to liberate the object from its circumstantial imperfection', Roland Barthes proposes,..

(Catherine Belsey, Poststructuralism Avery Short Introduction, 2002, Oxford Universty Press, London)

عمران بھنڈر کے اقتباس کا آخری جملہ ان کا اپنا اخذ کیا ہوا نتیجہ ہے۔بارت نے فقط فرانسیسی معاشرے میں بورژوا طبقے کا ذکر کیا ہے اور ظاہر ہے یہ مارکسی اصطلاح ہے اور مارکسی مفہوم ہی میں ہے۔بیلسی کے مطابق بارت خود مارکسی نہیں تھا مگر پیرس میں دوسری جنگ عظیم کے بعد سرد جنگ کے اُس زمانہ میں کسی دانشور کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ مارکسیت کو ملحوظ رکھے بغیر بات کر سکے۔

یہاں برمنگھم یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے استاد Dr. Derek Littlewood جو عمران بھنڈر کے بھی استاد رہے ہیں، ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔اس اقتباس کی تلاش کے سلسلے میں انہوں نے ہی کیتھرین بیلسی کی طرف رہنمائی کی، وگرنہ میں جولیا کرسٹیوا میں الجھا ہوا تھا۔جولیا کرسٹیوا کی علمی سطح بہت بلند ہے جبکہ کیتھرین بیلسی کی مذکورہ کتاب انڈر گریجوایٹ یا گریجوایٹ لیول کی چیز ہے۔اور عمران بھنڈر کی دوڑ بھی نصابی حدود یا انٹرنیٹ پر باآسانی دستیاب مواد تک ہی ہے۔میرے استفسار پر ڈاکٹر ڈیرک لٹل ووڈ کی طرف سے 7/جولائی 2011ء کو جو ای میل آئی اس کا ایک حصہ بھی یہاں درج کر دیتا ہوں۔

Dear Haider,

It sounds more like Catherine Belsey than Julia Kristeva. But I imagine that it is a paraphrase rather than the actual words. You would be able to read Roland Barthes for yourself, perhaps. 'Soap Powder and Detergent' is a newspaper article from the 1950s reprinted in Barthes's book Mythologies,

My best wishes Derek

یہ میں نے صرف اپنے ''نوجوان فلسفی'' عمران شاہد بھنڈر کے ایک مضمون کے ایک اقتباس کا سرقہ نشان زد کیا ہے اور اس پر اپنی غیر فلسفیانہ سوجھ بوجھ کے مطابق تھوڑی سی علمی بات کی ہے۔اگر انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے والے اہلِ ادب دلچسپی لیں تو عمران شاہد کی پوری کتاب سے ایسے بلاحوالہ ترجمہ کی متعدد مثالیں اور نوجوانی سے بھرپور ''فلسفیانہ'' مضحکہ خیزیاں سامنے لائی جا سکتی ہیں۔اگر ہمارے ''نوجوان فلسفی'' نے ایسی ہیرا پھیریاں نہیں کیں تو اپنی بات کو پھر دہراتا ہوں کہ اپنی کتاب کے پاکستانی ایڈیشن کو من وعن انگریزی میں ترجمہ کر کے منظرِ عام پر لائیں۔انگریزی ادب والے یا تو ان کی قدر کرتے ہوئے ایک نئے اور نوجوان فلسفی کے ظہور پر خوشی کا اظہار کریں گے، یا پھر خود ہی ان سے نمٹ لیں گے۔

خلاصۂ کلام:

ا۔عمران شاہد بھنڈر نے 2007ء میں اپنے آپ کو پی ایچ ڈی کا سکالر بتایا، پی ایچ ڈی کے موضوع **Postmodern Literary Theory** تک کو چھپوا کر اردو دنیا کو دھوکہ دیا، جعل سازی سے کام لیا، اپنے جعلی علم کا رعب قائم کرنے کی کوشش کی۔جبکہ 2007ء سے لے کر جون 2011ء تک، انہوں نے پی ایچ ڈی کرنا تو درکنار ابھی تک رجسٹریشن بھی نہیں کرائی۔یہ ادبی دنیا کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔واضح جعل سازی ہے۔

۲۔خود کو شعبۂ تعلیم سے وابستہ کہنا بھی جعل سازی اور دھوکہ دہی ہے۔اس وقت تو شعبۂ تعلیم سے اس حد تک بھی وابستہ نہیں جتنا پرائمری کلاس کے کسی طالب علم سے لے کر کالج تک کا کوئی طالب علم بطور طالب علم وابستہ ہوسکتا ہے۔جبکہ شعبۂ تعلیم سے وہ اپنی وابستگی تو ایسے ظاہر کر رہے ہیں جیسے کہیں لیکچرر یا پروفیسر لگے ہوئے ہوں۔کیا وہ ایسے جعلی تعارف کے بغیر خود کو معزز محسوس نہیں کرتے ؟

۳۔خود کو بقلم خود اور بزبان خود ''نوجوان فلسفی'' کہلوانا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔عمران بھنڈر مابعد جدیدیت کی درسی نوعیت کی طالب علمانہ تشریحات سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے۔اس میں بھی ان کا مطالعہ غیر ہضم شدہ ہے اور اس غیر ہضم شدہ کے اثرات جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔فلسفی کے لیے جس میلان اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں سرے سے موجود نہیں۔اسی لیے شدت سے کہتا ہوں کہ موصوف اپنی یہ بچکانہ کتاب انگریزی میں چھپوائیں، مغربی دنیا کو بھی اس فلسفیانہ تماشے کا اندازہ ہو جائے گا۔اور اگر ہمیں اپنے ''نابغہ'' کو شناخت کرنے میں غلط فہمی ہو رہی ہے تو یہ بھی دور ہو جائے گی۔ورنہ ہمارے فلسفی بھائی کی خوش فہمی تو ختم ہو گی۔

۴۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ترجمہ بلا حوالہ کا معاملہ ادب کی تاریخ کے حوالے ہو چکا۔عمران کا یہی ایک کام ہے جس کا تھوڑا بہت ذکر کیا جا سکے گا۔ان کے اس کام کو بھی ان دوسرے بہتر نقادوں اور دانشوروں کے کام کے تناظر میں ہی دیکھا جا سکے گا جو متعدد ادیبوں کے ترجمہ بلا حوالہ کی نشان دہی کر چکے ہیں۔اور انہوں نے ایسی نشان دہی کر کے کوئی اچھل کود بھی نہیں کی۔یوں ایک مجموعی کارکردگی میں عمران بھنڈر پچاس یا سو ادیبوں کے ترجمہ بلا حوالہ کی نشان دہی کیے جانے کا ایک پرسنٹ ہی داد سمیٹ پائیں گے۔اس داد پر جتنا خوش ہو سکتے ہیں، ہوتے رہیں۔

۵۔عمران شاہد خود بھی کاری گری کے ساتھ سرقات کا ارتکاب کر چکے ہیں۔اس سلسلہ میں ایک ثبوت پیش کر دیا گیا ہے۔

۶۔''نوجوان فلسفی'' ادب میں تخلیقی صلاحیت سے تو یکسر عاری ہیں، ان کی ادب فہمی پر بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔جب تک وہ اردو ادب کا قدیم سے جدید تک ایک عمدہ انتخاب کر کے، تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کر کے اپنی ادب فہمی کا ثبوت نہیں دیتے، وہ اس معاملہ میں ادبی طور پر خالی ہاتھ ہیں۔ادب میں ان کی حیثیت ایک درانداز سے زیادہ کچھ نہیں۔(تحریر کردہ ۱۱/جولائی ۲۰۱۱ء)

(مطبوعہ روزنامہ **عکاس** کولکاتا، انڈیا۔۲۴/جولائی ۲۰۱۱ء)

(روزنامہ **افکار جہاں** گوجرانوالا ۴/اگست اور ۶/اگست ۲۰۱۱ء)

(مطبوعہ **عکاس انٹر نیشنل** اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۱۴۔ستمبر ۲۰۱۱ء)

ردِ عمل

اس مضمون پر بڑے پیمانے پر ردِ عمل موصول ہو رہا ہے۔چند اہم ترین تاثرات میں سے مختصر سا انتخاب یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔تفصیلی تاثرات الگ سے یکجا کیے جا رہے ہیں۔ **حیدر قریشی**

''ذہنِ جدید'' میں بھنڈر صاحب کو ''نوجوان فلسفی'' کہا گیا تھا، یہ بات میری نظر سے نہ گزری تھی۔کاتا اور لے دوڑی اسے کہتے ہیں۔آپ نے بھنڈر صاحب کی خوب خبر لی ہے------یہ بات بالکل صحیح ہے کہ نارنگ کے سرقوں کو آشکار کرنے کے سوا بھنڈر کا کوئی کام کسی خاص قدر کا حامل نہیں۔جب ان کی کتاب مجھے ملی تھی تو میں نے کسی کو لکھا تھا کہ اس میں نارنگ کے خلاف جو کچھ ہے اس کے علاوہ باقی معمولی اور ژولیدہ بیانی کا شکار ہے۔اشعر نجمی نے جب ان کا مضمون چھاپا تھا تو میں نے ان سے کہا تھا کہ بھنڈر کو زیادہ جگہ اب مت دو۔ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔(**۱۶ جولائی ۲۰۱۱ء**)

یقیناً آپ کے پاس بھنڈر کے خلاف اور بھی بہت کچھ ہو گا۔میں اسے نوجوان فلسفی تو کیا بوڑھا نثر نگار بھی نہیں سمجھتا۔زبیر صاحب کا مبلغ علم زیادہ نہیں، وہ اسی بات سے خوش ہو گئے ہوں گے کہ نارنگ کی پول کھولنے والا ایسا آدمی سامنے آیا جو نارنگ سے بھی زیادہ مغربی حوالے جانتا ہے۔(**۱۸ جولائی ۲۰۱۱ء**)

شمس الرحمن فاروقی (الٰہ آباد)

Thank you for sending this "ne'mat-e ghair mutaraqqiba." I read the whole article right away and felt immense pity for the man. Much as I admire your zeal in exposing such impostors, I also feel that your time is far too precious to be wasted on such non-entities. When the controversy was hot, I frequently thought of joining the fray and throw in my two-cents worth, but something prevented me. In retrospect I feel I rightly saved myself from a wasteful undertaking. But I also think that such impostors need to be exposed and cut down to their size. Somebody has to do it, even if it is wasteful, even if the culprit is a non-entity, and you are doing it. We must all be grateful to you:

سب پہ جس بار نے گرانی کی اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

But I cannot call you a "natavan."So keep on with the good work . Warmly, **m u memon**

محمد عمر میمن۔(امریکہ)

مضمون کی خبر ملنے پر: بھئی آپ نے جو بھنڈر صاحب کے بارے میں لکھا ہے، اس نے خاصا پریشان کر دیا۔ظاہر ہے کہ آپ نے جو الزام لگائے وہ بے بنیاد نہ ہوں گے۔یہ تو بہت افسوسناک بات ہوئی۔لیکن آپ نے ان کے مضامین چھاپے تھے، اس لیے یہ فرض بھی آپ پر عائد ہوتا تھا۔آپ کی دیانت داری کا یہی تقاضہ تھا۔نارنگ صاحب کے احباب کی خوشی یا ناخوشی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

مضمون پڑھنے کے بعد: مضمون پڑھا، عبرت ہوئی۔اس سے زیادہ کچھ کہنا میرے لیے مناسب نہیں۔

اردو پہ عجب آ کے براوقت پڑا ہے۔

سی ایم نعیم(امریکہ)

’’مجھے۔۔۔بھنڈر صاحب کا وہ مضمون پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے جو انھوں نے حیدر قریشی صاحب کی حقیقت بیانی سے برانگیختہ ہو کر لکھا ہے۔دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے آج کے معاشرے میں ہر شخص ’’جھوٹ‘‘ کو لے اڑتا ہے۔اور سچ سننے سے گریز کرتا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ’’ شاہ دولہ کا چوہا‘‘ بھی سر پر تاج زرنگار پہنائے جانے پر فخر کرتا ہے۔اور اپنی حقیقت کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔حیدر قریشی صاحب نے ایسے ہی لوگوں کے خلاف تیغ برّاں ہونے کا ثبوت دیا ہے۔‘‘

ڈاکٹر انور سدید(لاہور)

آپ کا مضمون پڑھ کر کسی شاعر کے یہ دو شعر یاد آ گئے۔

ٹوٹیں اگر طنابیں، رہ جائیں گے سکڑ کے — کھنچ کر بڑے ہوئے ہیں یہ آدمی ربڑ کے

شوقِ قد آوری میں ٹانگوں سے بانس باندھے — بونے بھی پھر رہے ہیں بازار میں اکڑ کے

ڈاکٹر ریاض اکبر۔(Brisbane۔آسٹریلیا)

ایک ہی نشست میں سارا مضمون بغور پڑھ لیا ہے، بہت دلچسپ اور چشم کشا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

راجہ محمد یوسف خان(جرمنی)

آپ کا فکر انگیز مضمون "فلسفی کی نو جوانی اور شیلا کی جوانی" پڑھا۔پہلے تو میں اسے ایک افسانہ سمجھا مگر پہلے جملے ہی نے مجھے پڑھنے کے لیے مستعد کر دیا۔دراصل جو لوگ دوسرے ممالک میں جاتے ہیں وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔۔۔۔۔آپ کے ممدوح کوئی پہلی مثال نہیں ہیں۔پاکستان میں تو وہ لوگ بھی بیرون ملک سے آتے ہیں جو خود کو بہت مال دار بنا کر پیش کرتے ہیں جب کہ وہاں یا تو ریلوے کے پلیٹ فارم صاف کرتے نظر آتے ہیں اور یا محض حکومت کی خیرات پر پل رہے ہوتے ہیں۔بہرصورت آپ کا مضمون چشم کشا ہے۔

خادم علی ہاشمی(ملتان)

I have studied your essay "Falsfi Ki Naujawani and Sheela Ki Jawani",in first instance I was little wondered to read the heading of the essay , however, you cleared the facts in very second line of the essay. Also here in Pakistan, some people want to become popular in one go or just over night which in my views is not possible especially in the field of literature as it demands continuous reading and writing experience spread over years and years of time period and with no definite reward and remuneration in terms of so called popularity and acceptability...........As your good self discussed, the book launching ceremony in Pakistan was perhaps held at Gujranwala Bar but I did not go , however, my one or two friends told me that nothing was said regarding modernism and post modernism in literature rather the political conditions of the country remained the topic of the discussions of the ceremony, actually only the literary associations can arrange literary dialogue and discussions.

شاہد جمیل(گوجرانوالا)

آپ کا مضمون ملا، آج پورے دن میں اسی کو پڑھا، بہت غور سے پڑھا اور پڑھ کر بہت ہی افسوس ہوا کہ اردو ادب میں کیسے کیسے لوگ کس کس طرح سے بد دیانتی کرتے ہیں۔کیسے کیسے جھوٹ کے پہاڑ کھڑے کرتے ہیں اور کیسی کیسی چوریاں کرتے ہیں اور دوسروں کی محنت پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔میں تو یہ سب کچھ سوچ کر ہی پریشان ہو جاتا ہوں۔۔۔۔آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے کیسے کیسے کانٹوں سے الجھ کر اور کیسے کیسے لوگوں سے دشمنی مول لے کر عمران شاہد جیسے لوگوں کو بے نقاب کیا ہے۔آپ کا تخلیقی اور ادارتی کام اپنی جگہ،لیکن یہ جو ادبی چوروں کو آپ بے نقاب کر رہے ہیں، یہ اپنی طرز کا الگ ہی کام ہے۔**نذیر فتح پوری**(مدیر اسباق، پونے)

آپ کی تازہ ترین تحریر’’فلسفی کی نو جوانی اور شیلا کی جوانی‘‘ پڑھی۔اگر تحریر آپ سے منسوب نہ ہوتی تو میں اس کو نظر انداز کر دیتا۔عمران شاہد بھنڈر اگر فلسفے کے طالب علم ہوتے تو انہیں اپنی طلب میں اضافہ کرتے رہنا پڑتا۔اگر وہ فلسفی کے مرتبے پر فائز ہو چکے ہیں تو اپنی طلب میں اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔اس کے بر خلاف ان کو اپنے فکری نظام کو مربوط طریقے سے دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔آپ نے اس کارِ خیر میں ان کا ہاتھ بٹانے سے اعلانیہ ہاتھ اٹھا لیا ہے۔آپ نے فیصلہ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔فلاسفر کی نو جوانی تو سمجھ میں آ رہی ہے کہ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔’’خالی چنا باجے گھنا گھنا‘‘۔کچھ عرصہ قبل آپ اس نو جوان کے ساتھ کھڑے دکھائی دیتے تھے۔اب کیا ہو گیا؟اس کا شیلا کا ہو جانا غلط ہوا، فلسفی ہونا غلط ہوا، یا اس کا سارق ہونا۔آپ چور سپاہی کا کھیل ترک کرنے والے بندے نہیں لگتے۔یہ بھی غنیمت ہے کہ ہر مرتبہ آپ سپاہی ہی بنتے ہیں۔بھنڈر نے اگر چور کا رول اختیار کر لیا تو واقعی اس نے ایک غلط کار نو جوان چور کا کام کر بھی دکھایا۔اللہ کرے جس سرقے کی جانب آپ نے اپنی تحریر میں توجہ دلائی وہ اس کا پہلا اور آخری سرقہ ہو۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ دیکھئے آپ کی

اس تحریر پر کیا ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں۔آپ نے جو کیا وہ آپ کے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔یہ آپ نے ضرور سوچا ہوگا پھر بھی آپ نے اپنے فرض سے منہ نہیں موڑا۔آپ کا یہ رویّہ لائقِ تحسین ہے۔کسی کو اچھا لگے نہ لگے مجھے بھی اوّل اوّل مشکوک سا لگا تھا، اب میں آپ کے قدر دانوں میں شامل ہوں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

آپ کا طویل مضمون پڑھا اور لطف اندوز ہوا۔آپ نے غیر شعوری طور پر بھنڈر کو زیادہ کوریج دے دی ہے۔ حالانکہ ان کا کام ’ترجمہ بلاحوالہ‘ کی حد تک ہے۔اور ان کے ’ادبی سرقہ‘ نے اس کو بھی گہنا دیا ہے۔۔۔وہ کوئی علمی شخصیت نہیں اور ’خود ساختہ نوجوان فلسفی‘ ہیں تو ان کو یہ شناخت مبارک۔علامہ اقبال پر ’تنقید‘ بھی بندے کو مشہور کر دیتی ہے۔ جناب یہ شناخت کا المیہ بندے کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔میرا خاکہ ’تیمور کی اولاد‘ بھی ایسے ہی ایک کردار کے گرد گھومتا ہے۔تاہم بھنڈر صاحب ایک دلچسپ کردار لگے ہیں۔**ڈاکٹر عبدالکریم** (مظفر آباد)

معید رشیدی نے مضمون پر چند سوالات اٹھائے تھے، (تفصیلی تاثرات میں انہیں شامل رکھا جائے گا) میں نے ان کے جواب لکھ کر بھیجے تو انہوں نے لکھا: **’’آپ کے تمام جوابات سے متفق ہوں‘‘**۔

معید رشیدی (دہلی)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں **حمیدہ معین رضوی** (لندن۔انگلینڈ)

زبردست آرٹیکل! **ڈاکٹر رضیہ اسماعیل** (برمنگھم، انگلینڈ)

زندہ باد! مزہ آ گیا۔بھنڈر کی اصلیت اب کھلنے لگی ہے۔ **قاسم یعقوب** (مدیر ’’نقاط‘‘ فیصل آباد)

کیا عمدہ ہے سر جی! واہ۔بہت اچھا لکھا ہے۔ **سلیمان جاذب**۔(دبئی)

اسلوب کا جواب نہیں، پہلے بھی نہیں تھا۔ **ترنم ریاض** (دہلی)

سب سے پہلے تو آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے ادب میں جعل سازی کے خلاف ایک کبھی نہ ختم ہونے والی مہم چلا کر کھرے اور کھوٹے کو منظر عام پر لانے کی اپنی کاوشیں جاری رکھی ہیں۔میرے نزدیک بھی یقیناً یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ادبی صحافی کی حیثیت سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینا آپ کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔کیونکہ ایک سچا صحافی ادب کا مجاہد، ادب کا پاسبان بھی ہوتا ہے۔بھنڈر کا پردہ فاش کر کے آپ

نے ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ایسے اشخاص کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانا بعض اوقات انتہائی لازمی ہو جاتا ہے۔اردو میں سرقہ وتوارد کی روایت آج کوئی نئی بات نہیں ہے۔جس طرح ایک باشعور کاشتکار اپنی کشت سے فصل کے ساتھ اگنے والے کھر پتوار کو گاہے بہ گاہے اکھاڑ پھینکتا ہے، اسی طرح ادبی صحافت کی دیانتداری کا تقاضہ ہے کہ ادب کے صحت مند اور تعمیری رویے کی پاسداری کے لیے خودرو پودوں طرح سر ابھارنے والے سرقے وتوارد کا صفایا کر دے، ورنہ ان جعل سازوں کی موجودگی میں Genuin قلم کاروں کی وقعت اثر انداز ہوتی رہے گی۔آپ کی سرزنش بروقت اور بامعنی ہے جسے کوئی بھی ذی شعور شخص نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ’’نوجوان فلسفی‘‘ پر آپ نے بھرپور قدغن لگایا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کسی کو بھی ذاتیات پر چھینٹا کشی کی اجازت نہ دی جائے۔آپ نے اپنے مضمون میں ثبوت وشواہد کی روشنی میں پورے منطقی استدلال کے ساتھ اپنی بات کو پائے تکمیل تک پہنچایا ہے۔لہٰذا، مجھے امید ہے کہ آپ کی یہ قابل تحسین کوشش کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔ بلکہ ادبی دنیا اسے پوری سنجیدگی سے پڑھنے کے بعد ہی اپنا موقف قائم کرے گی۔

ڈاکٹر پرویز شہریار (نئی دہلی)

میں نے بھی یہ مضمون دلچسپی کے ساتھ پڑھا، عنوان دلچسپ ہے مگر یہی سوچتا رہا کہ آپ نے ایک شخص کو خود ہی بانس پر چڑھایا۔۔۔۔۔آپ اتنی انرجی ایسے لوگوں اور کاموں پر کیوں ضائع کرتے ہیں۔آپ ماشاء اللہ ایک تخلیقی آدمی ہیں۔ میں نے تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بارے میں بھی اتنی شدت سے مہم چلانے کو ناپسند کیا تھا۔آپ ادب میں سرقے کی بات کرتے ہیں۔مگر یہ بہت مشکل کام ہے۔اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں جو گرفت میں بھی نہیں آسکتیں۔آپ کس کس سے لڑیں گے۔آپ نے میری ای میلز کا جواب نہیں دیا کیا ناراض ہیں؟

منشا یاد (اسلام آباد)

کل ہی مجھے عکاس کا 24.7.11 کا شمارہ ملا، جس میں آپ کا مضمون ’’فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی‘‘ شائع ہوا تھا۔میں نے پورا مضمون پڑھ لیا اور عمران شاہد بھنڈر والے مضامین کی یادیں تازہ ہو گئیں۔آپ کے مضمون سے ان کا پورا بیک گراؤنڈ معلوم ہو گیا جو میرے علم میں نہیں تھا۔آپ نے موصوف کا پورا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا جو ضروری تھا۔اس میں آپ کو موقف کافی بیلنسڈ (متوازن) ہے۔سرقے کے متعلق آپ نے جو باتیں کہیں ہیں بے حد معقول ہیں۔ **سہیل اختر** (بھوبھنیشور)

برادرِ مکرم ارشد خالد نے آغا جی کی برسی کے موقع پر روزنامہ عکاس (کولکاتا) میرے حوالے کر دیا تھا۔اس میں شامل آپ کا تحریر کردہ مضمون پڑھ کر بھنڈر صاحب کی علمی شعبدہ بازی پوری طرح عیاں ہو گئی۔امید ہے وہ آئندہ کسی بھی علمی ادبی موضوع پر سوچ سمجھ کر قلم اٹھائیں گے۔ **ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش** (سرگودھا)

بسلسلہ فلسفی کی نوجوانی اورشیلا کی جوانی

(عمران شاہد کا عذرِلنگ اوراس کی اصل حقیقت)

میرے مضمون ''فلسفی کی نوجوانی اورشیلا کی جوانی'' کوادبی حلقوں میں بھرپور پذیرائی حاصل ہورہی ہے۔اس کے جواب میں ابھی تک نام نہاد'' نوجوان فلسفی'' کو پوائنٹ در پوائنٹ جواب دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔البتہ اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے بد زبانی سے لبریز ایک تحریر''وزیر آغا گروپ کے روایتی ہتھکنڈے'' کے نام سے بعض ادیبوں کوبھیجی ہے۔اس میں ایک توبات کواصل موضوعات سے الگ کرنے کی کوشش کی ہےاوراصل حقائق کویکسرنظرانداز کردیا ہے۔صرف ایک علمی نکتہ پراپنی صفائی دینے کی کوشش کی ہےاورصفائی دیتے ہوئی بدزبانی کی انتہا کردی ہے۔تاہم وہ صفائی صرف حیلہ جوئی ہے۔

میرے مضمون میں عمران شاہد بھنڈر کے سرقہ کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کے مضمون کا پورا حوالہ دیا گیا ہے۔مضمون''ادبی نقاد رولاں بارتھ کی 'مائیتھالوجی' میں آئیڈیالوجی'' از عمران شاہد بھنڈر۔مطبوعہ ''دی نیشن''۔لندن۔22/مارچ 2007ءکا حوالہ۔بھنڈرصاحب کی جانب سے اخبار میں چھپنے والے اس مضمون میں کہیں بھی وہ وضاحتیں نہیں ہیں جو وہ اپنی کتاب کے حوالے سے دے رہے ہیں۔میں نے ان کی کتاب کا حوالہ دے کرسرقہ نشان زدنہیں کیا بلکہ ان کے ۲۰۰۷ءمیں مطبوعہ مضمون پرساری بات کی ہے۔اعتراض اخبار کے مضمون پرکیا گیا ہے، جواب میں تین سال کے بعد چھپنے والی کتاب کی بنیاد پر وضاحت کی جا رہی ہے۔**(اضافی نوٹ:)''یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی تین سال پہلے چوری کرےاورتین سال کے بعدسب سے آنکھ بچا کرچپکے سے مالِ مسروقہ کوواپس اسی جگہ رکھنے کی کوشش کرے۔''**

اہلِ ادب نام نہادنوجوان فلسفی سے پوچھیں کہ اخبارمیں ۲۰۰۷ءمیں چھپنے والے مضمون میں سرقہ ہوا ہے یانہیں؟۔۔۔تین سال کے بعدکتاب میں کیا لکھااورکیانہیں لکھا،اس سے مجھے غرض نہیں۔دی نیشن لندن کے 22/مارچ2007ءکے شمارہ میں چھپنےوالے مضمون میں سرقہ ثابت شدہ ہے۔

چہ دلا وراست دزدے کہ بکف چراغ دارد!

جہاں تک نام نہادنوجوان فلسفی کی دوسری باتوں اورغیرمتعلقہ ہفوات کاتعلق ہے،اس کا جواب دینے کے لیےان کی مادری زبان میں بات کرناپڑے گی جومیرے لیےممکن نہیں ہے۔میرے مضمون میں درج ہرالزام، واقعہ اور بیان مبنی برصداقت ہے۔نام نہادنوجوان فلسفی ایک الزام سے نکلنے کی کوشش کریں گےتو کئی اورالزامات بھی اُن پرآپڑیں گے۔میرے پاس ٹھوس شواہدموجود ہیں۔باقی قانونی چارہ جوئی کی دھمکی عمران بھنڈرکی گیدڑبھبکی ہے۔اوران کے مذکورہ مضمون کی زبان خودان کی علمی وادبی حیثیت کواجاگرکررہی ہے۔

میں اپنے مضمون کا پارٹ ٹو دھیرے دھیرےلکھ رہاہوں،اس میں عمران شاہد بھنڈر کے مزید سرقے

پیش کروں گا۔انشاءاللہ! **حیدر قریشی** (تحریرکردہ:۹/اگست ۲۰۱۱ء۔انٹرنیٹ سے ریلیز کی گئی)

(ادبی کتابی سلسلہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد شمارہ ستمبر۲۰۱۱ء)

دوسرے مضمون پر موصولہ اہم تاثرات

مضمون ہمت کرکے پڑھ ڈالا۔مزیدعبرت ہوئی۔اردو پہ عجب آکے بُرا وقت پڑا ہے۔اب بھئی اس بحث کو بند ہی کردیں۔اپنی صحت کا بھی خیال رکھیں۔دوسرے یہ کہ آپ اپنا موقف بخوبی واضح کرچکے۔

میری تو یہی درخواست ہے۔ **سی ایم نعیم** (شکاگو،امریکہ)۷/ستمبر۲۰۱۱ء

میرا جواب: میں آپ کی بات سے سوفیصد متفق ہوں۔دعا کیجیئے کہ مجھے زبردستی مزید نہ گھسیٹا جائے۔ہلکی پھلکی بدتمیزی ہوئی تو درگزر سے کام لےلوں گا،نظرانداز کردوں گا۔تاہم بہت زیادہ غلط باتیں کی گئیں تو پھر کچھ نہ کچھ جواب تو لکھنا پڑے گا۔**(ح۔ق)**

میں نے آپ کا منسلکہ دغدغہ پڑھ لیا ہے،جس میں ناچیز کے چند جملے بھی آپ نے شامل کر لیے ہیں۔چلیں اس طرح ہماری عاقبت بھی درست ہونے کا انتظام ہوگیا۔بھائی! میں پھر یہی عرض کروں گا کہ کیوں ان پودنوں پر اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔چہ پدی، چہ پدی کا شوربہ۔یہ برسات کی کھنمبیاں مطلع صاف ہونے پر راہیٔ ملکِ عدم ہوچکی ہوں گی۔جناب اشعرنجمی صاحب میرے ساتھ بھی اپنے غیر مہذب اور ناشائستہ ہونے کا مظاہرہ کرچکے ہیں۔میں ان کی اوقات سمجھ گیا اور اپنا راستہ لیا۔اور کبھی آپ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

محمد عمر میمن (امریکہ) ۸/ستمبر۲۰۱۱ء

آپ کے مضمون میں نے پڑھ لئے ہیں۔واقعی میں ان باتوں سے ناواقف تھا۔آپ کا مضمون پڑھ کے بہت ساری باتیں معلوم ہوئیں۔۔۔۔آپ ہر محاذ پر مقابلہ کرتے ہیں،یہ واقعی ہمت کی بات ہے۔جس باریک بینی سے آپ نے عمران بھنڈر کے سلسلہ میں مضامین لکھے ہیں،وہ واقعی آپ کی معلومات اورفکرانگیزی کا ضامن ہیں۔

نذیر فتح پوری (پونہ)

آپ کا مضمون ''عمران شاہد بھنڈر کا سرقہ اور جعلسازی''(یا کہیئے ایک خاص معاملے پر مسلسل مباحث کی روداد) پڑھا۔واہ بھئی واہ۔ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے تو آپ اپنی ادبی فکری بحث کی ذہانت،اصیل پن،نکتہ رسی،تازگی اورروشنیٔ طبع کی داد لیں،جس سے میں ہر بار آپ کی نثر سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔۔۔۔عمران شاہد بھنڈر کا معاملہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی چھوٹا،بڑے کی سیڑھی لگا کر خود بھی بڑا بننے نکلا ہو۔اور پھر چوری سینہ زوری۔افسوس یہ جھوٹی ادب گیری (بہ وزن گاندھی گیری۔بالی ووڈ)،بدتمیزی اور مغلظات کیا ہمارے نئے انحطاط کی نشانی اور تیاری ہیں؟۔ **کاوش عباسی** (سعودی عرب)۲۱/ستمبر۲۰۱۱ء

حیدر قریشی

’’عمران بھنڈر کا سرقہ اور جعل سازی‘‘

میں نے جب اپنا مضمون ’’فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی‘‘ لکھا تھا تو ایک ولولہ انگیز قسم کی کیفیت ضرور تھی۔اسی کیفیت نے اس مضمون کو اتنا مدلل اور مربوط طور پر لکھنے کی توفیق دلائی۔لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ مضمون بعض ادبی حلقوں میں اس حد تک زلزلہ انگیز ثابت ہوگا۔مضمون کی اشاعت کے بعد انٹرنیٹ کی دنیا میں بھونچال سا آگیا۔تاہم یہ سارا بھونچال اشعر نجمی صاحب اور جمیل الرحمٰن صاحب کا برپا کردہ تھا۔نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے دوستوں کو بھی اس حوالے سے اپنے اپنے موقف کے مطابق اظہارِ خیال کرنا پڑا۔اس سلسلہ میں خاص طور پرڈاکٹر فریاد آزر اور ارشد خالد صاحبان نے بڑا مدلل ردِعمل پیش کر کے سارے زلزلہ اور طوفان کو چائے کی پیالی میں اٹھایا جانے والا طوفان ثابت کر دیا۔مجھے جتنا ریکارڈ مل رہا ہے اس میں سے نسبتاً معیاری حصے الگ کر رہا ہوں۔وہ معیاری اختلاف کرنے والے ہوں یا اتفاق کرنے والے۔بعض دوست جنہیں ایک معیار کی حد میں دیکھا تھا انہیں ان کی حد کی سطح سے گرتا ہوا بھی دیکھ رہا ہوں۔اسی طرح اس دوران بعض دوستوں نے جو فیس بُکی مجمع بازی شروع کی ہے اس کا بھی لطف لے رہا ہوں۔اب اس ساری صورتِ حال کا جائزہ لے کر ساری بحث کو سمیٹوں گا،ایک ایسا مضمون لکھا جا سکے گا جسے لکھنے کا ارادہ پہلے میرے ذہن میں بالکل نہیں تھا۔

جب میں نے اپنا مضمون ’’فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی‘‘،مکمل کر لیا تھا تو سب سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو بھیجا تھا اور ان سے ان کی رائے اور مشورہ مانگا تھا۔انہوں نے عنایت کی مجھے اپنی رائے اور مشورے سے نوازا۔انہوں نے اپنے خط میں ایک خدشہ کا اظہار کیا تھا۔وہ انہیں کے الفاظ میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

’’یہ بھی غور فرما لیجیے کہ اس مضمون کی اشاعت سے آپ کے پرچے کی ساکھ اور آپ کی ساکھ پر اثر پڑ سکتا ہے۔لوگ کہیں گے کہ کل تک تو آپ بھنڈر کو اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے اور آج کیا ہوا جو اس میں اتنی برائیاں ثابت کی جا رہی ہیں۔نارنگ کے حامی یہی کہیں گے کہ قریشی صاحب کا جھگڑا کسی اور ہی بات پر ہوا ہوگا۔کچھ ذاتی مفادات کا تصادم ہوگا۔اب قریشی صاحب اسے یہ رنگ دے رہے ہیں۔میں جانتا ہوں کہ حقیقت کچھ اور ہے۔لیکن آپ جانتے ہیں کہ جھوٹ اور پروپیگنڈہ کے لئے کسی بنیاد کی ضرورت نہیں ہوتی،صرف افواہ اڑانا کافی

ہوتا ہے‘‘۔**(شمس الرحمٰن فاروقی بنام حیدر قریشی ۱۶؍جولائی ۲۰۱۱ء)**

اس کے جواب میں ۱۷جولائی کی میری ای میل میں فاروقی صاحب کی خدمت میں یہ الفاظ لکھے گئے:

’’میں نے جو لکھا ہے اس میں ایسا کچھ نہیں ہے جس پر مجھے شرمندگی ہو۔نہ ہی جوابی الزام تراشیوں میں میرے حصہ میں کوئی ایسا ادبی الزام و اقدام ہے جس پر مجھے ندامت ہو۔بلکہ کسی اعتراض کی صورت میں مزید کئی حقائق بھی سامنے لائے جا سکتے ہیں جو تب سے ہی میرے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔‘‘

مضمون کی اشاعت کے بعد محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے خدشہ کے مطابق اعتراضات تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے احباب نے کرنا تھے لیکن عجب ماجرا ہوا کہ بجائے نارنگ صاحب کے دوستوں کے خود شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے قریبی احباب نے نہ صرف اس پر طوفان کھڑا کیا بلکہ عین وہی اعتراض کیے جن کا ذکر فاروقی صاحب اپنے خط میں کر چکے تھے۔نہ صرف وہی اعتراض کیے گئے بلکہ فاروقی صاحب کے اپنے الفاظ کے مطابق’’ میں جانتا ہوں کہ حقیقت اور ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ جھوٹ اور پروپیگنڈہ کے لئے کسی بنیاد کی ضرورت نہیں ہوتی،صرف افواہ اڑانا کافی ہوتا ہے‘‘ جھوٹ اور پروپیگنڈہ کی بنیاد پر افواہ سازی سے پوری طرح کام لیا گیا۔میں یہ سوچتا رہ گیا کہ خدشہ تو فاروقی صاحب کا لفظ بلفظ درست ثابت ہوا لیکن مزے کی بات یہ ہوئی کہ ایسا نارنگ صاحب کے دوستوں نے نہیں کیا،شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے دوستوں نے کیا اور بڑے منظّم طریقے سے کیا۔مجھے اس ساری صورتِ حال پر ان دوستوں پر اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا فاروقی صاحب پر ہوا۔مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ مجھے خدشہ سے آگاہ کر رہے تھے یا بالواسطہ طور پر کسی رنگ میں دھمکی دے رہے تھے۔شاید وہ خود ہی اس بارے میں کچھ بتا سکیں۔

اشعر نجمی اور جمیل الرحمٰن دونوں فاروقی صاحب کے کتنے قریب ہیں اس کے لیے کسی نشان دہی کی ضرورت نہیں ہے۔ادبی بنیادوں پر ایسی قربت کو میں برا نہیں جانتا۔لیکن اگر فیض پانے والے دوست ایسے کارندے کا کردار ادا کرنے لگیں،جس کے فرائض میں کسی دلیل کو پتھر سے توڑنے کی مشقت شامل ہو تو یہ کوئی اچھا رویہ نہیں رہتا۔نارنگ صاحب کے حامیوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا جس کا سب سے زیادہ نقصان ڈاکٹر نارنگ صاحب کو اٹھانا پڑا۔اب یہ طرزِ عمل اشعر نجمی اور جمیل الرحمٰن نے اختیار کر لیا ہے اور اس کا نقصان علمی و ادبی سطح پر بہر حال فاروقی صاحب ہی کو پہنچے گا۔

جہاں تک جعلی پی ایچ ڈی اسکالر،جعلی شعبہ تعلیم سے وابستہ استاد،اور سارق عمران بھنڈر صاحب کا تعلق ہے،ان کے بارے میں پہلے پوری صراحت کے ساتھ جو کچھ لکھ چکا ہوں اس میں سے بیشتر باتوں کے گواہ خود اشعر نجمی اور جمیل الرحمٰن صاحبان رہے ہیں۔اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف ان باتوں کے معاملہ میں بد دیانتی کی حد تک تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا بلکہ انتہائی جارحانہ انداز میں ایسی افواہیں اڑائیں اور ایسی افسوسناک الزام

تراشیاں کیں اور کرائیں کہ ان کا جواب دیتے ہوئے بھی ندامت کا احساس دامن گیر رہے گا کہ یہ کیا لوگ ہیں اور ان کی کیا تہذیب اور اخلاقیات ہے۔

پہلے اشعر نجمی صاحب کے حوالے سے چند حقائق پیش کر دوں۔ جب نارنگ صاحب کے حامیوں کے ساتھ میری جنگ اپنے عروج میں داخل ہو رہی تھی (وہ جنگ ۹۰ فی صد میں نے اپنے بل پر لڑی تھی اور اس کا پورا ریکارڈ عکاس کے نارنگ نمبر اور میری کتاب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت میں محفوظ ہے۔) عین اس وقت بھی نہ صرف عمران بھنڈر صاحب کے ساتھ میری بول چال بند تھی بلکہ ان کے بارے میں میرے وہی خیالات تھے جن کا اظہار میں اپنے مضمون ''فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی'' میں کر چکا ہوں اور تب حیران کن حد تک اشعر نجمی صاحب، عمران بھنڈر صاحب کے مقابلہ میں نہ صرف مجھ سے اتفاق کر رہے تھے بلکہ میرے رویے کو سلام بھی پیش کر رہے تھے۔ اس حوالے سے بہت ساری ای میلز میرے ریکارڈ میں محفوظ ہیں یہاں صرف چند ای میلز کے اہم حصے ایک تسلسل میں پیش کر دیتا ہوں۔

میری ای میل اشعر نجمی صاحب کے نام:

''**برادرم اشعر نجمی صاحب**! سلام مسنون

عمران شاہد بھنڈر صاحب کا معاملہ یوں ہے کہ ایک تو طویل لکھتے ہیں پھر اس میں مسلسل اضافے کر کے ایک ہی فائل کو بار بار تبدیل کر کے بھیجتے ہیں۔ مجھے انہوں نے ایک بار خط کی طرز پر ایک مضمون بھیجا جو جدید ادب شمارہ ۱۱ کے ۱۹ صفحات پر مشتمل تھا۔ حسبِ عادت انہوں نے پھر اس میں بھی اضافہ کیا اور مجھے نئی فائل بھیج دی۔ چونکہ ہر شمارہ کی ان پیج فائلز کو ایک ہی فولڈر میں جمع کرتا ہوں۔ اس لیے ان کی دونوں فائلز ایک ساتھ موجود تھیں اور شامل کرتے وقت آخری فائل کی بجائے اس سے پہلے والی فائل شامل ہو گئی۔ رسالہ چھپنے کے لیے جا چکا تھا جب ان کا فون آنے پر میں نے انہیں بتایا کہ آپ کا خط ۱۹ صفحات پر محیط ہو گیا ہے تو علم ہوا کہ نیا خط تو ۲۹ صفحات پر محیط ہونا چاہیے تھا۔ جب دوبارہ جانچ کی تو علم ہوا کہ لاسٹ کی بجائے سیکنڈ لاسٹ فائل چھپ رہی ہے۔ اب عمران شاہد کا مطالبہ تھا کہ رسالہ کی اشاعت رکواؤں اور یا تو ان کے خط کا لاسٹ ورشن چھاپوں یا پھر خط ہی نکال دوں۔ رسالہ ایجوکیشنل والوں کے پاس نہ صرف جا چکا تھا بلکہ چھپ بھی چکا تھا اور بائنڈنگ کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ جب میں نے معذرت کی تو ان کا تحکمانہ انداز حیران کن تھا۔ انہوں نے مجھے ای میل بھیجی کہ اس خط کی اشاعت ان کے خلاف سازش ہے اور یہ کہ آج سے ادب کی دنیا سے اپنا نام ختم سمجھوں۔ میں نے ان کی وہ ساری ای میلز سنبھال رکھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا وہ انداز آج بھی پڑھتا ہوں تو گھن آتی ہے۔ یہ میں نے بہت اختصار سے لکھا ہے، وگرنہ بیچ میں ایک دو اور بے ہودہ ای میلز کا ذکر بھی آتا ہے۔ تب میں نے انہیں اتنا لکھا کہ **ہمارا تعلق تو اب ختم سمجھیں البتہ میں چاہوں گا کہ ابھی ہماری لڑائی دنیا کے سامنے نہ آئے ورنہ نارنگ صاحب**

کے لیے تماشہ بنانا آسان ہو جائے گا۔

دوستی کے دنوں میں بھی میں نے شمارہ ۱۰ میں جدیدیت پر ان کے حملوں پر اپنے تحفظات کا اظہار آن ریکارڈ کیا تھا اور روحانی اقدار کو مجہولیت کہنے پر اپنے شمارہ نمبر ۱۱ کے اداریہ میں اظہارِ خیال بھی کیا تھا۔۔۔۔ میں نے علمی، ادبی و تہذیبی انداز میں نہ صرف ان کی دہریانہ باتوں سے اختلاف کیا بلکہ ان کا رَدان کے مادی ذہن کے مطابق بھی کیا اور کہیں بھی تحکمانہ انداز یا تضحیکی انداز اختیار نہیں کیا۔۔۔۔۔۔۔ میری دانست میں جو شخص بار بار اپنی علمیت جتاتا ہے اور دوسروں کی تضحیک کرتا ہے وہ زیادہ دیر تک آگے نہیں جا سکتا اور بالآخر بے برکتی کا شکار ہو جاتا ہے۔ عمران شاہد میں یہ ''خوبی'' بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان میں ایک اور ''خوبی'' جو میں سمجھ سکا ہوں یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی کے نوٹس، اور نئے مطالعہ کو بھی کسی نہ کسی طور اپنے مضامین میں نہ صرف گھسیٹ لاتے ہیں بلکہ وہی مطالعہ خوامخواہ مضامین کی بے جا طوالت کا باعث بنتا جاتا ہے۔ فضیل جعفری ۱۹۹۷ء میں لکھ چکے ہیں کہ نارنگ صاحب جن کتابوں کے حوالے درج کر رہے ہیں لگتا ہے انہوں نے اصل کتابیں مطالعہ نہیں کیں اور عمران اب ناقدین پر اعتراض کر رہے ہیں کہ کسی نے کیوں اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اسی طرح ہمارے مقتدر ناقدین کی گراں قدر علمی خدمات کو محض چند جملوں سے رد کر دینا بجائے خود متکبرانہ انداز ہے۔ بس ان کی اصل خوبی یہی ہے کہ پی ایچ ڈی سے پہلے اردو میں مابعد جدیدیت پر جو کچھ پڑھا تھا وہ اصل کتابوں کو پڑھنے کے بعد انہیں یاد آتا گیا اور نارنگ صاحب کے بھید کھلتے گئے۔ ان کا اب تک کا ادبی کام یہی ہے کہ انہوں نے نارنگ کے سرقوں کو سب کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ بھی بڑا اعزاز ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ باقی کے معتبر اور قابلِ احترام ناقدین کی کسی ثبوت کے بغیر بے حرمتی شروع کر دی جائے۔

آج بہت سارے کاموں میں مصروف رہا ہوں۔ لیکن اب رات گئے آپ کو میٹر بھیجنے کی بجائے یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ عمران صاحب سرقوں کے حوالے سے جتنا کام کر رہے ہیں وہی ان کا ابھی تک کا اصلی کام ہے۔ باقی باتیں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بجائے کوزے کا دریا بنانے والی ہیں یہ باتیں صرف آپ کے ساتھ شئیر کر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

والسلام آپ کا مخلص **حیدر قریشی** ۲۸/فروری ۲۰۰۹ء''

عمران بھنڈر صاحب کے پی ایچ ڈی کا ذکر اس لیے شامل ہے کہ تب تک ہمیں وہ یہی دھوکہ دے رہے تھے کہ میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔ اب تو یہ بات بھی ان کی جعلسازی ثابت ہو چکی ہے۔ بہر حال ان کی اس جعلسازی سے سرِ دست قطع نظر کرتے ہوئے، اس میل کے جواب میں آنے والی اشعر نجمی صاحب کی ای میل کا متعلقہ حصہ پیش کرتا ہوں۔

''میں نے آپ کا ان پیج کا خط پڑھا۔ مجھے یہ بہت پہلے سے احساس تو ہو چلا تھا کہ آپ دونوں کے درمیان

کچھ دوریاں آچکی ہیں، لیکن اس کا اظہار کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا کیونکہ یہ بالکل ذاتی قسم کا معاملہ ہے۔لیکن اب جب آپ نے پوری کہانی بتائی تو میں نے ایک بار میں ہی اس کی صداقت پر یقین اس لیے کرلیا کہ اُن تمام تجربوں سے میں بھی گزر رہا ہوں، جس سے آپ گزر چکے ہیں۔طوالت کے علاوہ بار بار نظر ثانی عمران صاحب کی کمزوریاں ہیں۔انہوں نے جو کچھ پڑھا ہے وہ سب ایک ہی مضمون میں وہ سمونے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو طوالت اور پیچیدگی کا سبب بن جاتی ہیں۔آپ جیسا کہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے آپ کو ای میلز لکھ کر بڑے غیر مناسب انداز میں اپنا احتجاج درج کرایا، تو میں اُن ای میلز کو ضرور دیکھنا چاہوں گا۔

اشعر نجمی یکم مارچ ۲۰۰۹ء“

میں نے اشعر نجمی کی اس میل کے نتیجہ میں انہیں وہ ای میلز بھیج دیں جو بدزبانی پر مشتمل تھیں۔وہ میلز پڑھنے کے بعد اشعر نجمی صاحب نے مجھے لکھا:

”شکریہ اس بات کے لئے کہ آپ نے مجھے حقیقت سے آگاہ کیا تا کہ میں مستقبل میں خود کو اس طرح کی بد تمیزیوں سے محفوظ رکھ سکوں۔لیکن ایک بات تو میں ابھی بول دیتا ہوں کہ میں فطرتاً سوفٹ سپوکن ہوں لیکن جب اس طرح کا معاملہ آجاتا ہے تو میں اپنے حریف کو اگلا وار کرنے کا موقعہ بھی نہیں دیتا۔دعا کریں کہ میرے ساتھ ایسی حرکت کوئی نہ کرے کہ اس میں حرکت کرنے والے کا ہی نقصان ہے۔آپ کے تحمل اور برداشت کو میں سلام کرتا ہوں۔آپ طبعاً شریف آدمی ہیں، اس لیے آپ نے اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی عمران کو معاف کر دیا“

(اشعر نجمی کی ای میل ۲ مارچ ۲۰۰۹ء)

عمران بھنڈر کو معاف کر دینے والی بات پر میں نے اشعر نجمی کو جو ای میل بھیجی اس کا ایک حصہ بھی پیش کیے دیتا ہوں۔

”میں نے عمران کو معاف نہیں کیا، بس خاموشی اس لئے اختیار کی ہے کہ نارنگ کے سامنے تماشا بنا تو وہ اپنی چوریوں سے بری ہو جائیں گے اور الٹا مذاق ہم لوگوں کا اُڑے گا۔جدید ادب میں تو ان کے دوبارہ چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک سرقوں کی نشان دہی کا تعلق ہے وہ بات پوری ہو چکی۔اس سے آگے ادبی منظر نامے پر عمران کی نگاہ بہت محدود ہے۔سینئرز کو پڑھے بغیر ہر کسی کو نارنگ کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں، جو بجائے خود بدتہذیبی ہے۔میرا خیال ہے کہ سرقے کا باب مکمل کر کے آپ ان کی دوسری تحریروں کے لئے اپنے معیار اور رسالے کے مزاج کو فوقیت دیں۔“ **(میری جوابی ای میل بنام اشعر نجمی ۲ مارچ ۲۰۰۹ء)**

ان چند ای میلز سے ایک تو یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عمران بھنڈر کی ذاتی نوعیت کی بدتمیزی سے لے کر ان کی تحریروں میں پائی جانے والی عمومی بدتہذیبی تک میری رائے شروع سے وہی تھی جو ”فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی“ مضمون میں میری طرف سے نسبتاً صراحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔دوسرا یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے

کہ اشعر نجمی صاحب ان معاملات میں بڑی حد تک مجھ سے متفق تھے۔یہ ساری باتیں شئیر کرنے کے بعد میں نے اپریل ۲۰۰۹ء میں انہیں سہ ماہی دستک ہوڑہ میں چھپے اپنے ایک خط سے آگاہ کیا۔ یہ خط عمران بھنڈر کی ادبی (غیر ادبی) پیدائش سے دس سال پہلے شائع ہوا تھا اور اس میں میری طرف سے مابعد جدیدیت کے حوالے سے کچھ باتیں کی گئی تھیں۔اس خط کو پڑھنے کے بعد اشعر نجمی صاحب نے اپنی ۴/اپریل ۲۰۰۹ء کی ای میل میں مجھے لکھا:

”اس خط میں پوسٹ ماڈرن ازم کے تعلق سے جو سٹینڈ آپ نے شروع میں لیا تھا، وہ آج بھی قائم ہے“

اب عمران بھنڈر کی جعلسازیوں اور سرقہ کے دفاع میں انتہائی حد تک جاتے ہوئے انہوں نے ”جدید ادب“ کی ادبی حیثیت پر بھی حملے کیے اور کرائے ہیں اور بحیثیت ادیب میری حیثیت کو بھی زد پر رکھا ہے کیونکہ اس کے بغیر عمران بھنڈر کی جعلسازیوں اور سرقہ سے توجہ ہٹائی نہیں جاسکتی تھی۔”جدید ادب“ کے بارے میں میری طرف سے بارہا لکھا جا چکا ہے، کہا جا چکا ہے کہ جب تھوڑے بہت وسائل میسر ہوتے ہیں تو میں رسالہ جاری کر لیتا ہوں۔اس کے اجراء کو میں کوئی ادبی خدمت قرار نہیں دیتا کیونکہ رسالہ نکال کر ادب کی خدمت کرنے والے پہلے ہی بہت ہیں۔میں اپنی ادبی زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس ادبی زندگی میں ادبی رسالہ ”جدید ادب“ بھی شامل ہے۔کسی کو اچھا لگتا ہے تو اس کی محبت ہے، کسی کو اچھا نہیں لگتا تو اسے اپنی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔تاہم اشعر نجمی صاحب کو یہ ضرور یاد دلانا چاہوں گا کہ وہ مجھ سے جدید ادب میں چھپی ہوئی نگارشات بھی منگوا کر اپنے رسالہ میں چھاپتے رہے ہیں، اور ایسی نگارشات فراہم کرنے پر میرا شکریہ بھی ادا کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک میری ادبی حیثیت کا تعلق ہے، میں کبھی نہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوا ہوں اور نہ ہی خود کو مایوس کن کیفیت میں پایا ہے۔ادبی طور میں جتنا ہوں مجھے اس کا پوری طرح ادراک ہے۔اس کے لیے خدا کا شکر گزار رہتا ہوں کہ اس نے مجھے صلاحیتیں عطا فرمائیں اور انہیں بروئے کار لانے کی توفیق بخشی۔اگر ساری دنیا بھی مجھے رد کر دے تو بھی مجھے اطمینان ہے کہ خدا نے جتنا مجھے بنایا ہے اتنا تو میں نے رہنا ہی ہے۔ یہاں اشعر نجمی صاحب کی ایک ای میل پیش کر کے اس موضوع کو سمیٹتا ہوں۔میری کتاب ”عمرِ لاحاصل کا حاصل“ ملنے کے بعد اشعر نجمی صاحب نے لکھا:

”ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے آپ کی کتاب ملی۔اس کتاب نے زخم پر مرہم کا کام کیا۔اب تک میں آپ کی شاعری کا قتیل رہا ہوں لیکن اس کلیات میں شامل آپ کی نثر نے مجھے مبہوت کر دیا ہے۔خاص کر آپ کے افسانے تو بہت خوب ہیں۔پتہ نہیں کیوں ہمارے نقادوں کو اس پر گفتگو کرنے کی توفیق نہیں ہوئی؟“

(اشعر نجمی کی ای میل بنام حیدر قریشی ۹ مارچ ۲۰۰۹)

یہ چند حوالہ جات اشارہ ہیں۔اشعر نجمی صاحب نے انٹرنیٹ پر جو طوفان برپا کیا اور کرایا ہے، ان میں سے بیشتر حملوں کا سنجیدہ اور مدلل جواب ان حوالوں میں آگیا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ جوابی طور پر میں اشعر نجمی

صاحب کی وہ زبان استعمال نہ کروں جو عمران بھنڈر کی تقلید میں انہوں نے اختیار کر لی ہے۔ ہاں وہ ادبی رسائل میں جو کچھ اور جیسا بھی لکھیں گے اس کا بھرپور جواب ضرور ان کی خدمت میں پیش کروں گا۔ انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ میں جب بھی کسی پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو پکا ہاتھ ڈالتا ہوں۔

اب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے دوسرے نیاز مند جمیل الرحمٰن صاحب کے سلسلہ میں بھی چند حقائق پیش کر دینا مناسب ہے تاکہ اس معاملہ میں ان کا کردار بھی ادبی طور پر پورے سیاق و سباق کے ساتھ محفوظ رہے۔ پہلے میری کھٹی میٹھی یادوں'' کے ایک باب سے ایک اقتباس:

''مجھ پر آنے والے تکلیف دہ دنوں میں سے ایک وہ عرصہ تھا جب بے وزن شعری مجموعے رکھنے والوں اور جعلی شاعروں اور ادیبوں نے مل کر میرے خلاف غلیظ مہم شروع کی تھی۔ اس تمام عرصہ میں بھی میرا بلڈ پریشر بالکل نارمل رہا۔ میرے خلاف مہم چلانے والے اس لائق نہیں کہ میں ان کے ناموں سے اپنی یادوں کے اس سلسلہ کو آلودہ کروں۔ ان کا ذکر کسی اور جگہ پر ہی کافی رہے گا لیکن دو شخصیات اس غلیظ کھیل میں ایسی بھی شریک ہوئیں، جن کا صدمہ مجھے آج بھی ہے۔ یہ شخصیات تھیں (تب) سویڈن میں مقیم ڈاکٹر پرویز پروازی اور ہالینڈ میں مقیم جمیل الرحمٰن ۔ دونوں صاحبان نے میرے جرمنی پہنچنے کے بعد مجھے خود ڈھونڈا اور خود مجھ سے رابطہ کیا۔۔۔۔۔۔۔ جمیل الرحمٰن نے جب میرا اتہ پتہ ڈھونڈ کر مجھ سے رابطہ کیا تب انہوں نے ادبی حوالے سے مجھے تعریف کی حد تک جو کچھ کہا، اسے درج کرنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن جب وہ پرویز پروازی کے کہنے پر میرے خلاف غلیظ مہم کے سپاہی بنے تو مجھے دلی صدمہ ہوا۔ وہ جس طرح کی حرکتیں ہالینڈ سے لے کر ہندوستان اور پاکستان تک کر آئے تھے، مجھے ساتھ کے ساتھ ان کی رپورٹ مل رہی تھی۔ اس مہم کے بعد کئی بار جمیل الرحمٰن کے فون آتے رہے۔ میں نے انہیں ان کی کسی زیادتی کا احساس تک نہیں دلایا لیکن ان کے ساتھ کبھی گرمجوشی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ انسان کتنا ہی زیادتی کر لے اگر اس کی فطرت میں تھوڑی بہت نیکی کی رمق ہو تو ضمیر کچو کے ضرور لگاتا ہے۔ چنانچہ ایک بار جمیل نے خود ہی کھل کر معذرت کی اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا صرف استاد، شاگرد کے رشتے کی وجہ سے کیا۔ میں نے تب بھی خاموشی اختیار کئے رکھی۔ وقفے وقفے سے آٹھ دس بار ٹیلی فون کرنے کے بعد ایک بار انہوں نے گلہ کیا کہ وہ اتنی بار مجھے فون کر چکے ہیں جبکہ میں انہیں فون نہیں کر رہا۔ میں نے تب بھی بات کو ٹال دیا۔ اس سے اگلی بار جب جمیل الرحمٰن کا فون آیا تو مجھ پر برہمی کا اظہار کرنے لگے کہ میں ہر بار فون کرتا ہوں۔ آپ فون نہیں کرتے۔ تب میں نے اتنا جواب دے دیا کہ میں نے کب آپ سے کہا ہے کہ آپ مجھے فون کیا کریں؟ اس دن کے بعد سے ان کا کوئی فون نہیں آیا یعنی ۔ وہ بھی ہیں آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے'' ☆

(''جدید ادب'' جرمنی شمارہ نمبر ۹۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۷ء۔ صفحہ نمبر ۱۷۹، ۱۸۰۔

''عمرِ لا حاصل کا حاصل'' صفحہ نمبر ۴۹۰، ۴۹۱۔۔۔ یادوں کا باب ''روح اور جسم'')

یادوں کے باب میں یہ ذکر چھپنے کے بعد جمیل الرحمٰن صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا، اس رابطہ کا حال بھی ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ یادوں کے اسی باب کے آخر میں لکھا ہے:

''☆ میری یادوں کا یہ باب جدید ادب کے شمارہ:۹ میں چھپنے کے لئے پریس میں جا چکا تھا جب مجھے ایک مدت کے بعد پھر جمیل الرحمٰن کا فون آ گیا۔ ان کا فون آنے سے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ میں نے انہیں کھل کر بتا دیا کہ میں نئے باب میں آپ کا ''ذکرِ خیر'' کر چکا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں، آپ نے جو لکھا، میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ان کے ساتھ مختلف ادبی موضوعات پر بات ہوئی۔ ''رہے نام اللہ کا!'' کے مندرجات انہیں بہت پسند آئے تھے۔ اس پر بہت خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ سائنس، مذہب اور ادب کی اپنی اپنی خود مختاری کے ساتھ تینوں کے ربطِ باہم پر دلچسپ باتیں ہوئیں۔ بحیثیت شاعر میں نے ان کی خوبیوں کو مانا ہے، خامیوں کا انہیں خود بخوبی علم ہے۔ میں جمیل الرحمٰن سے اپنی شدید ناراضی کے دنوں میں بھی اپنے مضمون ''یورپی ممالک میں اردو شعر و ادب: ایک جائزہ'' میں نہ صرف ان کا ذکر کر چکا ہوں بلکہ انہیں یورپ کے ان معدودے چند شعراء میں شمار کیا ہے، جو اردو شاعری کی نام نہاد بین الاقوامیت سے قطع نظر، اردو کی مین سٹریم یا ادب کے مرکزی دھارے کے اہم شعراء کے ہم پلہ ہیں۔ نجی سطح پر جو دکھ تھا وہ ان کی دوبارہ ٹیلی فون کال آنے پر ہونے والی کھلی اور دوٹوک گفتگو نے دور کر دیا ہے۔ شاید بہت ساری غلط فہمیاں عدم رابطہ کے باعث بھی ہو جاتی ہیں۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

(ح۔ق)

(''جدید ادب'' جرمنی شمارہ نمبر ۱۰۔ جنوری تا جون ۲۰۰۸ء۔ صفحہ نمبر ۶۔ بہ عنوان ''ایک چھوٹی سی وضاحت'')

اس تجدید دوستی کے بعد جمیل الرحمٰن صاحب پر ایک کڑا وقت بھی آیا اور ایک دوست کی حیثیت سے میں ان کی جو ڈھارس بندھا سکتا تھا، وہ میں نے بندھائی۔ اس کا کچھ ذکر ریکارڈ پر موجود ہے اور پیش ہے:

''اسی دوران ہالینڈ سے لندن شفٹ ہو جانے والے دوست جمیل الرحمٰن کا فون آیا تو اپنے بعض مسائل کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے اتنے جذباتی ہو گئے کہ خودکشی کی بات کرنے لگے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میں پاکستان میں ایک بار ایسی کیفیت سے گزرا ہوں لیکن اب تو خدا کا فضل ہی فضل ہے۔ پھر ان پر جو خدا کے فضل اور احسانات ہیں ان کی طرف انہیں توجہ دلائی اور کہا کہ ہم بامراد لوگ ہیں، نامراد نہیں ہیں۔ سو خودکشی کا سوچنا بھی خدا کی ناشکری میں شمار ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک نازک مرحلہ پر میں ایک دوست کے لیے زندگی بخش اچھی باتیں کر سکا اور اس کے لیے وقتی طور پر سہی سکون کا موجب بنا۔''

(یادوں کا باب ''زندگی در زندگی''۔ مطبوعہ ''جدید ادب'' جرمنی۔ شمارہ نمبر ۱۶۔ جنوری تا جون ۲۰۱۱ء)

ان تین اہم اقتباسات سے جمیل الرحمٰن صاحب کے اور میرے درمیان تعلق کی نوعیت کو بھی سمجھا جا سکتا

ہے اوران کی ادبی شخصیت کوبھی سمجھا جا سکتا ہے۔اسی دور میں جب وہ تجدیدِ دوستی کر چکے تھے، ڈاکٹر نارنگ صاحب کیحا میوں کے ساتھ معرکہ برپا ہوا۔جمیل الرحمٰن صاحب فون پرتو باتیں کرتے رہے لیکن عملی طور پرانہوں نے عمران بھنڈر کے حوالے سے ایک لفظ تائید میں نہیں لکھا اور میری معرکہ آرائی کے وقت بھی انہیں تحریری طور پر ایک لفظ لکھنے کی توفیق بھی نہیں ملی۔بس ٹیلی فون پر زبانی جمع خرچ کی حد تک باتیں کرلیا کرتے تھے۔اسی دوران جب عمران بھنڈر کی بدتمیزی اور بدزبانی والی ای میلز کا سامنا کرنا پڑا تو میں نے جمیل الرحمٰن صاحب کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔انہوں نے عمران بھنڈر کے خلاف سخت لفظ استعمال کیے اور کہا کہ میں کسی اور کی گارنٹی نہیں دیتا لیکن اگرایسے خبیث شخص کے ساتھ لڑنا پڑا تو میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔میں نے تب ہی انہیں بتا دیا تھا کہ جب تک نارنگ صاحب کے حامیوں والا محاذ بند نہیں ہوتا، میں دو محاذوں پر نہیں لڑسکتا۔ہاں جب بھی یہ محاذ بند ہوا میں عمران بھنڈر صاحب کے سارے قرض چکاؤں گا، تب آپ ساتھ دے دیجیے گا۔لیکن شاید جمیل الرحمٰن صاحب کی قسمت میں ہمیشہ جعل سازی اور سرقہ کی زد میں آئے ہوئے لوگوں کی حمایت کرنے والے لوگوں کے حلقہ میں شامل رہنا ہی لکھا ہوا ہے۔اب جب ان کے وعدہ کے ایفا کا وقت آیا تو ساتھ دینا تو درکنار وہ کھل کر مخالفین کی صف میں کھڑے تھے۔لگ بھگ دس سال پہلے کی طرح اس بار بھی کمین گاہ میں جمیل الرحمٰن صاحب موجود تھے۔یقیناً انہیں اپنا وعدہ بھول گیا ہوگا لیکن شاید یہ ان کے ادبی مقدر کی بات تھی، اوران کی ادبی شناخت میں شامل رہنا تھی۔

جمیل الرحمٰن صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کسی فورم پر عمران شاہد بھنڈر کا بے دلیل جوابی مضمون ''وزیرآغا گروپ کے روایتی ہتھکنڈے'' شائع کیا تو اس کے جواب میں ارشد خالد صاحب نے میرا وضاحتی بیان بھی وہاں پوسٹ کر دیا۔وہ بیان انہوں نے عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد کے شمارہ نمبر ۱۴، ستمبر ۲۰۱۱ء میں شائع کر دیا ہوا ہے۔یہاں اسے پیش کر دیتا ہوں۔

بسلسلہ فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی

(عمران شاہد کا عذرِ لنگ اوراس کی اصل حقیقت)

میرے مضمون ''فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی'' کو ادبی حلقوں میں بھرپور پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔اس کے جواب میں ابھی تک نام نہاد ''نوجوان فلسفی'' کو پوائنٹ در پوائنٹ جواب دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے بدزبانی سے لبریز ایک تحریر ''وزیرآغا گروپ کے روایتی ہتھکنڈے'' کے نام سے بعض ادیبوں کو بھیجی ہے۔اس میں ایک تو بات کو اصل موضوعات سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے اور اصل حقائق کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔صرف ایک علمی نکتہ پر اپنی صفائی دینے کی کوشش کی ہے اور صفائی دیتے ہوئی بد زبانی کی انتہا کر دی ہے۔تاہم وہ صفائی صرف حیلہ جوئی ہے۔

میرے مضمون میں عمران شاہد بھنڈر کے سرقہ کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کے مضمون کا پورا حوالہ دیا

گیا ہے۔مضمون ''ادبی نقاد رولاں بارتھ کی 'مائیتھالوجی' میں آئیڈیالوجی'' از عمران شاہد بھنڈر۔مطبوعہ ''دی نیشن''۔لندن۔22/ مارچ 2007ء کا حوالہ۔بھنڈر صاحب کی جانب سے اخبار میں چھپنے والے اس مضمون میں کہیں بھی وہ وضاحتیں نہیں ہیں جو وہ اپنی کتاب کے حوالے سے دے رہے ہیں۔میں نے ان کی کتاب کا حوالہ دے کر سرقہ نشان زد نہیں کیا بلکہ ان کے ۲۰۰۷ء میں مطبوعہ مضمون پر ساری بات کی ہے۔اعتراض اخبار کے مضمون پر کیا گیا ہے، جواب میں تین سال کے بعد چھپنے والی کتاب کی بنیاد پر وضاحت کی جا رہی ہے۔

(اضافی نوٹ:)''یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی تین سال پہلے چوری کرے اور تین سال کے بعد سب سے آنکھ بچا کر چپکے سے مالِ مسروقہ کو واپس اسی جگہ رکھنے کی کوشش کرے۔''

اہلِ ادب نام نہاد نوجوان فلسفی سے پوچھیں کہ اخبار میں ۲۰۰۷ء میں چھپنے والے مضمون میں سرقہ ہوا ہے یا نہیں؟۔۔۔تین سال کے بعد کتاب میں کیا لکھا اور کیا نہیں لکھا، اس سے مجھے غرض نہیں۔دی نیشن لندن کے 22/ مارچ 2007ء کے شمارہ میں چھپنے والے مضمون میں سرقہ ثابت شدہ ہے۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

جہاں تک نام نہاد نوجوان فلسفی کی دوسری باتوں اور غیر متعلقہ ہفوات کا تعلق ہے، اس کا جواب دینے کے لیے ان کی ''مادری زبان'' میں بات کرنا پڑے گی جو میرے لیے ممکن نہیں ہے۔میرے مضمون میں درج ہر الزام، واقعہ اور بیان مبنی بر صداقت ہے۔نام نہاد نوجوان فلسفی ایک الزام سے نکلنے کی کوشش کریں گے تو کئی اور الزامات بھی اُن پر آ پڑیں گے۔میرے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں۔باقی قانونی چارہ جوئی کی دھمکی عمران بھنڈر کی گیدڑ بھبکی ہے۔اوران کے مذکورہ مضمون کی زبان خود ان کی علمی و ادبی حیثیت کو اجاگر کر رہی ہے۔

میں اپنے مضمون کا پارٹ ٹو دھیرے دھیرے لکھ رہا ہوں، اس میں عمران شاہد بھنڈر کے مزید سرقے پیش کروں گا۔انشاءاللہ!

حیدر قریشی (تحریر کردہ: ۹/ اگست ۲۰۱۱ء)

اس بیان کے سامنے آنے کے بعد جمیل الرحمٰن نے اپنے اسی فورم پر بار بار اعلان کیا کہ عمران شاہد بھنڈر اس کا جواب لکھیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اُن کے جواب کے بعد اس موضوع پر اور کچھ نہیں شائع کیا جائے گا۔اس پر ارشد خالد صاحب نے ایک دوسرے فورم میں اچھا لکھا کہ جمیل الرحمٰن نے سنگ وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد کا منظر دکھا دیا ہے۔بہر حال جمیل الرحمٰن صاحب کی سرتوڑ کوشش کے باوجود عمران شاہد بھنڈر کو جرات نہیں ہوئی کہ اپنے سرقہ کی صفائی دے سکتے، انہوں نے وہاں خاموشی اختیار کر لی اور تا حال میرے اس بیان کے جواب میں انہوں اپنے نام سے ایک لفظ نہیں لکھا۔جب بار بار بلانے کے باوجود عمران بھنڈر صاحب کو وہاں کوئی جواب دینے کی جرات نہیں ہوئی تو جمیل الرحمٰن صاحب نے از خود فیصلہ فرما دیا کہ یہ حیدر قریشی کون ہے؟ (کوئی بتلاؤ کہ

ہم بتلائیں کیا!) اور ساتھ عمران بھنڈر کی ساری جعلسازیوں اور سرقہ کو معصومانہ رنگ دینے کی کوشش کی گئی۔

عمران بھنڈر صاحب کے بارے میں ذرا آگے جا کر تفصیلی بات ہوگی، یہ سب کچھ بر سبیلِ تذکرہ آ گیا ہے۔ بات ہو رہی تھی نارنگ صاحب کے حامیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کی۔ عکاس کے نارنگ نمبر اور میری کتاب ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' کی اشاعت کے ساتھ وہ معرکہ سر ہو گیا۔ لیکن جب وہ معرکہ سر کر لیا گیا عکاس کا نارنگ نمبر بھی چھپ گیا، میری کتاب بھی چھپ گئی تو پھر ایسے لگا جیسے کسی جلوس کے آگے دوسرے لوگ اپنے جھنڈے اور بینر لے کر آ گئے ہیں۔ اب جمیل الرحمٰن، زبیر رضوی اور اشعر نجمی اس معرکے کے میرِ کارواں ہیں۔ (سب کہو سبحان اللہ!)

یہاں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ جب نارنگ صاحب کے حامیوں کے ساتھ گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا، تب نہ زبیر رضوی کہیں دکھائی دے رہے تھے، نہ جمیل الرحمٰن کو عملاً ہماری حمایت میں ایک لفظ بھی لکھنے کی توفیق مل رہی تھی اور اشعر نجمی صاحب ''اثبات: ۳ میں جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کی کہانی چھاپنے کے بعد، عین گھمسان کی جنگ کے دنوں میں کسی نامعلوم وجہ سے لگ بھگ سال بھر کے لیے انڈر گراؤنڈ چلے گئے تھے۔ انڈر گراؤنڈ کا لفظ اس لیے لکھا ہے کہ وہ کسی سے بھی رابطہ میں نہیں آ رہے تھے۔ خود شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ان دنوں بعض احباب کو یہ بتایا کہ سنا ہے نارنگ صاحب نے انہیں کوئی فلم لکھنے کا کام دلا دیا ہے اس لیے وہ غائب ہو گئے ہیں۔ (حالانکہ یہ بات غلط تھی۔ لیکن ایسی سچوایشن میں بھی فاروقی صاحب کا شک نارنگ صاحب پر ہی گیا) ان بعض احباب میں جمیل الرحمٰن بھی شامل ہیں جنہیں فاروقی صاحب نے یہ بات کہی تھی اور مجھے بھی انہوں نے بتایا تھا۔ تو یہ سارے لوگ جو گھمسان کی جنگ کے وقت پتہ نہیں کہاں غائب تھے، اب یہ سارے اس معرکہ کے ہیرو ہیں اور جمیل الرحمٰن جیسے دوست کو بھی یہ لکھنے کا اعزاز نصیب ہوا کہ یہ حیدر قریشی کون ہے؟

نارنگ صاحب کے حامیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کے دوران مجھ پر مسلسل یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے لیے کام کر رہا ہوں اور گویا ان کا ایسا کارندہ ہوں جیسے جمیل الرحمٰن اور اشعر نجمی ہیں۔ اسی بنیاد پر نصرت ظہیر صاحب کے ساتھ جو لڑائی ہوئی اس میں فاروقی صاحب کو جی بھر کے ملامت کی گئی۔ میں نے ان کے جواب میں اصل موضوع پر فوکس رکھا اور فاروقی صاحب کا کسی قسم کا دفاع نہیں کیا۔ حالانکہ محض مجھے فاروقی گروپ کا بندہ قرار دے کر ان کے خلاف جو کچھ لکھا گیا تھا وہ خاصا تکلیف دہ تھا اور مجھے کئی بار یہ احساس ہوا کہ معاملات نارمل ہو جائیں تو فاروقی صاحب کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کی کوئی صورت نکالوں گا۔ بات سیدھی سی تھی کہ نارنگ صاحب کے حامیوں کے ساتھ جو معرکہ برپا ہوا اس کے دوران ایک ورکنگ ریلیشن شپ فاروقی صاحب کے ساتھ ضرور بن گئی تھی۔ ان کے بعض دوستوں کے ساتھ بھی یہی صورت بنی لیکن حقیقتاً ان کے گروپ کا کارندہ ہو کر ان کے لیے کام کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اب یہی الزام تراشی مسلسل

فاروقی صاحب کے کارندوں کی طرف سے کی جا رہی ہے کہ بھنڈر صاحب کے خلاف میری ساری کاوش اس لیے ہے کہ میں نارنگ صاحب کے ساتھ مل گیا ہوں۔ یہ اتنا ہی سچ ہے جتنا نارنگ صاحب کے دوستوں کی طرف سے لگایا جانے والا الزام سچ تھا اور اتنا ہی جھوٹ ہے جتنا نارنگ صاحب کے احباب کی طرف سے لگایا گیا الزام جھوٹ تھا۔ ورکنگ ریلیشن شپ تب بھی تھوڑی بہت قائم ہوئی تھی۔ اب بھی اگر نارنگ صاحب کے دوستوں کے ساتھ اُتنی ورکنگ ریلیشن شپ بن جائے تو مجھے یقیناً اس انوکھی مخالفت کا مقابلہ کرنے میں سہولت ملے گی۔ جس کے لیے ڈرایا تو یہ گیا تھا کہ نارنگ صاحب کے ساتھی ایسا کہیں گے لیکن وہ سب کچھ خود فاروقی صاحب کے ساتھی مل کر کہہ رہے ہیں۔

میں نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے ناول پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کے اختتامی حصہ میں میرے ایک دو جملے فاروقی صاحب نے ''سبقِ اردو'' میں چھاپنے سے پہلے از خود حذف کر دیئے۔

حذف شدہ جملے یہ تھے:

''انہوں نے خود نئے لکھنے والوں کو اس راہ پر لگائے رکھا جہاں کئی فنکار ادبی خودکشیاں کر گئے۔ لیکن جب آپ بہ نفسِ نفیس تخلیقی اظہار پر آئے تو نہ صرف جدیدیت سے بالکل الگ ہوتے دکھائی دیئے بلکہ موضوع سے لے کر اسلوب تک ہر سطح پر کلاسیکل بن گئے۔ دوسروں کے ساتھ جو ہوا سو ہوا۔۔۔''۔

جب ''سبقِ اردو'' میں میرا مضمون شائع کیا گیا اور اس میں سے یہ حصہ حذف کر دیا گیا تو یہ احساس ضرور ہوا کہ حذف کرنے سے پہلے مجھ سے بات کر لی جاتی تو اچھا تھا۔ تاہم میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میری بات درست ہونے کے باوجود اگر اس ناول پر مضمون میں شامل نہ ہو تو پھر بھی ناول کا مطالعہ متاثر نہیں ہوتا۔ جب نصرت ظہیر صاحب نے اس مسئلہ پر اعتراض کیا تو ظاہر ہے مجھے اس کا دفاع کرنا تھا سو میں نے کیا۔ تاہم بعد میں مجھے احساس ہوا کہ جملے حذف کر دینے کے باوجود فاروقی صاحب کے من میں کہیں کوئی رنجش سی رہ گئی ہے۔ اس کا اظہار بعض صورتوں میں سامنے آتا رہا۔ اگرچہ یہ بہت ہی چھوٹی سطح کی باتیں ہیں۔ پھر بھی اب پیش تو کرنی ہی پڑیں گی۔ میں نے ان سب کو دیکھا ضرور۔ دوسری طرف کی قلبی کیفیات کو سمجھنے کا اندازہ بھی کر لیا لیکن اس کا اظہار کرنا بہت ہی چھوٹا سا لگ رہا ہے۔ یہ سب کرنے والوں کو ایسا نہیں لگا تو ان کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ ان اقدامات کی ایک جھلک دیکھتے ہیں۔ ایک ویب سائٹ نظر سے گزری

http://urduindia.wordpress.com/2007/09/29/faruqis-urdu-novel-kai-chand-the-sar-e-aasman/

اس میں فاروقی صاحب کے ناول کا انگریزی میں تعارف کرایا گیا تھا۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ انگریزی میں لکھنے والا ان کا اپنا بندہ ہے۔ ناول کے تعارف کے طور پر جو کچھ لکھا گیا اس کا بیشتر حصہ میرے مضمون سے اخذ کیا گیا تھا لیکن اس میں کہیں میرا حوالہ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر اسی ویب سائٹ پر کومنٹس کے سیکشن میں

رومن اردو میں ہی اپنے یہ تاثرات درج کر دیے۔

''اس تبصرہ میں مذکورہ ناول پر میرے مضمون کا ایک بڑا حصہ شامل کیا گیا ہے لیکن افسوس کہ میرا نام مینشن نہیں کیا گیا۔کیا اتفاقاً ایسا ہوا ہے یا جان بوجھ کر میرا تجزیہ تو شامل کیا گیا ہے مگر نام حذف کر دیا گیا ہے؟'' **۵ مئی ۲۰۰۸ء**

یہاں یہ وضاحت کر دوں کہ ناولوں پر اب تک میرے جتنے مضامین چھپ چکے ہیں ان میں عمومی طور پر میرا انداز یہ رہتا ہے کہ میں سب سے پہلے ناول کا خلاصہ یا مختصر کہانی پیش کر دیتا ہوں۔یہی انداز میں نے فاروقی صاحب کے ناول کے سلسلہ میں اختیار کیا۔ان کے ناول کی کہانی بہت زیادہ بکھری ہوئی تھی۔اسے مربوط طور پر پیش کرنا بجائے خود خاصا مشقت طلب کام تھا۔اس ناول پر لکھے گئے مضامین میں سب سے پہلے میرا مضمون شائع ہوا جس میں ناول کا خلاصہ کر دیا گیا تھا۔جب ایک بار کہانی مربوط ہو کر سامنے آجائے تو پھر اس میں کچھ کمی بیشی کر کے دوسرا خلاصہ تیار کرنا آسان ہو جاتا ہے۔چنانچہ میرے مضمون کی اشاعت کے بعد بعض ایسے مضامین پھر پڑھنے کو ملے جن میں تھوڑی کمی بیشی کے ساتھ ناول کا خلاصہ درج کیا گیا تھا۔یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ناول کی بکھری ہوئی کہانی کو مربوط کر کے یکجا کرنے کا کام بہر حال سب سے پہلے مجھ سے ہوا تھا۔میرے مضمون کی اشاعت سے پہلے ناول پر جتنے مضمون چھپ چکے تھے کسی میں بھی ناول کا خلاصہ درج نہیں تھا۔

انگریزی ویب سائٹ پر فاروقی صاحب کے ناول کے اسی تعارف میں ایک جگہ میری طرف سے یہ الفاظ شامل کیے گئے۔

such is his mastery in depicting the sexual encounters and love scenes that if the novel was written in modern Urdu, it would have sold by lakhs, says Haider Qureshi, an eminent poet. As it is a novel about Indo-Islamic culture and Mughals, the finest couplets of Urdu and Persian poetry abound in the book.

اس کا اردو ترجمہ شب خون خبر نامہ شمارہ اگست تا دسمبر ۲۰۰۸ء میں ان الفاظ میں کیا گیا:

''حیدر قریشی (an eminent poet کا ترجمہ غائب ہے) کا کہنا ہے کہ اس ناول میں جنسی معاملات کو اس قدر ماہرانہ انداز لیکن مرصع زبان میں پیش کیا گیا ہے کہ اگر اسے اکیسویں صدی کی زبان میں لکھا جاتا تو اس کی فروخت لاکھوں تک پہنچتی۔ہند اسلامی تہذیب اور مغل طور طریقوں کی عکاسی کے سبب سے ناول میں فارسی کے شعر بھرے ہوئے ہیں۔''

ناول پر مطبوعہ میرے مضمون میں شامل میرے اصل الفاظ یہ ہیں:''جنسی عمل کی منظر کشی میں شمس الرحمٰن فاروقی کی جزئیات نگاری کی مہارت اپنے کمال پر دکھائی دیتی ہے۔اگر انہوں نے ناول کو آج کے عہد کی اردو میں لکھا ہوتا تو صرف جنسی جزئیات نگاری کے باعث ناول ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا۔''

ہاتھوں ہاتھ لیا جانا اور لاکھوں تک فروخت ہونا اپنے اپنے حساب کی بات ہے۔

اور یہ جملہ تو میں نے کہیں بھی نہیں لکھا۔۔۔''ہند اسلامی تہذیب اور مغل طور طریقوں کی عکاسی کے سبب سے ناول میں فارسی کے شعر بھرے ہوئے ہیں۔''

کہا جا سکتا ہے کہ شب خون خبر نامہ نے تو انگریزی سائٹ کی تحریر کا ترجمہ دیا تھا۔لیکن مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ انگریزی میں لکھنے والا بھی ان کا ہی کوئی نیاز مند ہے۔نیز اگر انگریزی میں کچھ غلط لکھا ہوا تھا تو فاروقی صاحب کے لیے اس کی درستی کرنا یا اسے نظر انداز کرنا مشکل نہ تھا۔بہر حال جو میں نے لکھا تھا اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس کے طویل حصہ میں میرا حوالہ تک نہیں دیا گیا اور جو میں نے نہیں لکھا تھا وہ بلا وجہ مجھ سے منسوب کر دیا گیا۔تاہم اس قسم کی باتوں سے اندازہ ہوتا رہا کہ مجھ پر جن کا کارندہ ہونے کا جھوٹا الزام ہے وہ مجھ سے کس حد تک خوش ہیں۔

یہی صورتِ حال اشعر نجمی صاحب کے ہاں بھی نمایاں ہو رہی تھی۔کہاں یہ کہ وہ ''جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کی کہانی'' کو اہتمام کے ساتھ چھاپ رہے تھے اور کہاں یہ کہ کسی نے سرقہ اور جعلسازی کے خلاف جدید ادب کا ذکر کر دیا تو باقی سارا لکھا چھاپ دیا لیکن جدید ادب کی توصیف والا جملہ حذف کر دیا۔رفیع رضا کے تاثرات فیس بک پر لگے ہوئے تھے جس میں انہوں نے سرقہ کی روایت کے مستحکم ہونے کی شدید مذمت کرتے ہوئے اس کی حوصلہ شکنی کے لیے مسلسل جہاد کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔اور اپنے خط کے آخر میں یہ اعتراف کیا:

''جدید ادب رسالہ جو حیدر قریشی صاحب کی ادارت میں جرمنی سے شائع ہوتا ہے،انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔اس جہاد میں سبقت لے جا چکا ہے۔''

اشعر نجمی صاحب نے وہ سارے تاثرات ''اثبات'' شمارہ نمبر ۵۔۴ میں شائع کیے بس یہ آخری جملے حذف کر دیے۔میں ان ساری چھوٹی چھوٹی حرکتوں کو اور ایسی ہی دیگر حرکتوں کو اپنے ان کرم فرماؤں کی محبت میں شمار کرتا ہوں۔

عمران بھنڈر صاحب کے سرقہ اور جعلسازی کے حوالے سے بحث انٹرنیٹ کے کئی فورمز تک پھیلی۔ایک فورم پر ڈاکٹر فریاد آزر اور ارشد خالد نے بڑے مدلل طریقے سے اشعر نجمی اور جمیل الرحمٰن اور ان کے فیس بکی دوستوں کی گرفت کی۔اس فورم پر فریاد آزر نے اشعر نجمی کے جواب میں بڑی پھڑکتی ہوئی میل پوسٹ کی۔اس کے ساتھ ہی اس فورم کی انتظامیہ نے بحث کو بند کرنے کا اعلان بھی کر دیا لیکن پھر اپنے ہی اعلان کو رد کر کے اور اشعر نجمی کو ترجیح دے کر ایک بار پھر اشعر نجمی کے تاثرات شائع کر دیے گئے۔پہلے ڈاکٹر فریاد آزر کے تاثرات پیش ہیں۔

''اشعر نجمی صاحب کی محبت ہے کہ بار بار مجھے ایک بات یاد دلا رہے ہیں اور اور بار بار جعلساز اور سارق عمران بھنڈر کے بے جان دفاع کے لیے جان ہلکان کر رہے ہیں۔اس سلسلہ میں بار بار ان کا ایک ہی سوال ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند کے بارے میں یہ اعتراف کرو۔بھائی!جس اعتراف پر آپ اتنا زور دے رہے ہیں،آپ اس میں کوئی ذاتی دشمنی نبھا رہے ہیں؟اگر آپ کو واقعی سرقہ اور جعلسازی سے دلچسپی ہے تو مولانا حالی،شبلی نعمانی،علامہ نیاز

فتح پوری، ڈاکٹر محی الدین زور، حامداللہ افسر سے لے کر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ملک حسن اختر اور وقار عظیم تک نقادوں کی ایک جید کھیپ ہے جن پر کسی نہ کسی رنگ میں سرقہ یا ترجمہ بلا حوالہ کا الزام لگا ہوا ہے۔آپ نے باقی سب کے معاملے میں بھی اتنی ہی پھرتی اور دلچسپی دکھائی جتنی اب ڈاکٹر نارنگ کے بارے میں دکھارہے ہیں؟ کیا ان سب کے بارے میں جاننے کے بعد آپ ان کے حوالے سے بھی اتنی ہی ایمانداری کے ساتھ اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ سرقہ یا ترجمہ بغیر حوالہ کا مسئلہ اُٹھائیں گے؟۔ان سب سے نمٹ لیں پھر نارنگ صاحب کے حصہ میں جو ملامت آئی اسے بھی اسی تناظر میں دیکھ لیجیے گا۔**ڈاکٹر فریاد آزر**''

2011/8/29 fariyad azer <fariyadazer@gmail.com>

اور اب اس مدلل بیان کا انتہائی کمزور اور نہایت بودا جواب جو اشعر نجمی صاحب کو خصوصی سہولت دے کر شائع کیا گیا، اس کے چند اہم حصے بھی دیکھ لیں۔

''**فریاد آزر صاحب**! میں خدا حافظ بول کر دوبارہ اس لیے ''بزمِ قلم'' میں حاضر ہو گیا ہوں، کیونکہ اس کے بعد آپ کا جو جواب آیا اس کا متن اور اسلوب دونوں چغلی کھا رہے تھے کہ قلم آپ کے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا ہے۔ممکن ہے کہ اب یا تو آپ کے ''استادِ محترم'' نے خود کمان سنبھال لی ہو یا پھر نارنگ صاحب کا کوئی تنخواہ بردار حق نمک ادا کر رہا ہو۔ورنہ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ اتنے سدھے ہوئے فقرے تو آپ کے فرشتے بھی نہیں لکھ سکتے۔۔۔۔۔۔ایک ہی سانس میں آپ مولانا حالی، شبلی نعمانی، علامہ نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محی الدین زور، حامداللہ افسر، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ملک حسن اختر اور وقار عظیم کا نام گنواتے ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ ان ناموں کو زبان پر لانے سے پہلے آپ نے وضو کیا تھا یا نہیں؟۔۔۔۔۔نارنگ صاحب کے پاس کوئی ایسا مرد ہی نہیں بچا جو خم ٹھونک کر سامنے آئے اور اپنی بات اپنی زبان سے کہے۔سب کے سب برقعہ پہنے ادھر اُدھر آسیب بن کر گھوم رہے ہیں''**اشعر نجمی** 8/30/11

ڈاکٹر فریاد آزر کی دلیل اور اشعر نجمی کے وضو کرنے والے فرمان میں کتنی ادبی سچائی اور طاقت ہے اس کا فیصلہ اہلِ ادب اور خاص طور پر اہلِ تحقیق خود ہی کرتے رہیں گے۔تب ارشد خالد نے ٹیلی فون پر بڑا عمدہ جملہ کہا کہ اگر فاروقی صاحب پر ایسا کوئی الزام لگ گیا تو پھر اسے تو وضو کر کے نہیں بلکہ غسل کر کے لکھنا پڑے گا۔جس قسم کی بحث انٹرنیٹ پر چل پڑی تھی، اس میں خود فاروقی صاحب کے سارے کارندے پورے تال میل کے ساتھ ایک دوسرے سے رابطہ میں تھے۔اور مختلف ناموں سے لکھ بھی رہے تھے، لکھوا بھی رہے تھے۔جب بحث مناظرانہ صورت اختیار کر رہی ہو تو ایک دوسرے سے رابطہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔اصل چیز تو وہ دلائل ہوتے ہیں جو فریقین کی جانب سے پیش کئے جارہے ہوتے ہیں۔ڈاکٹر فریاد آزر نے اگر کسی سے کوئی صلاح مشورہ کیا بھی ہو تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔اصل چیز ان کے دلائل ہیں اور ان کے جواب میں اشعر نجمی صاحب نے جو لکھا

ہے، اسی کی بنیاد پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کون اصولی بات کر رہا ہے اور کون جان چھڑانے کے لیے الزام تراشیوں کا سہارا لے رہا ہے۔اشعر نجمی صاحب کی الزام تراشی کے جواب میں یہاں ادبی طور پر بھی اور انٹرنیٹ پر موجود برقعہ پوشوں کے حوالے سے بھی دو اہم مثالیں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں نے اپنے مضمون ''فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی''میں واضح کیا تھا کہ اقبال نوید اور سلمان شاہد بھنڈر کے نام سے عمران شاہد بھنڈر خود لکھتے ہیں۔اس الزام کے بعد ظاہر ہے ان لوگوں کو اس کی مدلل تردید کرنے کی جرات نہیں تھی، اس لیے ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ دوسروں پر ایسا الزام لگانا شروع کر دو۔جھوٹ اور پروپیگنڈہ کے لیے بقول شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ویسے بھی کسی بنیاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔بس افواہ اڑا دیجیے اور اطمینان کر لیں کہ آپ پر لگا الزام دھل گیا۔

۲۷راگست ۲۰۱۱ء کو اسی فورم پر حسین چوہان نام کا ایک برقعہ پوش وارد ہوا۔اس کی غلیظ پوسٹ عمران شاہد کی مخصوص بدزبانی کو ظاہر کر رہی تھی۔اس پر ارشد خالد نے فوراً نوٹس لیتے ہوئے وہیں پر یہ لکھا:

''انٹرنیٹ پر حسین چوہان کے نام سے جو میل جاری کی گئی ہے یہ سو فی صد عمران شاہد بھنڈر خود ہے۔اس بارے میں تحقیق کرا لی جائے۔ننانوے فی صد نہیں پورے سو فیصد یہ حسین چوہان، عمران شاہد بھنڈر خود ہے۔اب جبکہ عمران شاہد کے انگلینڈ کے پرانے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں جو اپنا نام استعمال کرانے پر راضی تھے تو عمران نے فرضی ای میل آئی ڈیز بنانے شروع کر دیئے ہیں۔اس پر ایک نیم پاگل کا لطیفہ یاد آتا ہے۔جس نے ایک دوکان پر جا کر پوچھا کہ یہ فرج کتنے کا ہے؟ تو دوکاندار نے جواب دیا کہ یہ تمہیں نہیں بیچنا۔وہ مختلف بھیس بدل بدل کر دوکان پر جاتا رہا اور ہر بار پوچھتا کہ یہ فرج کتنے کا ہے اور ہر بار بھیس بدلا ہونے کے باوجود دوکاندار کہتا کہ یہ تمہیں نہیں بیچنا۔آخر اس نے پوچھا کہ تم کیسے پہچان لیتے ہو کہ بھیس بدل کر میں ہی آیا ہوں۔اس پر دوکاندار نے کہا کہ جسے تم فرج کہہ رہے ہو وہ واشنگ مشین ہے۔اس سے زیادہ کیا لکھوں؟**ارشد خالد**''

8/27/11

جیسے عمران بھنڈر صاحب کا پردہ فاش ہوا ان لوگوں نے ارشد خالد کے چبائے ہوئے نوالے آزمانے کا رویہ اپنا لیا۔اب انہیں ارشد خالد میں حیدر قریشی دکھائی دینے لگا، ڈاکٹر فریاد آزر میں نارنگ صاحب دکھائی دینے لگے۔

اس فورم پر علمی طور پر کھلی شکست کھانے کے بعد اشعر نجمی صاحب نے اپنا آخری حربہ آزما لیا۔ان کا اس فورم میں خاصا نہیں، خاصے سے زیادہ عمل دخل ہے، چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر فریاد آزر کے دلائل کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے ان کی فورم سے ممبر شپ ہی ختم کرا دی۔(چند روز کے بعد وہ ممبر شپ جزوی طور پر بحال کی گئی، اور اشعر نجمی کے جواب میں لکھی گئی جوابی میلز کو شائع نہیں کیا گیا) اپنے فورم پر جمیل الرحمٰن صاحب نے بھی سگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد کا فیصلہ صادر فرمایا تھا۔اور دوسرے فورم پر اشعر نجمی صاحب نے بھی بہ انداز دگر یہی کر

دکھایا۔لیکن دونوں صاحبان کے یہ اقدام کس اعتراف کی نشان دہی کرتے ہیں؟

بعض بہت ہی کمزور اور بے تکے قسم کے اعتراضات بھی کسی نہ کسی رنگ میں سامنے آئے ہیں۔ان میں سے ہر ایک کا جواب دینا مناسب نہیں۔ہاں کسی ادبی رسالہ میں ایسے اعتراضات شائع ہوئے تو پھر ان کا پورا جواب دیا جائے گا۔یہاں صرف اشعر نجمی صاحب اور عمران بھنڈر صاحب کے پروپیگنڈہ نما دو نہایت نا معقول اعتراضات کا جواب دے دیتا ہوں۔

جب ارشد خالد صاحب نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب، محمد عمر میمن صاحب اور سی ایم نعیم صاحب کے تاثرات انٹرنیٹ فورمز پر پیش کیے تو اشعر نجمی صاحب نے حقیقت جانتے ہوئے بھی شرارت کے طور پر کنفیوژن پھیلانے کی کوشش کی۔اور سوال کیا کہ یہ خطوط تو حیدر قریشی کے نام تھے، آپ کو کیسے مل گئے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ’’ردِعمل‘‘ کے عنوان سے میں بہت سارے احباب کے تاثرات ریلیز کر چکا ہوں جو خود اشعر نجمی صاحب کو بھی مل چکے تھے، جس کا ثبوت میرے پاس محفوظ ہے۔دوسری بات یہ کہ ارشد خالد صاحب اپنے عکاس میں میرا مضمون اور سارا ردِعمل ایک ساتھ ستمبر ۲۰۱۱ء کے شمارہ میں شائع کر رہے تھے۔عام احباب کو ریلیز کیے جانے کی بنیاد پر بھی اور اپنے رسالہ میں چھاپنے کی بنیاد پر بھی ان کی جانب سے ایسے خطوط کی اشاعت میں اچنبھے کی بات کونسی تھی؟ ہر چند ارشد خالد صاحب نے خود بھی یہ وضاحت دو فورمز پر کر دی ہوئی ہے تاہم میں یہاں اس لیے اس کا ذکر کر رہا ہوں تاکہ اس حلقہ کے منفی پروپیگنڈہ کی نوعیت اور حقیقت سامنے آسکے۔

دوسرا فرمان عمران بھنڈر صاحب کا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے خطیر رقم دے کر گوجرانوالہ کے ایک روزنامہ افکارِ جہاں میں اپنا مضمون شائع کرایا ہے۔قطع نظر اس سے کہ میرے پاس ادارہ افکارِ جہاں گوجرانوالہ کے ساتھ مراسلت کی ساری ای میلز محفوظ ہیں اور موقع محل کی مناسبت سے انہیں کبھی شائع بھی کیا جا سکتا ہے۔تاہم یہ واضح کر دوں کہ گوجرانوالہ کے افکار جہاں اور کولکاتا کے روزنامہ عکاس، دونوں اخبارات کو ایک پیسہ بھی نہیں دیا گیا۔دونوں طرف یہ مضمون ادبی محبت کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔گوجرانوالہ کے اخبار میں مضمون چھپوانے کی ایک خاص وجہ بھی ہے۔عمران بھنڈر صاحب نے عام طور پر خود کو ایک سیاسی گھرانے کا فرد ظاہر کر کے یہ تاثر بنایا ہوا ہے کہ گوجرانوالہ میں ان کا بہت زیادہ اثر رسوخ ہے، وہ جو چاہیں وہاں کر سکتے ہیں۔افکار جہاں میں مضمون چھپوا کر میں نے ایک متکبر کا تکبر توڑا ہے۔ڈاکٹر ظہور احمد اعوان صاحب مرحوم نے میرے بارے میں ایک بار لکھا تھا کہ حیدر قریشی شیر کو اس کی کچھار میں جا کر للکارتا ہے۔اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید اب کچھ اس قسم کی بات لکھتے کہ حیدر قریشی اگر شیر کو اس کی کچھار میں جا کر للکارتا ہے تو گیدڑ کی بھی اس کے اصل ٹھکانے پر جا کر چھترول کرتا ہے۔مجھے احساس ہے کہ یہ کچھ زیادہ ہو گیا ہے لیکن عمران بھنڈر کے مجموعی کردار کے تناظر میں ابھی بھی کم ہے۔

اب نام نہاد نوجوان فلسفی کا ذکرِ خیر شروع ہوا ہے تو ان کی بھی چند باتیں ہو جائیں۔موصوف نے براہِ راست میرے اہم سوالات کے جواب سے مکمل گریز کیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے خلاف بدزبانی کر کے یہ گمان کر لیا کہ میرے سوالات اور پیش کردہ حقائق سے نجات مل گئی۔اشعر نجمی اور جمیل الرحمٰن کی ملی بھگت سے بلائے ہوئے فیس بکی ساتھیوں نے اس قسم کے اعتراضات کو اچھالا کہ اگر بھنڈر صاحب نے پی ایچ ڈی نہیں کی تو کیا ہوا۔اور اگر وہ بے روزگار ہیں تو کیا ہوا۔یہ کوئی اعتراض ہیں۔اگر واقعی صرف ایسی ہی بات ہوتی کہ عمران بھنڈر صاحب پر محض یہ اعتراض کیا جاتا کہ وہ پی ایچ ڈی کیوں نہیں ہیں اور یہ کہ وہ کہیں شعبہ تعلیم میں استاد کیوں نہیں ہیں تو یقیناً یہ بے جا اعتراض ہوتے۔وہ صرف گریجوایٹ بھی ہوتے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا، وہ شعبہ تعلیم کی بجائے کسی اور شعبہ میں ملازمت کرتے، یا ویسے ہی بے روزگار ہوتے تب بھی ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔اعتراض کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ۲۰۰۷ء سے پوری اردو دنیا کو دھوکا دے رکھا ہے کہ وہ ’’پوسٹ ماڈرن لٹریری تھیوری‘‘ کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔جبکہ انہوں نے پی ایچ ڈی کے لیے اپنی رجسٹریشن ہی نہیں کرائی۔تو جب ایک کام شروع ہی نہیں کیا تو اس کا جعلی تاثر کیوں قائم کیا۔مسئلہ ڈگری لینے یا نہ لینے کا نہیں، مسئلہ جعل سازی کا ہے۔وہ اس معاملہ میں جعل سازی کے مرتکب ہوئے ہیں۔یہی معاملہ شعبہ تعلیم سے وابستگی کے بیان میں ہے۔دونوں باتیں جھوٹ ہیں اور اپنا جعلی تاثر قائم کرنے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔

عمران شاہد بھنڈر نے خود اور مختلف آئی ڈیز کے ذریعے بھی جو جواب دینے کی کوشش کی ہے، وہ محض گالی گلوچ ہے، اس کا دلائل اور شواہد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔میں نے خلاصۂ کلام میں چھ اہم نکات ابھارے تھے لیکن عمران شاہد بھنڈر کی بدحواسی نے ایک ساتویں نکتہ کو بھی اہمیت دے دی ہے۔جب عمران شاہد بھنڈر نے حسین چوہان کے نام سے بدزبانی شروع کی تو اس میں میری گھریلو زندگی کے بارے میں جھوٹ کے پلندے لکھنا شروع کیے۔میری ازدواجی زندگی پر جب بھی کسی ایسے کرم فرما نے کوئی غلط بات کی ہے، بعد میں اتہ پتہ کرنے پر وہ خود گھریلو زندگی کی مسرتوں سے محروم ایک لڑکھڑاتا ہوا انسان ظاہر ہوا۔میں کسی کی ازدواجی زندگی کی ناکامی پر خوش نہیں ہوتا۔عمران بھنڈر کی ازدواجی زندگی بھی ایسی ہی ناکام ہے۔اسی لیے انہوں نے اپنی فرسٹریشن نکالنے کے لیے اس قسم کی باتیں کی ہیں۔تاہم میں بھنڈر صاحب سمیت ایسی باتیں کرنے والے سارے کرم فرماؤں کی باتوں پر غصہ نہیں کروں گا۔مجھے حقیقتاً ان سب سے ہمدردی ہے۔اور دعا کرتا ہوں کہ ان کی زندگیوں میں میری ازدواجی زندگی جیسی آدھی خوشیاں ہی آجائیں تو شاید اس معاملہ میں ان کی ساری فرسٹریشن ختم ہو جائے۔

بھنڈر صاحب نے ارشد خالد کے بارے میں ’’بنک کا چپڑاسی‘‘ جیسے اہانت آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔اس سے ارشد خالد کا کچھ نہیں بگڑا البتہ عمران شاہد بھنڈر کا نچلے طبقے سے ہمدردی رکھنے والا مارکسزم ضرور ظاہر ہو گیا ہے۔میں مارکسسٹ نہیں ہوں لیکن یہاں اس بات کا اظہار فخریہ کرنا چاہوں گا کہ جب میں خانپور کی سڑکوں

پرہوائی چپل پہن کر گھوما کرتا تھا، ارشد خالد اُس زمانے میں موٹر سائیکل رکھتا تھا۔تب سے ہماری دوستی قائم ہے۔ ہر دوسرے موڑ پر مفادات کے چکر میں چکر چلانے والے لوگ زندگی میں ایک بھی ایسا دوست نہیں بنا پاتے جسے تیس یا چالیس سال کے بعد بتا سکیں کہ ہم اتنے عرصہ سے دوست ہیں اور وہ دوستی آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ انگلینڈ کے سرکاری کاغذات میں عمران بھنڈر صاحب کی جتنی انکم درج ہے، ارشد خالد کی پاکستان میں رہتے ہوئے سرکاری کاغذات میں اس سے زیادہ انکم ہے۔عمران بھنڈر صاحب کتنے قابلِ رحم ہیں کہ ان کے دامن میں نہ کوئی قابلِ فخر فیملی رشتہ ہے اور نہ ہی کوئی طویل دورانیہ کا دوست ۔

بات ہو رہی تھی عمران بھنڈر صاحب کے بارے میں ساتویں اہم نکتے کی۔حسین چوہان کے فرضی نام سے عمران بھنڈر صاحب کی بدزبانی عروج پر تھی، وہ تہذیب اور شائستگی سے بات کرنے کو تیار نہیں تھے۔تب ارشد خالد نے عمران بھنڈر کے لہجے میں انہیں جواب دیتے ہوئے سلمان شاہد بھنڈر کے نام کے راز سے ہلکا سا پردہ سرکایا۔ پہلے ارشد خالد کا عمران بھنڈ راسٹائل میں (جیسا منہ ویسی چپیڑ کے مطابق) جواب پڑھ لیں:

”**عمران شاھد بھنڈر عرف حسین چوھان**!تم کہاں سے گر کر ذلت کے کس مقام پر پڑے ہو پھر بھی تمہیں احساس نہیں ہو رہا۔ جب تمہاری جعلسازی کے راز کھل گئے تو اب دوسروں پر الزام تراشی کر رہے ہو۔تمہارا سرقہ اور پی ایچ ڈی کی جعل سازی، شعبہ تعلیم سے وابستگی کا ڈرامہ، سلمان شاہد کا فریب سب کھل گیا ہے تو اب ہم پر ہی اپنے کرتوت کے الزام لگا رہے ہو۔تمہارے جعلی آئی ڈیز کے بارے میں کیسے پتہ چل جاتا ہے ،اس کا اقبال نوید سے پوچھو۔اقبال نوید سے یہ بھی پوچھو کہ یہ خبر کیسے نکل گئی کہ سلمان شاہد بھنڈر تمہارا چھوٹا بھائی نہیں بلکہ بیٹا ہے۔لیکن تم تو انگلینڈ میں خود کو غیر شادی شدہ کہتے ہو تو یہ بیٹے کا کیا ماجرا ہے۔اس سے زیادہ تمہیں کیا جواب دوں؟ تم ذلت کی جس گہرائی میں گر چکے ہو وہاں سے تمہیں اب کوئی بھی نہیں نکال سکتا۔ **ارشد خالد**“

8/29/11

ساتواں نکتہ یہ نکلا کہ سلمان شاہدان کا بیٹا ہے لیکن وہ خود کو انگلینڈ میں غیر شادی شدہ بتاتے ہیں۔شادی کے بغیر بیٹا۔۔۔کہاں کیا چکر ہے؟ چنانچہ جیسے ہی یہ بات سامنے آئی عمران بھنڈر عرف حسین چوہان کی آگ اگلتی زبان یک دم صلح جو ہو گئی۔دوسروں کے گھروں کے بارے میں نہایت بے حیائی کے ساتھ یک سر جھوٹ لکھنے والے عمران بھنڈر صاحب کو جیسے ہی اپنے کسی خفیہ سچ کا سامنا کرنا پڑا تو ایک دم شائستگی کا ڈرامہ شروع کر دیا۔اس کے جواب میں موصوف نے یہ پوسٹ شائع کی۔

”**محترم خواتین وحضرات**! آئیں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا بند کریں۔اور ایک صحت مند علمی و ادبی مکالمے کی جانب بڑھیں۔میں نے برطانیہ کے ایک ریڈیو اسٹیشن پر جدلیات اور مابعد جدیدیت کے تعلق کے بارے میں ایک انٹرنیشنل مذاکرے کا اہتمام کیا ہے۔اس کے تمام تر اخراجات میں خود ادا کروں گا۔میں نے سوچا

ہے کہ ایک ہی پلیٹ فارم پر عمران شاہد بھنڈر، گوپی چند نارنگ، حیدر قریشی اور ناصر عباس نیر کو اکٹھا کیا جائے۔اور مابعد جدید تھیوری کے بارے میں ریڈیو پر تجزیاتی مباحثہ کرایا جائے۔ یہ مذاکرہ لائیو ہوگا۔اس میں یہ سب احباب حصہ لیں۔اس مکالمے کو پوری دنیا میں ریڈیو پر سنا جا سکے گا۔احباب خود فیصلہ کریں گے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔کس کے پاس کتنا علم ہے۔دوسروں کی کتاب کو سامنے رکھ کر کتاب لکھنا آسان ہے۔انہی موضوعات پر لائیو مباحث میں سب کی علمیت کا پول کھل جائے گا۔میری ان تمام احباب سے گزارش ہے کہ وہ اپنی رضامندی کا اظہار کریں تاکہ بات آگے بڑھ سکے۔مذاکرے کا موضوع ہوگا”مابعد کانٹین ازم جنم لینے والی اثباتی جدلیات، منفی جدلیات اور اس کا مابعد جدیدیت سے تعلق“۔حیدر قریشی کے لیے اپنی علمیت کو ثابت کرنے کا یہ بہترین موقعہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اسے ضائع نہیں کرے گا۔آپ کا **حسین**“ 8/29/11

اس سے ان کی کمزوری کھل کر سامنے آ گئی، سو اب یہ جاننا بھی ضروری ہو گیا ہے کہ عمران بھنڈر صاحب جب اپنی حمایت اور اپنے مخالفین کی سرکوبی کے لیے اپنے کمسن بیٹے سلمان شاہد بھنڈر کا نام استعمال کرتے رہے ہیں، خود کو غیر شادی شدہ بھی جتاتے رہے ہیں، تو غیر شادی شدہ باپ ہونے میں کیا بھید ہے؟۔اگر یہ سوال عمران بھنڈر کو بدتہذیبی ترک کر کے قلمی طور پر مہذب بنا سکتا ہے تو اس سوال کو مسلسل اٹھاتے رہنا چاہیے۔سو میں خلاصۂ کلام کو دہراتے ہوئے اب چھ نکات کی بجائے سات نکات کے طور پر پیش کروں گا۔کسی بدتہذیب اور بے لگام کو تہذیب سکھانے اور لگام دینے کے لیے یہ نکتہ ابھارتے رہنا ضروری ہو گیا ہے۔سو چھ نکاتی خلاصۂ کلام کو ساتویں نکتہ کے اضافہ کے ساتھ یہاں درج کر رہا ہوں۔ان سب کا جواب عمران بھنڈر صاحب پر ابھی تک قرض ہے۔اور کسی تھرڈ کلاس نوعیت کی الزام تراشی اور گالی گلوچ کے ذریعے ان سے نجات ممکن نہیں ہے۔ترتیب وار جواب دینے کی صورت میں ہی ان سے نجات ملے گی ورنہ یہ ساتوں نکات ان کی پیشانی پر لکھے رہیں گے اور چمکتے رہیں گے۔

خلاصۂ کلام:

۱۔عمران شاہد بھنڈر نے 2007ء میں اپنے آپ کو پی ایچ ڈی کا سکالر بتایا، پی ایچ ڈی کے موضوع Postmodern Literary Theory تک کو چھپوا کر اردو دنیا کو دھوکہ دیا، جعل سازی سے کام لیا، اپنے جعلی علم کا رعب قائم کرنے کی کوشش کی۔جبکہ 2007ء سے لے کر جون 2011ء تک، انہوں نے پی ایچ ڈی کرنا تو درکنار ابھی تک رجسٹریشن بھی نہیں کرائی۔ یہ ادبی دنیا کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔واضح جعل سازی ہے۔

۲۔خود کو شعبۂ تعلیم سے وابستہ کہنا بھی جعل سازی اور دھوکہ دہی ہے۔اس وقت تو شعبۂ تعلیم سے اس حد تک بھی وابستہ نہیں جتنا پرائمری کلاس کے کسی طالب علم سے لے کر کالج تک کا کوئی طالب علم بطور طالب علم وابستہ ہو سکتا ہے۔جبکہ شعبۂ تعلیم سے وہ اپنی وابستگی تو ایسے ظاہر کر رہے ہیں جیسے کہیں لیکچرر یا پروفیسر لگے ہوئے ہوں۔کیا وہ ایسے جعلی تعارف کے بغیر خود کو معزز محسوس نہیں کرتے؟

۳۔خود کو بقلم خود اور بزبان خود ''نوجوان فلسفی'' کہلوانا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔عمران بھنڈر مابعد جدیدیت کی درسی نوعیت کی طالب علمانہ تشریحات سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے۔اس میں بھی ان کا مطالعہ غیر ہضم شدہ ہے اور اس غیر ہضم شدہ کے اثرات جابجا دکھائی دیتے ہیں۔فلسفی کے لیے جس میلان اور غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں سرے سے موجود نہیں۔اسی لیے شدت سے کہتا ہوں کہ موصوف اپنی یہ بچکانہ کتاب انگریزی میں چھپوائیں ،مغربی دنیا کو بھی اس فلسفیانہ تماشے کا اندازہ ہو جائے گا۔اور اگر ہمیں اپنے ''نابغہ'' کو شناخت کرنے میں غلط فہمی ہو رہی ہے تو یہ بھی دور ہو جائے گی۔ورنہ ہمارے فلسفی بھائی کی خوش فہمی تو ختم ہو گی۔

۴۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ترجمہ بلا حوالہ کا معاملہ ادب کی تاریخ کے حوالے ہو چکا۔عمران کا یہی ایک کام ہے جس کا تھوڑا بہت ذکر کیا جا سکے گا۔ان کے اس کام کو بھی ان دوسرے بہتر نقادوں اور دانشوروں کے کام کے تناظر میں ہی دیکھا جا سکے گا جو متعدد ادیبوں کے ترجمہ بلا حوالہ کی نشان دہی کر چکے ہیں۔اور انہوں نے ایسی نشان دہی کر کے کوئی اچھل کود بھی نہیں کی۔یوں ایک مجموعی کارکردگی میں عمران بھنڈر پچاس یا سو ادیبوں کے ترجمہ بلا حوالہ کی نشان دہی کیے جانے کا ایک پرسنٹ ہی داد سمیٹ پائیں گے۔اس داد پر جتنا خوش ہو سکتے ہیں، ہوتے رہیں۔

۵۔عمران شاہد خود بھی کاری گری کے ساتھ سرقات کا ارتکاب کر چکے ہیں۔اس سلسلہ میں ایک ثبوت پیش کر دیا گیا ہے۔

۶۔عمران شاہد بھنڈر جو سلمان شاہد بھنڈر کے نام سے خود ہی اپنی تعریف میں اور اپنے مخالفین کی مذمت میں مضامین لکھتے رہے ہیں،اس بارے میں اب یہ بات کھل گئی ہے کہ سلمان شاہد بھنڈر ان کا کم سن بیٹا ہے۔بچے کی قانونی حیثیت کیا ہے،ہمیں اس سے غرض نہیں ہے لیکن عمران بھنڈر ابھی تک خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کرتے رہے ہیں،تو دوسروں پر غلیظ اور جھوٹے حملے کرنے سے پہلے غیر شادی شدہ باپ کی حیثیت سے انہیں اپنی اخلاقی حیثیت کا بھی سامنا کرنا ہو گا۔

۷۔''نوجوان فلسفی'' ادب میں تخلیقی صلاحیت سے تو یکسر عاری ہیں،ان کی ادب فہمی پر بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔جب تک وہ اردو ادب کا قدیم سے جدید تک ایک عمدہ انتخاب کر کے،تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کر کے اپنی ادب فہمی کا ثبوت نہیں دیتے ،وہ اس معاملہ میں ادبی طور پر خالی ہاتھ ہیں۔ادب میں ان کی حیثیت ایک درانداز سے زیادہ کچھ نہیں۔

ادبی درانداز عمران بھنڈر صاحب کے بارے میں بعض دوستوں نے دلچسپ پیرائے میں اس حقیقت کو ابھارا ہے کہ موصوف اپنے نصابی مطالعہ سے باہر آئیں تو ان کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔اگر ان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ آپ نے کانٹ ،ہیگل، مارکس اور دریدا کے ذکر کے بغیر کچھ لکھنا ہے تو موصوف ایک سطر بھی

شاید نہیں لکھ سکیں گے۔اگر کبھی کوئی دوست اور عمران بھنڈر کے خیر خواہ انہیں اس راہ پر لے آئے کہ مذکورہ فلسفیوں اور دانشوروں کا ذکر کیے بغیر یہ کچھ لکھنے کے قابل ہو جائیں تو اسے بھی اچھا آغاز سمجھا جا سکتا ہے۔اردو ادب کا اپنی پسند کا ایسا انتخاب کرنے کی عمران بھنڈر کو آزادی ہے جسے وہ اپنی دانست میں اعلیٰ اردو ادب میں شمار کر سکیں۔پھر ان منتخب فن پاروں پر وہ مضامین لکھنا شروع کریں اور کانٹ سے دریدا تک اپنے نصابی مطالعہ والے مفکروں کے حوالوں کے بغیر مضامین لکھنا شروع کریں تو اردو دنیا پر پوری طرح کھل جائے گا کہ عمران بھنڈر صاحب کس پائے کے نقاد ہیں۔یا یہ کہ نقاد ہیں بھی یا نہیں۔لیکن مجھے معلوم ہے عمران بھنڈر اس سنجیدہ کام سے فرار کے لیے سو بہانے تراش لیں گے کیونکہ یہ ان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں!

بات ہو رہی تھی عمران بھنڈر عرف حسین چوہان کے صلح جو بیان اور مکالمہ کی دعوت کی۔موصوف نے جس طرح صحت مند علمی مکالمہ کی ریڈیائی دعوت دی ہے،اس میں بھی وہی ان کے اندر گوجرانوالہ کے دھوتی پہنے ہوئے پہلوان والا انداز شامل ہے۔تہذیب اور تمیز کے ساتھ لکھ سکیں تو ریڈیائی مکالمہ (ڈرامہ) کے مقابلہ میں قلمی مکالمہ زیادہ بہتر ہوتا ہے۔مقصد علمیت بگھارنا نہیں ہوتا بلکہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لا کر ان پر مزید غور وفکر کرنا ہوتا ہے۔عمران بھنڈر جس انداز میں اپنی علمیت بگھار رہے ہیں اس سے مجھے یونان کے ایک دانشور کی بات یاد آ گئی۔عمران بھنڈر، حسین چوہان، سلمان شاہد اور اقبال نوید (اصل میں چاروں ایک ہیں) جیسے لوگ مل کر اس دانشور کے پاس گئے اور اس سے کچھ پوچھنے اور ڈسکس کرنے لگے۔اُس بھلے آدمی کو ان چاروں کی اصلیت اور علم کا اندازہ تھا،اس نے کہا کہ بھائی مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔اس پر ''اِن چاروں'' جیسے لوگوں نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا جب ہمیں بھی معلوم نہیں اور تمہیں بھی معلوم نہیں تو ہم میں اور تم میں کیا فرق ہوا؟
اس پر اس دانشور نے متانت کے ساتھ جواب دیا: فرق یہ ہے کہ مجھے اس کا ادراک ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جبکہ تم لوگوں کو اس کا ادراک بھی نہیں ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔

تو عمران بھنڈر صاحب! جس دن آپ کو یہ ادراک ہو گیا کہ آپ واقعتاً زندگی، فلسفہ اور ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اس دن آپ کے علمی اور ادبی سفر کا آغاز ہو جائے گا۔اب دیکھتے ہیں کہ آپ کب تک اس سفر کا آغاز کر پاتے ہیں۔

اس مہذب چیلنج میں ''مابعد کانٹین ازم جنم لینے والی اثباتی جدلیات، منفی جدلیات اور اس کا مابعد جدیدیت سے تعلق'' کا موضوع حسین چوہان نے ازخود منتخب کیا ہے۔اس موضوع سے ہی میری اس بات کی ایک بار پھر تصدیق ہو گئی کہ عمران بھنڈر ابھی تک اپنے ایم اے کے نصابی کنویں میں ہی موٹر سائیکل چلا رہے ہیں۔وہی کانٹ، اس کے بعد جدلیات کے حوالے سے خود بخود ہیگل آئے گا، پھر کارل مارکس، اور مارکس کے بعد دریدا۔۔۔اور پھر اردو والوں کے بارے میں وہی باتیں جو گزشتہ مضمون میں پہلے بتا چکا ہوں۔اس کے باوجود اگر وہ ''تمام تر اخراجات''

میں مدعو کردہ چاروں احباب کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کی قیمت بھی ادا کر رہے ہیں تو ہم ان کی زیارت کی خاطر ہی سہی ضرور آئیں گے۔اچھا ہوگا کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور اشعر نجمی صاحب کو بھی مدعو کر لیں۔سب مل کر آپ کا ریڈیو اسٹیشن ہی دیکھ لیں گے۔

عمران بھنڈر صاحب کو فیس بک اور انٹرنیٹ کی دنیا سے ہٹ کر اعلیٰ علمی و ادبی شخصیات کس انداز سے دیکھ رہی ہیں، وہ بیشتر ردِ عمل الگ سے چھپ گیا ہے (مزید موصولہ ردِ عمل بھی چھپتا رہے گا) تاہم اس کی جھلک کے طور پر یہاں دو اہم ادبی شخصیات کے تاثرات تبرک کے طور پر شامل کر رہا ہوں۔عمران بھنڈر اپنے آپ کو اس آئنہ میں دیکھیں اور اپنی اصل شناخت کو سمجھیں۔

''مجھے۔۔۔بھنڈر صاحب کا وہ مضمون پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے جو انھوں نے حیدر قریشی صاحب کی حقیقت بیانی سے برانگیختہ ہو کر لکھا ہے۔دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے آج کے معاشرے میں ہر شخص ''جھوٹ'' کو لے اڑتا ہے۔اور سچ سننے سے گریز کرتا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ '' شاہ دولہ کا چوہا'' بھی سر پر تاج زرنگار پہنائے جانے پر فخر کرتا ہے۔اور اپنی حقیقت کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔حیدر قریشی صاحب نے ایسے ہی لوگوں کے خلاف تیغ برّاں ہونے کا ثبوت دیا ہے۔'' **ڈاکٹر انور سدید** (لاہور)

Thank you for sending this "ne'mat-e ghair mutaraqqiba." I read the whole article right away and felt immense pity for the man. Much as I admire your zeal in exposing such impostors, I also feel that your time is far too precious to be wasted on such non-entities. When the controversy was hot, I frequently thought of joining the fray and throw in my two-cents worth, but something prevented me. In retrospect I feel I rightly saved myself from a wasteful undertaking. But I also think that such impostors need to be exposed and cut down to their size. Somebody has to do it, even if it is wasteful, even if the culprit is a non-entity, and you are doing it. We must all be grateful to you:

سب پہ جس بار نے گرانی کی اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

But I cannot call you a "natavan."So keep on with the good work . Warmly, **m u memon**

محمد عمر میمن۔(امریکہ)

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے نادان دوستوں نے اس معاملہ میں اتنی بدحواسی کے ساتھ ٹانگ کیوں اڑائی کہ فاروقی صاحب کے اس خدشہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہونے دی جس کا ذکر شروع میں کر آیا ہوں۔اس کی بنیادی وجہ سرقہ یا جعلسازی کے خلاف صحت مند رویہ نہیں بلکہ صرف اس گروپ کی نارنگ دشمنی ہے۔ماتم کرنے والے دوستوں کا زیادہ شور اس بات پر ہے کہ عمران شاہد بھنڈر صاحب کی اصلیت ظاہر کر کے اس سارے کام کو غارت کر دیا گیا ہے جو ان کے مضامین کی صورت میں نارنگ صاحب کے خلاف یکجا ہوا تھا۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

صاحب ہوں یا شمس الرحمٰن فاروقی صاحب، زبیر رضوی صاحب ہوں یا علی جاوید صاحب۔۔۔ان سب کی ہندوستانی فضا میں باہمی چپقلش ان کے ذاتی یا مقامی نوعیت کے نیم مفاداتی اور نیم ادبی معاملات ہیں۔مجھے نہ ان میں کوئی دخل دینا ہے اور نہ مجھے ان معاملات میں دلچسپی ہے۔یہ کئی برسوں سے چلتی آ رہی مناقشت ہے، جس سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں۔جب میرا نارنگ صاحب کے نادان دوستوں کے ساتھ معرکہ چل رہا تھا اور ان مذکورہ بالا احباب میں سے بعض لوگ میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے تو مجھے اندازہ تھا کہ ان لوگوں کو سرقہ یا جعل سازی کے موضوع سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے بلکہ انہیں صرف اپنی نارنگ دشمنی سے غرض ہے۔اس کے باوجود میرے لیے ان کی حوصلہ افزائی بہرحال کچھ نہ کچھ تقویت کا موجب بنی۔تاہم میرے پیش نظر تب بھی بنیادی اہمیت سرقہ اور جعل سازی کے موضوع کو حاصل تھی اور اب بھی میری نظر میں شخصیات کا تقدس کوئی معنی نہیں رکھتا۔اور اس کے لیے کسی کے فائدہ اور نقصان کو میں نے کبھی مطمح نظر نہیں بنایا۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب پر ترجمہ بلا حوالہ کا جو الزام ہے اس کا جواب وہی دے سکتے ہیں۔تاہم اب اگر مولانا حالی، شبلی نعمانی، علامہ نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محی الدین زور، حامد اللہ افسر، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ملک حسن اختر اور وقار عظیم جیسے معتبر نام بھی ترجمہ بلا حوالہ کے سلسلہ میں سامنے آ گئے ہیں اور عمران بھنڈر کی جعلسازیاں اور سرقہ بھی سامنے آ گیا ہے تو یقیناً نارنگ صاحب پر لگے الزام کو بھی اس مجموعی تناظر میں دیکھنا چاہیے اور دوستی و دشمنی کی سطح سے بلند ہو کر دیکھنا چاہیے۔اگر بیس پچیس لوگوں نے ملتا جلتا کام کیا ہے تو سب کے ساتھ ایک اصول کے تحت سلوک کیا جانا چاہیے۔مذکورہ بالا جید ناموں کے سامنے آنے کے بعد اب میرا موقف بالکل سیدھا سادہ سا ہے۔جن لوگوں نے اردو ادب میں کوئی قابلِ ذکر کام کیا ہے، ان کے مجموعی کام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔کسی پر ترجمہ بلا حوالہ کا الزام ہے تو اسے کسی تعصب اور ترجیح کے بغیر پرکھنا چاہیے۔پھر اگر یہ کمزوری ثابت ہو جاتی ہے تب بھی اس کی دوسری خدمات کی نفی نہیں کی جا سکتی۔کمزوری کو ظاہر کیا جانا چاہیے لیکن دوسری خدمات کا انکار نہیں کیا جانا چاہیے۔مولانا حالی سے لے کر آج کے ادیبوں تک یہ رویہ ہر ایک کے لیے یکساں طور پر اختیار کیا جانا چاہیے۔یہ نہیں کہ کسی کا نام لینے کے لیے وضو کی شرط رکھ دینا اور کسی پر ذاتی رنجشوں اور کدورتوں کی گندگی اچھالتے جانا، یہ کوئی علمی اور تحقیقی رویہ نہیں ہے۔

میں نے بھنڈر صاحب کے بارے میں اپنے اولین مضمون کے سلسلہ میں بعض اہم دوستوں کی رائے لی تھی۔سی ایم نعیم صاحب نے اپنی ای میل میں بڑی صاف گوئی سے بھنڈر کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ:

''آپ نے ان کے مضامین چھاپے تھے، اس لیے یہ فرض بھی آپ پر عائد ہوتا تھا۔آپ کی دیانت داری کا یہی تقاضہ تھا۔نارنگ صاحب کے احباب کی خوشی یا ناخوشی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

میں سی ایم نعیم صاحب کے موقف کو اصولی موقف سمجھتا ہوں اور اسی کے مطابق میرا پہلا مضمون سامنے آیا تھا۔جس طرح نارنگ صاحب کے احباب کی خوشی یا ناخوشی اس اصولی معاملہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ویسے ہی

فاروقی صاحب کے نادان دوستوں اور دوسرے محض نارنگ دشمن احباب کا ماتم بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔اس قسم کے علمی وادبی معاملات کو تحقیقی اصولوں کے مطابق اور مجموعی ادبی تناظر میں شخصیات دشمنی کی سطح سے بلند ہوکر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ میرے مضمون کے نتیجہ میں نارنگ صاحب پر لگے الزام کی اہمیت متاثر ہوئی ہے،ان کا یہ تاثر درست نہیں۔میرے مضمون سے صرف عمران بھنڈر کی اصلیت کھل کر سامنے آئی ہے۔ادب میں دراندازی کرنے والے کی نشان دہی ہوئی ہے اور اسے تمیز اور تہذیب کے دائرے میں لانے کی ایک کاوش ہوئی ہے۔جہاں تک نارنگ صاحب پر لکھے ہوئے عمران بھنڈر کے مضامین کا تعلق ہے،خود شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ عمران بھنڈر کی دلیلوں سے نارنگ صاحب کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔سو مجھ پر غصہ اتارنے والوں کو فاروقی صاحب پر اپنا غصہ اتارنا چاہیے۔عمران بھنڈر کے حوالے سے میرے نام لکھے گئے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے خط کا متعلقہ اقتباس یہاں درج کر دیتا ہوں۔

’’جب ان کی کتاب مجھے ملی تھی تو میں نے کسی کو لکھا تھا کہ اس میں نارنگ کے خلاف جو کچھ ہے اس کے علاوہ باقی معمولی اور ژولیدہ بیانی کا شکار ہے۔اشعر نجمی نے جب ان کا مضمون چھاپا تھا تو میں نے ان سے کہا تھا کہ بھنڈر کو زیادہ جگہ اب مت دو۔ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔بھنڈر کو لوگ اب بھول رہے تھے، کیونکہ ان کی دلیلوں کے باوجود نارنگ کا کچھ بھی نہ بگڑا تھا۔‘‘ **شمس الرحمن فاروقی** (الہٰ آباد)

یہ انٹرنیٹ پر اٹھائے جانے والے طوفان کی کچھ روداد اور پس منظر میں موجود چند حقائق تھے جو میں نے پیش کر دیئے ہیں۔غمگسارانِ بھنڈر نے مزید طوفان اٹھایا تو اس کا جواب بھی اسی طرح کے مضمون کی صورت میں مزید دلائل کے ساتھ پیش کروں گا۔بہتر ہوگا کہ غم گسارانِ بھنڈر، اُن سے کہہ کر میرے خلاصۂ کلام کے ساتوں نکات کا ترتیب وار جواب دلوائیں۔انٹرنیٹ کے گروپس اور فیس بک وغیرہ پر ایسی بحث میں شرکت کرنا میرے لیے وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں۔سو یار لوگ وہاں جو چاہے موج کرتے رہیں۔

میں ایک وقفہ کے بعد ان کے سارے لکھے کا اسی طرح جائزہ پیش کر دیا کروں گا۔یار زندہ صحبت باقی۔

(تحریر کردہ ۴ر ستمبر ۲۰۱۱ء)

حیدر قریشی صاحب نے جب خود ان (عمران بھنڈر) کے سرقے پکڑے تو بھنّا اٹھے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ حیدر قریشی نے سراغ رسانی کی تو بھنڈر صاحب کی علمی فتوحات اور ان کی حالیہ ادبی مہمّات بھی محلِ نظر ٹھہرائیں۔لیکن یہ کیسا وقت آ پڑا ہے کہ سارق سرقے سے تو گریز نہیں کرتا اور سراغ رساں کے درپے ہو جاتا ہے۔اس روّیے کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

(’’**ادب در ادب**‘‘ از **ڈاکٹر انور سدید** مطبوعہ ہفت روزہ **ندائے ملت** لاہور شمارہ: ۲۲ ستمبر ۲۰۱۱ء)

حیدر قریشی

چند وضاحتیں

سات ستمبر ۲۰۱۱ء کے روزنامہ ’’انصاف‘‘ کے ادبی ایڈیشن میں محمد اعظم وڑائچ صاحب کا کالم میں نے توجہ سے پڑھا۔وہ عام طور پر ہلکا پھلکا اور طنزیہ ومزاحیہ قسم کا کالم لکھا کرتے ہیں۔جبکہ اس کالم کا موضوع نہایت حساس اور تحقیقی نوعیت کا ہونے کے باعث سنجیدگی اور بہت زیادہ تحقیقی رویے کا طالب تھا۔وڑائچ صاحب نے میرا موقف واقعتاً پوری طرح پڑھ کر یہ سب کچھ لکھا ہوتا تو مجھے ان کے ان تاثرات سے بھی کوئی افسوس نہ ہوتا۔یہ کالم آدھے ادھورے مطالعہ کا غماز ہے۔جدید ادب جرمنی میں کسی بھی گروپ کی ترجمانی نہیں کی جاتی۔نئے پرانے لکھنے والوں میں سے جو بھی اپنی تخلیقات بھیجتے ہیں،اگر وہ رسالے کے مزاج کے قریب ہوں تو انہیں احترام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔اس لیے کسی کو چھاپنا اور کسی کو نہ چھاپنا والی بات مناسب نہیں ہے اور محض سنی سنائی کو آگے بڑھانے جیسی ہے۔

بھنڈر صاحب کے بدتہذیبی پر مبنی رویے کی وجہ سے ان سے میرا تعلق بہت پہلے کا ٹوٹ چکا تھا۔میں ایک ہی وقت میں دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتا تھا،اس لیے ان کے معاملہ میں احتیاط سے کام لے کر خاموشی اختیار کرنا لازم تھا۔جہاں تک ادبی طور پر سوچ کے واضح فرق کا تعلق ہے اس کا اظہار میری طرف سے اور میرے دوستوں کی طرف سے ’’اختلافی نوٹ‘‘ کی صورت میں شروع سے ہی کیا جا رہا تھا۔اس سلسلہ میں میرے پہلے مضمون ’’فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی‘‘ میں بہت سارے اقتباسات دے کر اس حقیقت کو واضح کیا جا چکا ہے۔یہ مضمون سچ مچ میں پڑھ لیا ہوتا تو اس قسم کے اعتراضات گھڑنے کی نوبت نہ آتی کہ ہم مل کر جدید ادب میں ’’کاروائیاں‘‘ کرتے تھے۔ایک متضاد سوچ کے حامل کو ہم نے رسالے میں جگہ دی،اس کی واضح وجہ تھی،سرقہ اور جعل سازی میرا اہم مسئلہ ہے اور میں گزشتہ بارہ برسوں سے یورپ میں بیٹھ کر یہ کام کر رہا ہوں اور حسبِ توفیق یار لوگوں سے گالیاں کھا رہا ہوں۔سو جب بھنڈر صاحب نے ترجمہ بلا حوالہ کے نام پر کچھ لکھا تو میں نے اپنے معمول کے مطابق اسے اہمیت دی۔تاہم میں نے دیکھا کہ وہ سو صفحات لکھتے ہیں تو اس میں سے بمشکل دس صفحات کام کے نکلتے ہیں۔چنانچہ میں ان سے بیزار ہو گیا تھا۔پھر ان کی بدتمیزی کے بعد (اس کا سارا ذکر میرے پہلے مضمون میں آچکا ہے) ان سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔اس کے باوجود ان کو جب بھی کسی طرف سے مار پڑتی تو پھر بھاگ کر میرے

پاس آتے۔اس کی ایک تازہ مثال اِسی برس کی ہے۔جب نظام صدیقی صاحب نے ایک مضمون میں ان کی ٹھیک ٹھاک مرمت کی تو پھر میری طرف بھاگے۔۱۳رجنوری ۲۰۱۱ءکو مجھے ای میل بھیجی،اس میں نظام صدیقی کا مضمون بھیجا اور ساتھ لکھا کہ اقبال نوید اس کا جواب لکھنے کو تیار ہے۔میں نے تب بھی ان کو جھٹک دیا تھا۔

''فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی'' ریلیز کیے جانے کے بعد مجھے سنجیدہ ادبی شخصیات کی طرف سے اچھا ردِعمل موصول ہوا،اس سارے ردِعمل کو یکجا کرتا جا رہا ہوں۔شائع بھی کرتا جا رہا ہوں۔اسی دوران بھنڈر صاحب نے سرقہ کے الزام سے اپنی بریت کے لیے ایک چالاکی سے کام لینا چاہا۔تب میں نے ''بسلسلہ فلسفی کی نوجوانی اور شیلا کی جوانی'' نامی وضاحت میں ان کی اصلیت مزید کھول دی۔انٹرنیٹ پر جو ہنگامہ برپا رہا۔اس میں میری شمولیت نہیں تھی۔ڈاکٹر فریاد آزر اور ارشد خالد نے وہاں کچھ اچھے جواب دیئے۔وہاں ہونے والی بحث کا جتنا میٹر مجھے دوستوں نے فارورڈ کیا،اسے سامنے رکھ کر میں نے ایک اور مضمون مکمل کر لیا ہے جس کا عنوان ہے''عمران بھنڈر کا سرقہ اور جعل سازی''۔یہ پہلے مضمون جیسا ہی مدلل،مربوط اور طویل مضمون ہے جس میں ہر بات شواہد کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

میرے پہلے مضمون کے جواب میں عمران بھنڈر صاحب دیر تک سکتہ کی حالت میں رہے،جب ہوش میں آئے تو ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر ناصر عباس نیر جیسے صاحبانِ علم کے خلاف زہر اگل کر سمجھ لیا کہ میری طرف سے پیش کیے گئے حقائق کا جواب دے دیا ہے۔میں بھنڈر صاحب کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ وزیر آغا اور انور سدید کے مقابلہ میں ان کا ذکر بھی کروں۔اعظم وڑائچ صاحب نے بھی کسی رنگ میں یہی بات کہی ہے۔تو پھر بھنڈر صاحب نے ابھی تک جواب کہاں دیا ہے۔ناصر عباس نیر صاحب کو میں نے بھنڈر صاحب کے بے تکے الزام سے آگاہ کیا تھا،انہوں نے تب ہی مجھے یہ عالمانہ جواب لکھ کر بھیجا تھا۔میں نے اسے انٹرنیٹ پر نہیں دیا کیونکہ وہاں میں سنجیدہ علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے مناسب ماحول نہیں دیکھتا۔وہاں سماجی تعلقات کے حوالے سے اچھی گنجائش ہے سو سماجی تعلقات بنتے ٹوٹتے رہتے ہیں۔اب چونکہ اخبار میں ناصر عباس نیر کے بارے میں بھی بغیر کسی ثبوت کے بات کر دی گئی ہے تو ان کا وہ جواب یہاں درج کر دینا مناسب ہے جو انہوں نے میرے استفسار پر لکھا تھا:

''میں اپنے اور اپنے مضامین کے خلاف لکھی گئی تحریروں کا جواب دینے کا قائل نہیں ہوں،اس لیے کہ بہ قول منیر نیازی:

کسی کو اپنے عمل کا حساب کیا دیتے
سوال سارے غلط تھے جواب کیا دیتے

مگر عمران بھنڈر نامی ایک نو وارد لکھنے والے نے میری ایک تحریر پر سرقے کا بہتان لگایا ہے۔موصوف اس علمی مرتبے کا حامل نہیں کہ اس کی باتوں پر دھیان دیا جائے،مگر بہتان اس قسم کا ہے کہ اردو ادب کے قارئین میں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے،اس لیے نہایت اختصار کے ساتھ اس کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

راقم نے چند سال پہلے ڈاکٹر وحید قریشی کے ارشاد کی تعمیل میں ساختیات اور مابعد جدیدیت پر کتابیں مرتب کی تھیں جو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ،لاہور سے شایع ہوئی تھیں۔ان کتابوں میں ان تنقیدی نظریات کی اصطلاحات کی فرہنگ بھی شامل کی گئی تھی۔یہ فرہنگ بعض رسائل میں بھی چھپی۔ان اصطلاحات میں آئیڈیالوجی بھی شامل تھی جو ادراک میں شایع ہوئی۔فرہنگ ہمیشہ تالیف ہوتی ہے۔فرہنگ کے مشمولات،مقالہ نہیں ہوتے۔راقم دونوں کی رسمیات اور آداب سے واقف ہے اور ہر دو میں ان کا مقدور بھر لحاظ رکھتا ہے۔راقم نے ہر اصطلاح کے آخر میں ان کتابوں کے حوالے دیے،جن سے استفادہ کیا گیا۔آپ جانتے ہیں بہتان ہمیشہ کسی منفی جذبے کے تحت لگایا جاتا ہے اور اس جذبے کی زد پر آ کر آدمی اصل باتوں کو چھپاتا یا انھیں مسخ کرتا ہے۔جمعہ جمعہ آٹھ دن کے اس ادیب نے بھی یہی کچھ کیا ہے۔یہ بات نہیں بتائی کہ وہ جن کتابوں سے سرقہ ثابت کر رہا ہے،ان کی پوری تفصیل ہر اصطلاح کے آخر میں دی گئی ہے۔وہیں سے وہ ان کتابوں کے ناموں سے واقف ہوا ہے۔اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا۔'' **(ناصر عباس نیر بنام حیدر قریشی)**

ناصر عباس نیر صاحب کی اس وضاحت کے بعد اب میری گزارش یہ ہے کہ جو دوست ان سارے حقائق کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ جاننا چاہتے ہیں،وہ میرے مذکورہ بالا مضامین اور دوسرے میٹر کو تحقیقی زاویے سے مطالعہ کریں اور پھر جو بھی لکھیں میں اس کا احترام کروں گا۔یہ بات خلافِ واقعہ ہے کہ بھنڈر صاحب نے مجھ پر گوجرانوالہ میں کوئی مقدمہ کر دیا ہے۔یہ ان کا چھوڑا ہوا شوشہ ضرور ہے لیکن وہ کہیں بھی میرے خلاف مقدمہ کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں۔میرے حوالے سے احمدی اور بہائی سلسلہ کی باتوں کا ان ادبی معاملات سے کیا تعلق ہے؟ مجھے افسوس ہے کہ میں ان ساری باتوں کے پیچھے اپنے اُن ''احمدی کرم فرماؤں'' کے چہرے صاف دیکھ رہا ہوں۔جنہوں نے وڑائچ صاحب کو یہ باتیں فیڈ کی ہیں(کرائی ہیں)۔عجیب بات ہے کہ ہم دنیا بھر میں اپنی مظلومیت کا ذکر بھی کرتے ہیں اور کہیں کوئی ذاتی عناد ہو تو پاکستانی ماحول کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہاں اپنے ہی بندوں کے بارے میں ایسی ایکسپلائٹیشن بھی پورے ایمانی جوش و خروش کے ساتھ کر لیتے ہیں۔میں ان ''جلوہ'' افروز دوستوں کی بلند ''پروازی'' کی داد دیتا ہوں۔خدا ان سب کو ستیہ پر قائم رکھے اور آنند عطا کرے۔لیکن کمال کی بات ہے کہ ایک طرف میرے لیے احمدی اور بہائی کے تمغے ہیں تو دوسری طرف مجھے طالبان میں سے بھی قرار دیا جا رہا ہے۔میں ان ساری باتوں پر ہلکا سا مسکرا سکتا ہوں۔لیکن ان سب کا ادب سے ادبی معاملات سے کیا تعلق ہے؟۔

مزید کسی لمبی بحث سے بچنے کے لیے یہاں اپنے دونوں مضامین کے خلاصۂ کلام کے طور پر سات نکات پیش کر دیتا ہوں۔عمران بھنڈر کے پاس ان کا کوئی سیدھا سادہ اور شریفانہ جواب ہے تو سامنے لائیں۔

خلاصۂ کلام:

۱۔عمران شاہد بھنڈر نے 2007ء میں اپنے آپ کو پی ایچ ڈی کا سکالر بتایا،پی ایچ ڈی کے موضوع Postmodern Literary Theory تک کو چھپوا کر اردو دنیا کو دھوکہ دیا،جعل سازی سے کام لیا،اپنے جعلی علم کا رعب

قائم کرنے کی کوشش کی۔جبکہ 2007ءسے لے کر جون 2011ءتک،انہوں نے پی ایچ ڈی کرنا تو درکنار ابھی تک رجسٹریشن بھی نہیں کرائی۔یہ ادبی دنیا کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔واضح جعل سازی ہے۔

۲۔خود کو شعبۂ تعلیم سے وابستہ کہنا بھی جعل سازی اور دھوکہ دہی ہے۔اس وقت تو شعبۂ تعلیم سے اس حد تک بھی وابستہ نہیں جتنا پرائمری کلاس کے کسی طالب علم سے لے کر کالج تک کا کوئی طالب علم بطور طالب علم وابستہ ہوسکتا ہے۔جبکہ شعبۂ تعلیم سے وہ اپنی وابستگی تو ایسے ظاہر کر رہے ہیں جیسے کہیں لیکچرر یا پروفیسر لگے ہوئے ہوں۔کیا وہ ایسے جعلی تعارف کے بغیر خود کو معزز محسوس نہیں کرتے؟

۳۔خود کو بقلم خود اور بزبان خود ''نوجوان فلسفی'' کہلوانا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔عمران بھنڈر مابعد جدیدیت کی درسی نوعیت کی طالب علمانہ تشریحات سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے۔اس میں بھی ان کا مطالعہ غیر ہضم شدہ ہے اور اس غیر ہضم شدہ کے اثرات جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔فلسفی کے لیے جس میلان اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں سرے سے موجود نہیں۔اسی لیے شدت سے کہتا ہوں کہ موصوف اپنی یہ بچکانہ کتاب انگریزی میں چھپوائیں،مغربی دنیا کو بھی اس فلسفیانہ تماشے کا اندازہ ہو جائے گا۔اور اگر ہمیں اپنے ''نابغہ'' کو شناخت کرنے میں غلط فہمی ہو رہی ہے تو یہ بھی دور ہو جائے گی۔ورنہ ہمارے فلسفی بھائی کی خوش فہمی تو ختم ہوگی۔

۴۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ترجمہ بلاحوالہ کا معاملہ ادب کی تاریخ کے حوالے ہو چکا۔عمران کا یہی ایک کام ہے جس کا تھوڑا بہت ذکر کیا جا سکے گا۔ان کے اس کام کو بھی ان دوسرے بہتر نقادوں اور دانشوروں کے کام کے تناظر میں ہی دیکھا جا سکے گا جو متعدد ادیبوں کے ترجمہ بلاحوالہ کی نشان دہی کر چکے ہیں۔اور انہوں نے ایسی نشان دہی کر کے کوئی اچھل کود بھی نہیں کی۔یوں ایک مجموعی کارکردگی میں عمران بھنڈر پچاس یا سو ادیبوں کے ترجمہ بلاحوالہ کی نشان دہی کیے جانے کا ایک پرسنٹ ہی داد سمیٹ پائیں گے۔اس داد پر جتنا خوش ہو سکتے ہیں،ہوتے رہیں۔

۵۔عمران شاہد خود بھی کاری گری کے ساتھ سرقات کا ارتکاب کر چکے ہیں۔اس سلسلہ میں ایک ثبوت پیش کر دیا گیا ہے۔

۶۔عمران شاہد بھنڈر جو سلمان شاہد بھنڈر کے نام سے خود ہی اپنی تعریف میں اور اپنے مخالفین کی مذمت میں مضامین لکھتے رہے ہیں،اس بارے میں اب یہ بات کھل گئی ہے کہ سلمان شاہد بھنڈر ان کا کمسن بیٹا ہے۔بچے کی قانونی حیثیت کیا ہے،ہمیں اس سے غرض نہیں ہے لیکن عمران بھنڈر ابھی تک خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کرتے رہے ہیں،تو دوسروں پر غلیظ اور جھوٹے حملے کرنے سے پہلے غیر شادی شدہ باپ کی حیثیت سے انہیں اپنی اخلاقی حیثیت کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔

۷۔''نوجوان فلسفی'' ادب میں تخلیقی صلاحیت سے تو یکسر عاری ہیں،ان کی ادب فہمی پر بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔جب تک وہ اردو ادب کا قدیم سے جدید تک ایک عمدہ انتخاب کر کے،تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کر کے اپنی ادب فہمی کا ثبوت نہیں دیتے،وہ اس معاملہ میں ادبی طور پر خالی ہاتھ ہیں۔ادب میں ان کی

حیثیت ایک در انداز سے زیادہ کچھ نہیں۔

آخری نکتہ کے سلسلہ میں وضاحت کر دوں کہ اردو کے اچھے اور معیاری ادب کا وہ جو بھی انتخاب کریں،اس کا مطالعاتی جائزہ پیش کرتے وقت ان پر پابندی ہوگی۔وہ اپنے ایم اے کے نصاب والے مفکرین کانٹ،ہیگل،مارکس اور دریدا کا کوئی ذکر نہیں کریں گے۔اردو ادب کا مطالعہ مذکورہ مفکرین کے حوالوں کے بغیر ہونا چاہیے۔یہ کھلی حقیقت ہے کہ ایم اے کے ان نصابی ناموں کے علاوہ انہیں کچھ آتا ہی نہیں ہے۔یہ میری طرف سے پوری ادبی دنیا کے سامنے بھنڈر صاحب کو چیلنج ہے۔یہ سنجیدہ اور عملی تنقید کا کام کر کے ہی وہ کسی شمار میں آئیں گے۔متعدد ادیبوں نے اردو میں ترجمہ بلاحوالہ یا سرقات و جعلسازی کی نشان دہی کی ہے لیکن محض یہ کام کسی کو نقاد ثابت نہیں کرتا۔ان ناقدین اور محققین کی شناخت کسی کے سرقہ کی نشان دہی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کام کی بنیاد پر ہے جو عملی تنقید کے طور انہوں نے پیش کیا ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ **انصاف** لاہور۔۱۴؍ستمبر ۲۰۱۱ء)

اخبار میں مطبوعہ مضمون کے آخر میں یہ نوٹ بھی دیا گیا تھا:

''زیرِ نظر مضمون میں کیونکہ حیدر قریشی صاحب نے محمد اعظم وڑائچ کے کالم کا جواب دیتے ہوئے عمران شاہد بھنڈر پر الزامات کا پلندہ ڈال دیا ہے۔اس لیے اگر وہ اپنی صفائی میں کچھ لکھنا چاہے تو ''انصاف'' کا ادبی ایڈیشن غیر جانبدار ہوتے ہوئے ان کے لئے حاضر ہے۔''

ادارہ انصاف کی جانب سے کھلی پیش کش کے باوجود عمران بھنڈر کو وہاں بھی سات نکات پر اپنا موقف واضح کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔(ح۔ق)

Imran Bhinder is not really a person belonging to literary world. He just got in. His first article I read in Narange Kheal. I found some truth in it, though, presentation was not impressive. He should have been pointed out at that stage and advised to re-write the article and should be more logical and to the point ..... he was hailed by every one he became too proud of himself. Which is not a good thing. His book has almost four hundred pages. It could have been completed within less than two hundred pages. The whole book goes round Narang. It is good to find out new things and make discoveries but enmity is not a positive emotion.

Hamida Moin Rizvi (London) 10.September.2011

ڈاکٹر نذر خلیق (راولپنڈی)

حیدر قریشی کی وضاحتوں کے حوالے سے

روزنامہ انصاف کے ادبی ایڈیشن مورخہ ۱۴ستمبر۲۰۱۱ء میں حیدر قریشی کا وضاحتی مضمون پڑھا۔اس سے پہلے میں عمران شاہد بھنڈر کے حوالے سے ان کے پہلے تینوں معرکتہ الآراء مضامین اور عمران شاہد بھنڈر کا ایک گالیوں بھرا جواب بغور پڑھ چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان مضامین سے تحقیق وتنقید کے سلسلے کو نئے سرے سے جانچنا ضروری ہو گیا ہے۔حیدر قریشی نے خلاصۂ کلام کے عنوان سے جو سات نکات پیش کئے ہیں،ان کی بڑی اہمیت ہے۔اچھی بات یہ ہوگی کہ عمران شاہد بھنڈر ان کا نمبروار جواب دیں۔اگر وہ اصل نکات کو چھوڑ کر گفتگو کا رُخ کسی اور طرف موڑتے ہیں تو اس سے بات نہیں بنے گی۔میں یہاں حیدر قریشی کے اٹھائے گئے نکات کو ایک ایک کر کے پھر بیان کرتا ہوں اور ہر نکتے کے ساتھ دو امکانی جواب لکھتا ہوں۔عمران شاہد بھنڈر اس انداز میں کوئی جواب لکھیں تو ان کی تباہ شدہ ساکھ کچھ نہ کچھ بحال ہو سکتی ہے۔

نکتہ نمبر ایک:۔’’عمران شاہد بھنڈر نے 2007ء میں اپنے آپ کو پی ایچ ڈی کا سکالر بتایا، پی ایچ ڈی کے موضوع Postmodern Literary Theory تک کو چھپوا کر اردو دنیا کو دھوکہ دیا،جعل سازی سے کام لیا،اپنے جعلی علم کا رعب قائم کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ 2007ء سے لے کر جون 2011ء تک ،انہوں نے پی ایچ ڈی کرنا تو در کنار ابھی تک رجسٹریشن بھی نہیں کرائی۔ یہ ادبی دنیا کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔واضح جعل سازی ہے۔‘‘

ممکنہ جواب:۱۔میں نے ۲۰۰۷ء میں پی ایچ ڈی کی اسی موضوع کی رجسٹریشن کرا لی تھی۔ یونیورسٹی کا ریکارڈ پیش کر رہا ہوں۔

ممکنہ جواب:۲۔میں نے واقعی جھوٹ بولا تھا،اپنے اس جھوٹ پر ادبی دنیا کے سامنے ندامت کا اظہار کرتا ہوں۔

نکتہ نمبر دو:۔’’خود کو شعبۂ تعلیم سے وابستہ کہنا بھی جعل سازی اور دھوکہ دہی ہے۔اس وقت تو شعبۂ تعلیم سے اس حد تک بھی وابستہ نہیں جتنا پرائمری کلاس کے کسی طالب علم سے لے کر کالج تک کا کوئی طالب علم بطور طالب علم وابستہ ہو سکتا ہے۔جبکہ شعبۂ تعلیم سے وہ اپنی وابستگی تو ایسے ظاہر کر رہے ہیں جیسے کہیں لیکچرر یا پروفیسر لگے ہوئے ہوں۔کیا وہ ایسے جعلی تعارف کے بغیر خود کو معزز محسوس نہیں کرتے ؟‘‘

ممکنہ جواب:۱۔یہ بات جھوٹ ہے اور میں اس وقت برطانیہ کے فلاں کالج یا یونیورسٹی میں لیکچرر یا پروفیسر

ہوں۔ثبوت پیش کر رہا ہوں۔

ممکنہ جواب:۲۔میں نے یہ بھی جھوٹ بولا تھا،اپنے اس جھوٹ پر بھی ادبی دنیا کے سامنے ندامت کا اظہار کرتا ہوں۔

نکتہ نمبر تین:۔’’خود کو بقلم خود اور بزبان خود’’نوجوان فلسفی‘‘ کہلوانا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔عمران بھنڈر مابعد جدیدیت کی درسی نوعیت کی طالب علمانہ تشریحات سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے۔اس میں بھی ان کا مطالعہ غیر ہضم شدہ ہے اور اس غیر ہضم شدہ کے اثرات جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔فلسفی کے لیے جس میلان اور غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں سرے سے موجود نہیں۔اسی لیے شدت سے کہتا ہوں کہ موصوف اپنی یہ بچکانہ کتاب انگریزی میں چھپوائیں ،مغربی دنیا کو بھی اس فلسفیانہ تماشے کا اندازہ ہو جائے گا۔اور اگر ہمیں اپنے’’نابغہ‘‘ کو شناخت کرنے میں غلط فہمی ہو رہی ہے تو یہ بھی دور ہو جائے گی۔ ورنہ ہمارے فلسفی بھائی کی خوش فہمی تو ختم ہو گی۔‘‘

ممکنہ جواب:۱۔میں فلسفی ہوں اور نوجوان بھی ہوں۔میری کتاب کا انگریزی ترجمہ جلد شائع ہو جائے گا اور مغربی دنیا اردو والوں کو بتائے گی کہ میں کس پائے کا فلسفی ہوں۔

ممکنہ جواب:۲۔میری ان باتوں اور حرکتوں پر بھی درگزر سے کام لیا جائے۔

نکتہ نمبر چار:۔’’ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ترجمہ بلاحوالہ کا معاملہ ادب کی تاریخ کے حوالے ہو چکا۔عمران کا یہی ایک کام ہے جس کا تھوڑا بہت ذکر کیا جا سکے گا۔ان کے اس کام کو بھی ان دوسرے بہتر نقادوں اور دانشوروں کے کام کے تناظر میں ہی دیکھا جا سکے گا جو متعدد ادیبوں کے ترجمہ بلاحوالہ کی نشان دہی کر چکے ہیں۔اور انہوں نے ایسی نشان دہی کر کے کوئی اچھل کود بھی نہیں کی۔یوں ایک مجموعی کارکردگی میں عمران بھنڈر پچاس یا سو ادیبوں کے ترجمہ بلاحوالہ کی نشان دہی کیے جانے کا ایک پرسنٹ ہی داد سمیٹ پائیں گے۔اس داد پر جتنا خوش ہو سکتے ہیں، ہوتے رہیں۔‘‘

ممکنہ جواب:۱۔چلیں آپ لوگ اس کام کو تو مانتے رہیں،کل کو اس کی بھی نفی اور تردید ہو گئی تو میرا کیا بنے گا۔

ممکنہ جواب:۲۔ مجھے لگتا ہے اب اس کام کی بھی نفی ہو جائے گی۔

نکتہ نمبر پانچ:۔’’عمران شاہد خود بھی کاری گری کے ساتھ سرقات کا ارتکاب کر چکے ہیں۔اس سلسلہ میں ایک ثبوت پیش کر دیا گیا ہے۔ ‘‘

ممکنہ جواب:۱۔میری کتاب میں تو وہ سرقہ نہیں ہے جس کی نشان دہی کی گئی ہے۔(یہ جواب دیا جا چکا ہے اور اس کا الجواب بھی سامنے آ چکا ہے)

ممکنہ جواب:۲۔ اخبار’’دی نیشن‘‘۔لندن۔22/مارچ 2007ء میں میرا جو مضمون’’ادبی نقاد رولاں بارتھ کی ’مائیتھالوجی‘ میں آئیڈیالوجی‘‘ چھپا تھا اس میں واقعی سرقہ ثابت ہو گیا ہے اور میں اس پر ادبی دنیا کے سامنے ندامت

کا اظہار کرتا ہوں۔

نکتہ نمبر چھ:۔''عمران شاہد بھنڈر جو سلمان شاہد بھنڈر کے نام سے خود ہی اپنی تعریف میں اور اپنے مخالفین کی مذمت میں مضامین لکھتے رہے ہیں، اس بارے میں اب یہ بات کھل گئی ہے کہ سلمان شاہد بھنڈر ان کا کم سن بیٹا ہے۔ بچے کی قانونی حیثیت کیا ہے، ہمیں اس سے غرض نہیں ہے لیکن عمران بھنڈر ابھی تک خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کرتے رہے ہیں، تو دوسروں پر غلیظ اور جھوٹے حملے کرنے سے پہلے غیر شادی شدہ باپ کی حیثیت سے انہیں اپنی اخلاقی حیثیت کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔''

ممکنہ جواب:۱۔سلمان شاہد بھنڈر میرا چھوٹا بھائی ہے وہ بھی میری طرح ایک اعلیٰ ادیب ہے، میرا بیٹا نہیں ہے اور میں ابھی تک غیر شادی شدہ ہوں۔

ممکنہ جواب:۲۔سلمان شاہد بھنڈر کے نام سے لکھنے پر ندامت کا اظہار کرتا ہوں، یہ جانتے ہوئے کہ دوسروں پر میرے ذاتی حملے جھوٹ پر مبنی تھے، میں نے انہیں اچھالا، مجھے اس کی سزا قدرت کی طرف سے ملی، میرے اپنے بھید کھل گئے۔ یہ باتیں پاکستان میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھیں اب وہاں بھی سب کو معلوم ہو گئیں۔ میں شرمندگی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں۔

نکتہ نمبر سات:۔''نوجوان فلسفی'' ادب میں تخلیقی صلاحیت سے تو یکسر عاری ہیں، ان کی ادب فہمی پر بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ جب تک وہ اردو ادب کا قدیم سے جدید تک ایک عمدہ انتخاب کر کے، تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کر کے اپنی ادب فہمی کا ثبوت نہیں دیتے، وہ اس معاملہ میں ادبی طور پر خالی ہاتھ ہیں۔ ادب میں ان کی حیثیت ایک درانداز سے زیادہ کچھ نہیں۔''

ممکنہ جواب:۱۔میں اردو ادب کے قدیم اور جدید فن پاروں کا ایک انتخاب کر کے عنقریب تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کرنے والا ہوں۔ ان مضامین میں کانٹ، ہیگل اور ان فلسفیوں کا کوئی ذکر نہیں ہوگا جو میرے ایم اے کے مطالعہ میں شامل رہے ہیں۔

ممکنہ جواب:۲۔اردو ادب قدیم ہو یا جدید تخلیقی ادب کا مطالعہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ جب مطالعہ ہی نہیں کر سکتا تو تنقید خاک لکھوں گا۔

یہ امکانی جواب میری اختراع ہیں لیکن حقیقت سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ عمران شاہد بھنڈر اپنی مرضی کے مطابق نکتہ وار جواب لکھیں تب ہی ان کی نجات ممکن ہے ورنہ اردو دنیا پر ان کی حقیقت ظاہر ہو چکی ہے۔ اور اس حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے بعد لازم ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بارے میں ان کے سارے الزامات کو از سرِ نو جانچا جائے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے عمران شاہد بھنڈر نے ان کے معاملہ میں مبالغہ، تعصب، فریب کاری اور جعل سازی سے کام تو نہیں لیا۔ جب یہ عناصر ان کے مزاج میں اس حد تک رچ بس چکے ہیں تو اس پہلو سے ان کے اس کام کا نئے سرے سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ ان کا وہ سارا کام اب شک کی زد میں آ گیا ہے۔

(مطبوعہ روزنامہ **انصاف** لاہور۔ ۲۱ ستمبر ۲۰۱۱ء)

ترنم ریاض ایم اے، ایم ایڈ۔ کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر

مطبوعہ کتب

ناول: برف آشنا پرندے،۔۔۔مُورتی،۔۔۔فریبِ خطۂ گل (۴ ناویلا)

افسانے: مرا رختِ سفر، یمبر زل، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، یہ تنگ زمین

تحقیق و تنقید: بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب،۔۔۔چشمِ نقشِ قدم

شاعری: پرانی کتابوں کی خوشبو۔ **ترجمہ**: (انگریزی سے) ہاؤس بوٹ پر بلی

تراجم: (ہندی سے) سنو کہانی۔ گوسائیں باغ کا بھوت

مشاغل: برقی میڈیا سے وابستگی، درس و تدریس، تحقیق

ترنم ریاض کے فن پر چند آراء

آج اردو افسانے کی دنیا میں جو چند نام معتبر اور منور ہیں ان میں ایک نام ترنم ریاض کا بھی ہے۔ ترنم ریاض نے تراجم بھی کئے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی سپردِ قلم کئے۔ ناول اور افسانے بھی لکھے۔ ان کے افسانے ان کے ہمعصر افسانہ نگاروں سے بڑی حد تک جداگانہ رنگ رکھتے ہیں۔ کرداروں کو ترنم ریاض نے اپنے قلم سے چھو کر زندہ کر دیا ہے۔ ان کے ہاں پلاٹ، کردار، افسانہ پن اور بیانیہ وغیرہ سب کچھ ہے، لیکن افسانہ بتاتا ہے کہ افسانہ نگار نے ان کی طرف ارادتاً توجہ نہیں کی۔ ندی کے بہاؤ کی طرح وہ سب کچھ سمیٹ لیا جو سمیٹ لینا چاہئے۔ منظر نگاری تو ان کے ہاں ہے ہی۔ خوب بھی اور خوبصورت بھی۔ لیکن کہیں کہیں انہوں نے جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے مناظر کو اور چکا چوند کر دیا ہے۔ ترنم ریاض نے اپنے اردگرد کے حالات کی نہایت عمدہ عکاسی کی ہے۔ اس خصوص میں افسانہ 'یمبر زل' غیر معمولی ہے۔ دہشت گردی اور موت کی آہٹوں کے پس منظر میں۔ امتحانات۔ بچوں کے امتحانات کے لئے تیاری۔ رشتے ناطے، امتحانات کے نتائج، مزید تعلیم کے منصوبے۔ ترنم ریاض نے اس افسانے میں غیر معمولی فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ترنم ریاض کے افسانے افسانے نہیں لگتے۔ معاشرے کی منہ بولتی تصویریں بن جاتے ہیں۔ ان ہی تصویروں کے البم کے نام ہیں: 'یہ تنگ زمیں'، 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی'، 'یمبر زل' اور دوسرے افسانے! **سلیمان اطہر جاوید** (ترنم ریاض کی افسانہ نگاری)

ترنم ریاض اردو شعر و ادب میں کوئی اجنبی نام نہیں رہا۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور اردو شاعری اور افسانے کے قارئین نیز صاحبانِ نقد و بصر کے ذہنوں میں سما گئی ہیں۔ عام طور

پر بہت کم اہلِ قلم ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے اتنے کم وقت میں ادب کے اکابرین سے اپنے آپ کو منوالیا ہو۔ یہ نصرت ایسی ہے جس پر اگر ترنم ریاض فخر کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ترنم ریاض کی شخصیت میں وسعت ہے۔ان کے کارنامے متعدد اور مختلف جہتوں میں سامنے آتے رہے ہیں ان کے یہاں تخلیق کا وہ جوہر ہے جو اپنے ارتقا، اظہار اور ایک منفرد انداز کے لئے مضطرب اور بے چین ہے۔ **علیم اللہ حالی** (انتساب۔۴)

ترنم ریاض کو مصوری، سنگتراشی اور موسیقی سے رغبت ہے۔ چرند و پرند، حیوانات و نباتات سے انسیت ہے۔فن میں ڈوب کر کچھ پالینے کی جستجو ہے۔ان کا یہ جمالیاتی احساس ان کے فکشن میں بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ترنم ریاض اپنے موضوعات عام زندگی سے چنتی ہیں۔ان کے ہاں علامتیں اُن کی فکری زمین سے پھوٹتی ہیں۔ وہ کہانی کی بنت مین فضا اور ماحول سے بھی علامتیں یا اشارے اکٹھا کرتی ہیں۔کبھی ایک مصور کی طرح کہانی کے کینوس پر مختلف رنگوں کے ذریعے مختلف شیڈس ابھارتی ہوئی نظر آتی ہیں تو کبھی سنگتراش کی طرح مجسموں کی رگوں میں خون کی روانی اور حرارت شامل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ترنم ریاض کے فکشن کا یہ بنیادی وصف ہے کہ کہانی جہاں ختم ہوتی ہے، قاری کے ذہن میں اپنی تکمیل کی طرف نئے سرے سے بڑھنے لگتی ہے اور اس طرح قاری خود بھی مصنفہ کے تخلیقی عمل میں شریک ہوجاتا ہے۔۔۔ **صغیر افراھیم** (ترنم ریاض کا فِکشن)

ترنم ریاض ایک Sweet Temper افسانہ نگار ہیں۔ان کی کہانیوں میں صوفیانہ لے اور سرمستی ہے۔تصوّف کا ایک طیف ہے جو ان کے تخیل پر محیط ہے۔رابعہ عدویہ بصری کی طرح ان کیکہانیوں میں پاکیزگی، عطوفت، امومت اور ممتا ہے۔ وہ عورت اور مرد کے خانے میں تقسیم ہوکر کہانیاں نہیں لکھتیں بلکہ ان کی کہانیاں فردِ کائنات کی کہانی ہوتی ہے جس کے جذباتی ارتعاشات کو ہم ان کی کہانیوں میں محسوس کرسکتے ہیں۔ترنم ریاض عالمی حالات و واقعات سے مکمل طور سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی کائنات اور حیات کے مسائل کو انسانی نظر سے دیکھتی ہیں۔ان کے یہاں جوششِ باراں نہیں ہے اور نہ ہی تمرد و طغیانی و آشفتہ جولانی بلکہ تحمل، تدبّر اور تفکر ہے۔ان کا ردِّ عمل کسی بھی سطح پر ہیجانی یا جذباتی نہیں ہوتا بلکہ نہایت مثبت ہوتا ہے۔ وہ عورت مرد کے تعلقات اور دونوں کے مابین رشتوں کے رموز سے واقف ہیں اور اپنے متعینہ حدود و حریم میں رہ کر مسائل پر غور و فکر کرتی ہیں۔ درد و کرب کے باوجود آتش فشاں نہیں بنتیں بلکہ نہایت قرینے اور خوش سلیقگی کے ساتھ اپنے غم و غصّے، خفگی، برہمی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کی تخلیق سے جو تصویر اُبھرتی ہے وہ ایسی عورت کی ہے جس کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے لبالب پیالہ ہے۔ ان کی کہانیوں میں خدا کی رحیمی کے اسرار نظر آتے ہیں۔ ان کی کہانی آہستہ رو آب اور سبک خرام پانی کی طرح استقامت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ کہانی میں نہ کوئی شور و غوغا ہے، نہ مصنوعی فضا آفرینی۔فطری فضا میں ان کی کہانی اتمام کی منزل تک پہنچتی ہے۔ وہ کہانی میں اپنا فلسفہ، اپنا ادراک، اپنا وِژن نہیں بگھارتیں۔ **حقانی القاسمی** (ترنم ریاض بحیثیتِ افسانہ نگار)

وارث علوی (احمد آباد)

گنجفہ بازِ خیال

ترنم ریاض کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے پہلا احساس یہی ہوا کہ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت کی افسانہ نگار ہیں لیکن کوئی نقاد ان کی یہ شناخت قائم کرتا نظر نہیں آتا۔یعنی ایسا لگتا ہے کہ نقاد کے دل میں ایک خوف سا ہے کہ اگر انھوں نے اس خاتون کو دوسروں سے الگ کیا یا بہتر بتایا تو دوسرے ناراض ہوجائیں گے اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ انھیں ساتھ ساتھ ہی چلنے دو یعنی فہرستی ریوڑ سے الگ نہ کرو۔اس رویّے سے دوسرے افسانہ نگاروں کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا لیکن ترنم ریاض کا نقصان ہوجاتا ہے۔ان کی انفرادیت قائم نہیں ہوتی۔

اگر افسانہ نگار میں انفرادیت نہیں، اپنی آواز، اپنا آہنگ، اپنی نظر نہیں، وہ ایسی ہی کہانیاں لکھتا ہے یا لکھتی ہے جیسی کہ دوسرے لکھتے ہیں اور ایسے ہی اسلوب میں جو کہانی کا مروّجہ بیانیہ اسلوب ہے اور اس اسلوب پر اس کی شخصیت کی اپنی چھاپ نہیں، لفظوں میں وہ موسیقی نہیں جو اسی کے صریرِ خامہ کی پیدا کی ہوئی ہے، تو اس پر ایک نہیں درجن بھر مضامین لکھے جائیں تب بھی وہ افسانہ نگار معمولی ہی رہے گا اور وقت کے ایک جھٹکے میں مع ان مضامین کے قعرِ فراموشی میں گم ہوجائے گا۔

ترنم ریاض کے یہاں اچھے افسانے اتنی وافر تعداد میں ہیں کہ ہمواری اور ثروت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں مختصر افسانے بھی ملتے ہیں اور مختصر مختصر بھی، لیکن وہ افسانچے نہیں لکھتیں۔ وہ افسانے جو چار یا چھ صفحات کے ہیں وہ بھی نستعلیق ہیں کیوں کہ فنکاری کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ افسانے مختصر ہیں کیوں کہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے وہ سخنِ مختصر ہی کے متقاضی تھے۔اس سے مصنفہ کے ذہنی ڈسپلن کا پتا چلتا ہے کہ کون سی تصویر کے لیے کون سا کینوس مناسب ہوگا۔

ترنم ریاض کی ایک بڑی خوبی ان کی فنکارانہ شخصیت کی سادگی ہے۔اُن کے یہاں کوئی ARTISTIC PRETENSIONS نہیں۔ کوئی بلند بانگ دعوے نہیں، کوئی تکنیک کی طراریاں نہیں۔ کہیں نظر نہیں آتا کہ استعارے، علامتیں اور اساطیر منہ میں سو کینڈل پاور کا بلب لیے جلوہ افروز ہیں۔ان کے یہاں کاوش اور کاہش کی جگہ برجستگی اور بے ساختگی ہے۔ تہ، درتہ، معنویت، پیچیدہ ڈیزائن اور معنی خیز اشاروں اور کنایوں کی ایک دوسرے

کو کاٹتی لکیروں کے باوصف افسانہ اپنے حسنِ سادہ کو برقرار رکھتا ہے۔آرٹ میں حسن اپنی پردہ پوشی ابہام سے کرتا ہے لیکن ترنم ریاض کے یہاں ابہام دبیز پردوں کا نہیں بلکہ ہوا میں لہراتے ڈرائنگ روم کے مہین پردوں کا ہے نازک اور نفیس۔

ترنم ریاض کے زیادہ تر افسانوں کا راوی واحد متکلم ہے، جو پڑھی لکھی، شائستہ، خوش طبع، اونچے طبقے کی خاتون ہے جو بے شک ترنم ریاض ہیں۔اس کے نتیجے میں افسانوں میں سوانحی رنگ کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔لیکن یہی وہ نازک مقام ہے جہاں افسانہ نگار کو بڑی نفاست سے اپنی شخصیت کو اپنی تخلیقات سے علاحدہ کرنا پڑتا ہے اور یہ کام بہت سے اچھے افسانہ نگار بھی نہیں کر سکتے اور ان کے افسانے اپنی خاندانی وجاہت اور ثقافت، اپنی طبقاتی سوفسطائیت، اپنی راست روشی، انسان دوستی اور جذباتی رویوں کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ پتا نہیں ترنم ریاض نے آرٹ کے کون سے کیمیاوی عمل کے ذریعے اپنے افسانوں میں صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کا دل ربا لیکن خطرناک کھیل کھیلا ہے۔لیکن وہ اپنے اس کھیل میں کامیاب ہیں اور یہ کامیابی حقیقت نگاری کی اس تکنیک کا کرشمہ ہے جو آپ بیتی کو جگ بیتی بناتی ہے۔افسانہ پڑھتے وقت ہم مکمل طور پر اس فریب کے شکار ہوتے ہیں کہ افسانے کا راوی افسانہ نگار ہے جو ترنم ریاض ہیں، اور افسانہ افسانہ نگار کے تخیل کا تراشا ہے، ایک ایسی کہانی جو کسی کی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ عمومیت اور آفاقیت نہ ہو تو افسانہ نجی تجربہ بن کر محدود ہو جاتا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ افسانے کے راوی کے واحد متکلم ہونے کے باوصف اور کبھی کبھی سوانحی سایہ پڑنے کے باوجود، ترنم ریاض کا ہر افسانہ ایک ایسی حقیقت کا ترجمان ہے جو غیر شخصی اور آفاقی ہے اور اس پر ایک انسانی فینو مینا کے طور پر غور کیا جا سکتا ہے۔

غیر شعوری طور پر ان کے یہاں اسلوب کی وہ غنائیت اور نغمگی پیدا ہو گئی جسے پانے کے لیے جدید افسانہ نگاروں کی ایک پوری کھیپ نے افسانے کے لازمی وضعی عناصر کو بلی پر چڑھا دیا تھا۔ترنم ریاض کے یہاں وہ سحر انگیزی نہیں جو کرشن چندر کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے اور جس کے متعلق بیدی کا یہ جملہ مشہور ہے کہ ''میرا یار جادو ہی جگاتا رہے گا یا کہانی بھی کبھی لکھے گا۔''

ترنم ریاض کی پہلی اور آخری کوشش کہانی لکھنے کی ہوتی ہے۔ جادو جگانے میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔وہ حقیقت پسند طریقۂ کار کا پوری چوکسائی سے استعمال کرتی ہیں۔کہانی، پلاٹ، کردار، واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، نفسیاتی دروں بینی اور ڈرامائی کشمکش کا وہ پورا خیال رکھتی ہیں۔اس مقصد کے لیے انھوں نے بیانیہ بھی وہی پسند کیا ہے جو حقیقت کے قریب ہو اور جس میں نثر کا حسن ہو۔اس لیے ان کے یہاں شعریت، شاعرانہ پن اور رنگین بیانی سے بہت ہی سوچا سمجھا اور شعوری اجتناب ملتا ہے۔اُن کے اسلوب میں شاعرانہ ہتھ کنڈوں کا استعمال نہیں، وہ سازینہ بھی نہیں جو کھنکتے لفظوں کے جل ترنگ سے پیدا ہوتا ہے، رومانی تخیل کی وہ فضا آفرینی بھی نہیں جس میں

مدھر میٹھے لفظوں کی رِم جھم برسات ہوتی ہے۔ایسی کوئی چیز ترنم ریاض کے یہاں نہیں، لیکن غنائیت ہے گو ہم نہیں جانتے کہ اس کا سرچشمہ کہاں ہے۔سنگیت کی ہلکی سی دھند ہے جو افسانے کے لینڈ سکیپ سے بلند ہوتی ہے۔ موسیقی کی ایک لہر ہے جو لفظوں کے آب گینوں سے نکل کر جملوں کی پُر پیچ گلیوں میں گونجتی رہتی ہے۔لیکن آپ دھند کو مٹھی میں بند نہیں کر سکتے۔لفظوں اور جملوں کو چن کر نہیں بتا سکتے کہ یہی سنگیت کا سرچشمہ ہیں۔حسینۂ سحر کے رخسار کی مانند ترنم ریاض کا پورا افسانہ سنگیت کی جوت سے جگمگاتا ہے، لیکن آفتاب جو روشنی کا سرچشمہ ہے ابھی پہاڑوں کے پیچھے سے سر بلند نہیں ہوا۔ یہ جوت کہاں سے آئی، لفظوں سے، زبان کے آہنگ سے، نازک احساسات کی سبک سیر امواج سے۔آپ لاکھ کوشش کیجیے، ترنم ریاض کی غنائیت کا سراغ نہیں پا سکیں گے۔زبان کہیے یا اسلوب ترنم ریاض کا سنگیت ان کے افسانوں ہی میں رس گھولتا ہے۔افسانوں سے الگ اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔اور گو اسلوب ہی شخصیت ہے لیکن ترنم ریاض کا آرٹ غیر شخصی ہے۔اتنا ہی غیر شخصی جتنا کہ منٹو کا۔ یہ ترنم ریاض کے آرٹ کا دلچسپ پیریڈوکس ہے کہ سنگیت میں ڈوبے ہوئے اسلوب سے افسانہ نگار خارجی کھردری حقیقت کو فن کی گرفت میں لیتا ہے اور نہ اسلوب کی غنائیت پر آنچ آتی ہے نہ غنائیت حقیقت کی پیشکش کو جذباتی یا رومانی بناتی ہے۔ترنم ریاض کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے انسانی تعلقات کے افسانے کو دوبارہ زندہ کیا۔تاحال ترنم ریاض کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں: 'یہ تنگ زمین' ۱۹۹۸ء، 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' ۲۰۰۰ء اور 'یمبر زل' ۲۰۰۴ء۔ پہلے ہی مجموعے کے افسانوں میں تکمیلِ فن اور حسنِ بیان کا ایسا معیار قائم ہوا ہے کہ لگتا ہے کہ ترنم ریاض بغیر مشقِ سخن کے دور سے گزرے اپنے ابتدائی افسانوں میں ہی فن کی بلندیوں کو چھونے لگیں۔

(وارث علوی کے طویل مضمون کا ایک حصہ)

ترنم ریاض اردو کی ابھرتی ہوئی فکشن نگار ہیں۔انہوں نے اپنے ناول اور افسانوں کے ذریعے قارئین اور نقادوں کو چونکا دیا ہے۔اردو فکشن کے گلستان میں ان کی آمد، آمدِ بہاراں ہے۔اردو تنقید کو ان کی حقیقی شناخت اور ان کے مرتبے کے تعین میں شاید کچھ دیر لگے گی۔ **مغنی تبسم** (شعر و حکمت۔۸)

ترنم ریاض کا تازہ ترین ناول ''برف آشنا پرندے'' اپنے زمانی و مکانی تناظر کی حد تک خطہ کشمیر کے لازوال حسن، اس کی زخم خوردہ روح، قوتِ تحمل، ماضی کی خوابیدہ گزرگاہوں اور حال میں زندگی کے اُفق پر نئی تاب و تپش اور معنویت پر مبنی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ **پروفیسر عبید الرحمان ہاشمی** (دہلی)

پروفیسر حامدی کاشمیری

ترنم ریاض کے افسانے

تخلیقیت کے رنگ

تقریباً گزشتہ پندرہ برسوں سے ترنم ریاض جس تسلسل‘ انہاک‘ اور ذوق وشوق (zest) سے مختلف اصناف یعنی افسانہ‘ ناول‘ شعر اور تنقید میں طبع آزمائی کرتی رہی ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک داخلی تخلیقی توانائی کی (upsurge) کے اظہار سے متصادم ہیں‘ یعنی وہ لاشعوری مہیجات و وقوعات کی شعوری سطح پر لسانی شناخت کی جدوجہد سے گزر رہی ہیں۔ یہ گویا ایک باطنی آتش فشاں کے پھوٹنے اور اس کی روانی کے مسطح یا غیر مسطح بہاو سے گردوپیش کو منور کرنے کا تخلیقی عمل ہے۔ غالب نے کہا ہے۔

بنیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

اس وقت تک ترنم ریاض کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں‘ اور وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف ہیں‘ یہ تنگ زمین (۱۹۹۸) ابابیلیں لوٹ آئیں گی (۲۰۰۰) یمبرزل (۲۰۰۴) میرا رخت سفر (۲۰۰۸)۔

ان مجموعوں کے بیشتر افسانے ترنم ریاض کی تخلیقی اپج کی سچائی اور تہ داری کی بازیابی کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک غیر معمولی تخلیقی فنکار ارضی سطح کو اپنا مستقل مستقر نہیں بناتا بلکہ سمت الراس (zenith) کی طرف اڑان کی طبعی ضرورت سے گزرتا ہے‘ وہ لوح وقلم سے اپنے انفرادی تجربات کی مصوری کرنے سے پل بھر کے لیے بھی لاتعلق نہیں ہوسکتا ہے۔

ترنم ریاض کی سب سے پہلی چیز جو قاری کو متوجہ اور متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ وہ افسانہ نگاری کی روایت سے منسلک ہونے کے باوجود افسانے کو اپنے داخلی اقتضا کے تحت ایک انفرادی شکل وصورت عطا کرنے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ وہ افسانہ نگاری کی مستعملہ اور مروجہ تکنیک کی رو سے افسانے کو فریم بند نہیں کرتیں جیسا کہ ان کے اکثر

معاصرین (جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں) کرتے ہیں‘ وہ اس لمحے کی منتظر رہتی ہیں جب ان کی شخصیت کی داخلی گہرائی سے افسانہ صعود کرتا ہے اور مصنفہ بیان کنندہ کی صورت میں افسانے کو ابتدا سے آخر تک follow کرتی ہیں یہ زبان‘ اظہار اور ترسیل کا ایک مربوط جداگانہ عمل ہے جو میکانکی طور پر افسانہ گری نہیں کرتا بلکہ افسانے کو متشکل ہونے اور grow کرنے دیتا ہے‘ اس طرح سے مروجہ افسانے کے اجزائے ترکیبی یعنی ابتدا‘ انتہا‘ کردار اور پلاٹ کی تقلید نہیں کرتا بلکہ افسانہ خود اپنی ولادت اور بالیدگی کے ساتھ ہی اپنی صورت کو مشکل ہونے دیتا ہے۔ یہ شکل وصورت واقعہ اور کردار کے باہمی تعمل کے ساتھ ساتھ بیان کنندہ کی فعالیت‘ تداخل اور حسیت کی ہم آمیزی سے سامنے آتی ہے‘ بیان کنندہ صرف افسانے کے واقعات اور کرداروں کی مطابقت اور عدم مطابقت سے ہی ترسیلیت نگاری تک محدود نہیں رہتا‘ نہ ہی یہ افسانے کے پورے دیدنی ڈرامائی عمل میں ناظر یا شاہد بن کر سامنے آتا ہے بلکہ آتش نفسی سے افسانے کے رگ وریشے کو زندگی کی حرارت سے آشنا کراتا ہے اور لاتعلقانہ انداز سے افسانے کو من مانے طریقے سے واقعات کی کھتونی بنا کر پیش نہیں ہونے دیتا ہے‘ یہ عمل دیکھ کر اس تنقیدی نکتے کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہر فن پارہ اپنی ہیئت خود لے کر آتا ہے۔

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف

ترنم ریاض کے افسانوں میں زندگی کے گوناگوں مسائل و واردات کی تخیلی بازیافت ملتی ہے‘ یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان کے افسانے ایک فرضی دنیا کو خلق کر کے اس کی اوٹ میں حقیقی زندگی کی بصیرت عطا کرتے ہیں جس فراوانی (profusion) علم وخبر اور کرداروں کے نفس الامر کیف وکم اور نفسیاتی پیچ وخم سے افسانے کی افسانوی شناخت ممکن ہو جاتی ہے‘ اس سے افسانہ استعجاب اور اعتباریت کو جنم دیتا ہے اور یہی استعجاب افسانے کے اپنے وجود کے اکتشاف کو ممکن بناتا ہے۔

ان کے متعدد افسانے سماجی اور اجتماعی مقدمات ومقتضیات اور دنیوی حادثات کے زیر اثر انسانی اقدار کی پامالی اور انسانی تناظر میں عورت کی شخصیت‘ عزت نفس‘ حق رشتگی اور بقا کی المیہ صورت حال کو ذہن ودل پر نقش کرتے ہیں‘ ایسا کرتے ہوئے لسانی عمل کے کارگر برتاؤ سے افسانوی واقعے یا صورت حال کی مصوری کے لیے ایک ایسی باریک بینی سے کام لیا جاتا ہے کہ نازک سے نازک ترجزیات کی graphic نقش گری سے افسانوی وجود کی authenticity کے ادراک میں مدد ملتی ہے۔

افسانہ ''شہر'' کو لیجئے‘ یہ ہشت پہلو افسانہ ہے‘ اس میں تضادات افسانے کے معنوی امکانات کی توسیع کرتے ہیں‘ افسانے میں شہری زندگی کے مسائل یعنی رہائش کا مسئلہ‘ اجنبیت‘ نوکری کی زنجیریں‘ بچوں کی ماں کی بے نام موت‘ اور ان کے متقابل انسانی رشتوں کی پاکیزگی‘ معصومیت‘ ممتا اور فریب شکستگی بھی توجہ انگیز ہو جاتی ہیں‘ افسانے میں بچوں کی نفسیاتی باریکیوں کی دید ویافت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔۔۔ بچوں کے معصوم ذہنوں

میں ماں سے رشتگی‘ اس کی بے حس وحرکت سڑی ہوئی لاش‘ اس کی اٹوٹ نیند کے اثرات‘ دروازہ نہ کھلنے کا کرب اور تنہائی‘ بے بسی و بے کسی کا درد....... یہ سب کچھ ذہن و دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھہرے افسانے کے محاکاتی اور معنیاتی ابعاد...... اتنا ہی نہیں بلکہ افسانہ ’’شہر‘‘ جس دل دہلا دینے والی فضا کی تخلیق کرتا ہے اور مکاشفانہ (appocalyptic) صورت حال کو جنم دیتا ہے اور جس طرح بچوں کے سامنے ماں کے جاگ نہ جانے کے ہوش ربا واقعے اور موت کے سبب اس کی شکل و صورت متغیر ہونے پر وہ جذباتی طور پر react unknowingly کرتے ہیں اور ان کی طرف سے اس کی تعلقانہ لاتعلقی اور بے گانگی‘ کمرے کا دروازہ نہ کھلنے اور کمرے سے باہر کے لوگوں سے کوئی رابطہ قائم نہ ہونے‘ ماں سے قربت اور دوری‘ امید اور ناامیدی سے جس پریشان کن اور سمجھ میں نہ آنے والی صورت حال اور اس کے نتیجے میں بچوں کی جو متنوع نفسیاتی کیفیات ابھرتی ہیں‘ اس سے افسانہ شاہکار کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ یہ وحدانی موضوع کا افسانہ نہیں جس کے دن لد گئے ہیں‘ یہ نفسیاتی واقعیت کا افسانہ ہے جو کثیر معنوی جہات کو محیط ہے اور مصنفہ کی child psycology کی باریکیوں پر گہری نظر کا اثبات کرتا ہے۔

ان کے افسانوں میں تجربات کی گونا گونی ملتی ہے‘ وہ انسانی رشتوں کی پاکیزگی‘ تنوع‘ تقدس‘ حرارت اور نزاکت کا بھرپور احساس دلاتی ہیں اور ساتھ ہی عہد حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے غلبے کے زیر اثر انسانی اقدار کی بے حرمتی‘ مرد عورت کی شخصیت کی disintegration‘ مردوں کی انسانیت کُش بالادستی اور ناقدری‘ ممتا کی بے حرمتی‘ خونی رشتوں کی تضحیک جیسے مسائل ان کے افسانوں سے مستخرج ہو سکتے ہیں‘ لیکن جو چیز ان افسانوں میں بالتخصیص ابھرتی ہے وہ عورت کی شخصیت کی قدر شناسی اور استحصال ہے۔ ۱۹۶۰ء میں اقوام متحدہ نے عورتوں کے حقوق کو تسلیم کر کے خواتین کا عالمی دن منانے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی عملی زندگی میں ان کے مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا گیا‘ چنانچہ آزادئ نسواں کی تحریک کی اثر انگیزی کے تحت خواتین شاعرات اور فکشن نگاروں کی تخلیقات نے عورتوں کی بے چارگیوں اور مظلومیت کی طرف متوجہ کیا اور ساتھ ہی عورت کی شخصیت کی اکتشاف پذیر قوتوں کا اثبات کیا گیا۔ اس طرح سے عورت پر بہت کچھ لکھا گیا‘ چنانچہ پس ساختیاتی تنقید نے نسائیت کو تھیوری کی شکل عطا کی اور Elaine Showalter جیسی دیدہ ور نقاد نے نسائی نقطہ نظر کے تحت نسائیت پر تنقیدی نظر ڈالی۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ترنم ریاض نسائیت کو ایک سوچے سمجھے موضوع یا طے کردہ نظریے کے طور پر پیش نہیں کرتیں۔ جیسا کہ بیشتر خواتین فکشن نگار اور مرد لکھاری کرتے رہے ہیں۔ ان کے علی الرغم ترنم ریاض کے یہاں ان کے باطن سے نمود کرتے ہوئے تجربات شعوری سطح پر لسانی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے خدیجہ مستور کے بارے میں لکھا تھا کہ خدیجہ مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ۔ یہ جملہ ترنم ریاض

پر بھی صادق آتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ وہ کشیدہ کاری کرتے ہوئے مصوری بھی کرتی ہیں اور باطن و ظاہر کے امتزاجی عمل سے اور لسانی روانی اور شگفتگی سے کہیں کہیں غیر متعلقہ توضیح کے باوجود ایک panoramic view خلق کرتی ہیں۔ وہ متعدد افسانوں میں افسانوی کردار کے ذریعے ایک خود آگاہ‘ باشعور اور دردمند شخصیت کا پتہ دیتی ہیں‘ غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تکثیریت متعدد معنوی امکانات کا احساس دلاتی ہے۔ یہ امکانات وہ غیر مختتم دھارے ہیں جو وسیع تر استعاراتی عمل میں ان کے ہمہ گیر ممتا کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں‘ اس ضمن میں بابل‘ بی بی‘ اماں‘ بالکنی‘ شہر‘ برف گرنے والی ہے‘ کشتی‘ رنگ‘ میرا رخت سفر‘ آنسو جیسے افسانے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فن پارہ مصنف/مصنفہ کے حوالے سے اپنے طور پر لاشعوری الاصل ہوتا ہے‘ غالب نے کہا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ترنم ریاض کے محاکمے (assessmen) کی کوئی کوشش اس وقت تک بارور نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کے لاشعور کی inherent کارگزاری کا پتہ نہ لگایا جائے اور وادئ کشمیر (جو ان کا مولد ہے) کی بے مثال خوبصورتی کے ساتھ یہاں کے باسیوں کے صدیوں کی مجبور و مقہور زندگی کے لاشعوری اثرات کی نشاندہی نہ کی جائے جو‘

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

یہ گویا وہ درد ہے جو لاشعور میں سرایت کر گیا ہے اور جو اپنی سچائی‘ وسعت اور نازکی سے ممتا کے درد کی مثیل ہے‘ وسیع تر معنوں میں یہ انسان کی درد ہے‘ جو رشتوں کی ناپائیداری‘ شکستِ خواب‘ ناکامی‘ مراسم کے انہدام‘ بہیمیت اور اقدار شکنی کو محیط ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ترنم ریاض کا دردِ دل ممتا ہی کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے اور وہ اپنے طور پر یا کرداروں کے ذریعے God Mother ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔

آیئے ضمناً ترنم ریاض کی نگارشات پر جو تنقیدات سامنے آئی ہیں ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ چھوٹے بڑے نقادوں نے بڑی فراخدلی سے نسائیت اور اسلوبِ اظہار کے حوالے سے ترنم کی افسانہ نگاری کی تعریفوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے لیکن یہ ساری تنقیدات تبصراتی‘ سطحی‘ توصیفی اور عمومی نوعیت کی ہیں‘ اس نوع کی تاثراتی اور توصیفی تنقیدات کی نئے تنقیدی منظر نامے میں کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ ان میں کہیں بھی ترنم کے تخلیقی شعور کی ندرت‘ جو متن کی لسانیات کے حوالے سے بسیار شیوگی پر منتج ہوتی ہے‘ کو چھوا بھی نہیں گیا ہے‘ دیکھنا یہ ہے کہ ان کے افسانے کیونکر تہ در تہ وقوعوں سے صورت یاب ہوتے ہیں یہ ان افسانوں کی لسانی صورت ہے جو ان کی تخلیقیت کا پتہ دیتی ہے۔

فنی نقطہ نظر سے ان کے افسانوں میں متکلم (متکلمہ‘ مشاہد) محض بیانیہ کا کردار ادا نہیں کرتا بلکہ

افسانوی تجربے کا ایک جزو لاینفک بن جاتا ہے' وہ ترنم ریاض کی افسانوی دنیا میں صرف کرداروں کے رول پر نظر نہیں رکھتا بلکہ افسانوی تجربے کا ایک حساس' فعال اور supportive کردار بن جاتا ہے' ردعمل مشاہدہ' فکر' کرداروں سے ان کی ارتباطیت' دردوغم' ثقافت اور معاشرت کی جملہ جزیات کی بازدید کا سامان کرتا ہے۔

''بابل'' میں ایک نئی نویلی دلہن کی جسمانی خوبصورتی اور اس کے بابل چھوڑنے کے دردوغم کی مصوری کی گئی ہے' اس افسانے میں جزیات نگاری سے افسانے کی فرضیت یقین آفرین ہو جاتی ہے' مزید برآں' افسانے میں ریلوے سٹیشن عارضی قیام اور ارتجالاً نادیدہ منزل کی جانب روانگی کا اشاریہ ہے' ریلوے سٹیشن پر لڑکی کے والدین اور لڑکے کے رشتہ داروں کا عارضی قیام علامتی معنویت کا حامل ہے' نازک سی پیاری معصوم لڑکی کی اب تک کی زندگی' گھر' گھر میں ماں باپ' بھائی بہن' ان کا پیار چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم' اپنا وطن' سب کچھ ریل کی طرح پل بھر میں چھوٹ جاتا ہے اور اس کو اجنبی لوگ نامعلوم اور انجان منزل (مستقبل) کی طرف لے جاتے ہیں۔

افسانے کا شروع کا جملہ

''نازک سی لڑکی کی آنکھوں میں لبالب آنسو بھر آئے تھے۔''

پورے افسانے کی گرہ کشائی کے لیے کلید کا کام کرتا ہے' اس کے بعد پورے پیراگراف میں لڑکی کے خوبصورت خدوخال کے ذکر سے ایک متضاد صورت حال اور آگے پیش آنے والے واقعات کی فضا متشکل ہو جاتی ہے' ''لڑکی کا رنگ سنہرا' چہرا کتابی' آنکھیں نہ زیادہ بڑی نہ زیادہ چھوٹی' لب پتلے' نازک سے' اوپر کا ہونٹ ذرا سا آگے کو تھا'' اور پھر لڑکی کے لباس' اس کے ہاتھوں کی مہندی اور کانچ کی چوڑیاں۔۔۔

یہ جملہ تفصیلات فوری طور پر افسانے میں لڑکی کے وجود کو متعارف کراتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی تفصیلات کا موقع و محل اور جواز کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس لڑکی کا ذکر ہے وہ ایک نئی دلہن ہے اور ایک زندہ وجود ہے' جس کی آنکھوں میں حسین خواب ہیں لیکن اس کو ایک بدصورت ترین' غیر پسندیدہ آدمی کے حوالے کیا جاتا ہے' اس تضاد کو جزیات نگاری سے نمایاں کیا گیا ہے۔

ریلوے سٹیشن پر جہاں دلہن کے والدین چھوٹتی ہوئی ٹرین میں اشک بار آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو رہے تھے تو لمحہ بھر پہلے اسی ٹرین کی پچھلی نشست پر بیٹھی متکلمہ نے ایک منظر دیکھا کہ کالے چشمہ والا آدمی اس نازک سی لڑکی کو اپنے ساتھ سٹیشن سے باہر لے جا رہا تھا تو اس پر ظاہر ہوا کہ وہی چیچک زدہ آدمی' سیاہ چشمہ پہنے' جس کی ایک آنکھ باہر کو ابلی ہوئی اور دوسری بے نور' کراہیت انگیز ہے' اس لڑکی کا شوہر ہے تو وہ دم بخود رہ جاتی ہے۔ افسانے کا خاتمہ اشاروں اور کنایوں سے عورت کے شکست خواب اور اس کے مخدوش مستقبل کا احساس دلاتا ہے اور اس کا آخری جملہ افسانے کو ایک جہات افروز اور درد آگین وقوعے سے آشنا کرتا ہے۔

''میں یہ سوچ رہی تھی کہ جیتی جاگتی گڑیا ایسا ذی روح کھلونا ہچکیاں لیتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم

اٹھاتا ہوا سٹیشن سے باہر نکل کر کہاں کو جا رہا ہوگا۔'' افسانے میں کہی اور ان کہی باتوں کے امتزاج سے ایک جاذب نظر اور دردانگیز وقوعہ happening ابھرتا ہے۔

افسانہ ''برف گرنے والی ہے'' میں ایک مختصر مفلوک الحال گھرانے کی تصویر ابھرتی ہے' مرد خضر محمد' اس کی بیوی حاجرہ' ایک بیٹا جاوید احمد' ایک چھوٹی بیٹی یاسمین۔ جاوید احمد ایک قالین فیکٹری میں کام کرتا تھا لیکن ''سرکار نے بچوں کے کام کرنے پر پابندی عائد کر دی'' خضر محمد اور حاجرہ کو یہ سن کر تشویش ہوئی کہ جاوید اب قالین فیکٹری میں کام نہیں کر پائے گا اور جو سماجی کارکنوں کا وفد جاوید کی فیکٹری میں آیا تھا' وہ دوسری ملوں اور فیکٹریوں میں بھی گھوم رہا ہے۔''

جاوید کے یہ پوچھنے پر کہ اب وہ کیا کرے گا' ماں نے جواب دیا ''اپنے بابا سے پوچھو' تنہا اس کی محنت سے ہم چاروں کا گزارہ نہیں ہوسکتا' دونوالے چاول بھی مشکل ہو جائیں گے۔''

''گھر میں کانگڑی کے لیے کوئلے نہیں ہیں' چولہے کے لیے لکڑی نہیں ہے' گرم کپڑے نہیں ہیں' اوڑھنے کے لیے رضائی نہیں ہے' سردی بہت ہے اور ''برف گرنے والی ہے'' اس لیے جاوید نے ماں باپ سے کہہ دیا کہ اس نے وہ ''کام'' کرنے کا ارادہ کر لیا جس سے وہ اب تک انکار کر رہا تھا۔ وہ دونوں پریشان ہو جاتے ہیں اور اس کو سختی سے ایسا خطرے کا کام کرنے سے منع کرتے ہیں' وہ بھوکے جی لیں گے لیکن اس کو کھو کر زندہ نہیں رہ پائیں گے۔

جاوید نے جاتے ہوئے ماں سے کہہ دیا ''جب تک جان ہے تب تک بھوک لگے گی نا ماں' تمہیں لگی ہے نا؟ مجھے بھی لگی ہے۔''

''ارے سنو بیٹا'' حاجرہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی مگر ''شدید دھند میں اسے جاوید کا ہیولا تک دکھائی نہ دیا۔''

یوں تو اس افسانے کی کہانی میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے تاہم اس کو سادہ یا اکہرا افسانہ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس جملے کہ ''شدید دھند میں اسے جاوید کا ہیولا تک دکھائی نہ دیا۔'' کے ساتھ ہی افسانہ ختم ہو سکتا تھا اور ابتدا سے انتہا تک جس حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے' وہ فرضی صورت اختیار کرتا ہے۔ افسانے کا عنوان ''برف گرنے والی ہے''، علامتی نوعیت کا ہے' اس میں یخ بستہ موسم میں جاوید اپنے والدین اور چھوٹی بہن کو حد درجہ مفلسی سے نجات دلانے کے لیے ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق ''وہ کام'' کرنے کا تہیہ کرتا ہے' جس میں اپنے اور دوسروں کی جان کا خطرہ ہے۔ کہانی بظاہر اتنی ہی ہے اور اسے آسانی سے اکہرے پلاٹ کی کہانی قرار دیا جا سکتا ہے' مگر یہ بظاہر سیدھی سی کہانی دکھائی دینے والی' سیدھی کہانی نہیں ہے' یہ لفظوں کی تلازمیت سے کئی معنوی امکانات کا احاطہ کرتی ہے اور قاری کو سوچنے اور محسوس کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ترنم ریاض کے افسانوں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کی ابتدا اور خاتمہ چونکا دیتے ہے' زیرِ تجزیہ کہانی کا اختتام ان سطور پر ہوتا ہے، ''ایک پکار فضا میں ابھری تو قریب کے کسی خزاں زدہ یخ بستہ درخت کی جمے ہوئے کہرے میں لپٹی ننگی ٹہنی پر بیٹھا کوئی الّو بولا اور اندر سے یاسمین کے رونے کی آواز آنے لگی''، اور افسانہ ایک اور جست لگا کر بلند تر سطح پر معنوی جہات کی توسیع کرتا ہے اور ایک درخت کی مانند برگ و شاخ نکالتا ہے، جاوید کا شدید دھند میں گم ہو جانا اس کی موت سے قبل موت کا اشاریہ بن جاتا ہے اور خاتمے کی یاس انگیز' یخ بستہ فضا میں یاسمین کا رونا احساس زیاں کو گہرا تا ہے اور افسانے کی واقعیت پسندی کو علامتی صورت حال میں تبدیل کرتا ہے اور بقول ایلیٹ افسانہ correlative objective کی تمثیل بن جاتا ہے اور قاری افسانے کے المیہ کے حاوی اثرات سے گزرتا ہے۔

یہ افسانہ طنزیہ جہت بھی رکھتا ہے' سماجی کارکن بچہ مزدوری پر سرکار سے پابندی لگوا تو سکتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں وہ جو ہزاروں غریب اور پس ماندہ گھر فاقہ کشی کے شکار ہو جاتے ہیں اور بچے بے روزگار ہو جاتے ہیں' ان کے بارے میں وہ خاموش ہیں۔ افسانے میں یاس انگیز یخ بستہ فضا جو جان لیوا نظر آتی ہے' کو عنوان ''برف گرنے والی ہے' اور زیادہ شدید بناتا ہے جہاں برف تباہی کی علامت بن جاتی ہے۔

آیئے اب قدرے طویل افسانے ''سورج مکھی'' کے کلیدی واقعات پر ایک نظر ڈالیں۔

برآمدے پر کھڑے سمیر نے بائیں جانب گردن موڑ کر پیپل کے درخت کی طرف دیکھا جہاں ایک طوطے نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا"do you know some thing' سمیر نے ایک نظر ندھی کی جانب ڈالی اور دوبارہ پیپل کو دیکھنے لگا۔it must be a male looking his partner 'ان کا میٹنگ سیزن ہے نا''

''او۔ ری اے لی۔؟'

''ندھی نے بھی پیپل کی طرف نظر ڈالی۔۔۔۔۔کھڑکی میں لگے کانچ کے اس پار برآمدے کی دیوار پڑوس کے گھر سے ملتی تھی۔ سمیر کھڑا ندھی سے بات کر رہا تھا۔'' سمیر نے سفید سکول وردی پہن رکھی تھی۔

....

''آپ پلیز کچھ کیجیے۔۔نہیں تو یہ لڑکی۔۔۔ہے بھگوان۔۔۔چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کے اس لڑکی نے میرے بچے کو پھانس لیا ہے۔''

دت صاحب کھڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسز دت کا یہ جملہ سنا تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''چھوڑو بھی۔۔۔۔۔بچے ہیں۔۔۔یاد نہیں سمیر نے کل کیا کہا تھا۔۔۔وہ ندھی اور اس بوائے فرینڈ کو ٹریٹ دینا چاہتا ہے۔''

....

''سمیر موٹر بائیسکل سے گر کر زخمی ہو جاتا ہے۔۔ندھی مسلسل آتی رہی' کبھی ڈریسنگ کرنے آ رہی نرس کے ساتھ کھڑی پٹی بدلوا رہی ہے' کبھی شوربا بنوا رہی ہے' میوزک سسٹم کے لیے نئی سی ڈیز لا رہی ہے' سکول سے سیدھا سمیر کے کمرے میں پہنچ کر دن بھر کا حال سنا جا رہا ہے۔''

....

''یار ایک favour چاہیئے تجھ سے'

ندھی بولی تو مسز دت کے کان کھڑے ہو گئے

''شوئر' بول نا'۔''

''گورو ناراض ہو گیا ہے۔''

وہ اداسی سے بولی۔

''You know how much I love him''

وہ رو پڑی۔

اے پلیز یار' رونا نہیں ہاں۔ ڈونٹ وری۔ ابھی ٹھیک کرتا ہوں اسے۔۔۔۔''

....

''I have an idea''۔۔۔ وہ چہکی

''ہمارا سارا گروپ بالوں میں لائٹ براون سٹریکس ڈلوائے گا' کچھ تو دن ہیں سکول کے۔۔۔فوٹو کھینچیں گے ڈھیر سارے۔۔۔۔۔یہ ڈیڈ مارک ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا''

''کتنے یاد آئیں گے سکول ڈیز''

دونوں نے بیک وقت اداس لہجے میں کہا اور ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

یہ رہے افسانے کے واقعات۔۔۔ جو تدریجی طور پر ایک دوسرے سے جڑ کر افسانوی فضا کی تشکیل کرتے ہیں اور قاری کو فوری طور پر پرانی نسل کے بزرگوں (ماں) کو نئی نسل کے نمائندوں ندھی اور سمیر کے درمیان جنریشن گیپ کا احساس دلاتے ہیں' افسانے کی یہ موضوعی صورت اس کی افسانویت میں ڈھل جاتی ہے' یہ افسانویت بیان کنندہ' مسٹر دت' مسز دت' سمیر اور ندھی کے مابین مکالموں اور ان کے متناقض رویوں سے اپنی شناخت قائم کرتی ہے' افسانے میں سکول میں زیرِ تعلیم لڑکے سمیر اور لڑکی ندھی کی دوستی' ان کی کم عمری میں ایک مثالی دوستی میں ڈھل جاتی ہے' وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں' ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں' ساتھ پڑھتے ہیں اور مشکل مواقع پر ایک دوسرے کے کام آتے ہیں' پہروں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے باتیں کرتے ہیں اور ان کی دوستی سچی دوستی کا پتہ دیتی ہے لیکن سمیر کی ماں شروع سے ان کی اس دوستی کو شک کی

نظروں سے دیکھتی ہے، وہ ہر لحجہ ان دونوں کو یک جان و دو قالب دیکھ کر اندیشوں، وسوسوں اور ناراضگیوں کا اظہار کرتی ہے، دت صاحب اس کی باتوں کو ہنسی میں ٹالتے ہیں اور قدم قدم پر ان بچوں کی باہمی محبت کو مثبت قدر کا درجہ دیتے ہیں، وہ ایک ایسے کردار کی صورت میں سامنے آتے ہیں جو جدید تر دور لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک دوسرے سے محبت کرنے اور ساتھ ہی جنسی رشتگی سے ماورا ہو کر انسانی رشتے کی اہمیت، معنویت اور معصومیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ترنم ریاض نے بڑی کامیابی کے ساتھ افسانے میں زبان کے تخلیقی برتاو سے دلچسپی اور suspense کو قائم رکھا ہے اور شروع سے آخر تک قاری کی شرکت کو یقینی بنایا ہے۔ افسانے کا عنوان ''سورج مکھی'' افسانے کی بنت میں شامل ہے اور افسانے کو اشارتی تہہ داری سے آشنا کرتا ہے۔

سورج مکھی افسانے کی بنت اور ہئیت میں مکمل انضمامی کردار ادا کرتا ہے۔ دت صاحب نل میں پائپ لگا کر پودے سینچے لگے، کونے میں لگے سورج مکھی کے پودے میں ایستادہ اکلوتا پھول دت صاحب کی طرف سے منہ پھیر کر سورج کو دیکھ رہا تھا''سورج مکھی کا کونے میں ہونا''، ''اس پودے میں ایستادہ اکلوتا پھول''اور دت صاحب سے منہ پھیر کر سورج کو دیکھنا، افسانے میں دت صاحب اور بقیہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیت کی اشارتی پیش کش ہے۔۔

ترنم ریاض کشمیر کے ایک جاگیردار گھرانے کی بیٹی، پروفیسر ریاض پنجابی کی بیگم اور جوانی کو چھوتے ہوئے دو عدد بیٹوں کی شفیق ماں ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ اور شاعرہ ہیں۔ آئے دن ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہتی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے خاص دلچسپی ہے۔ ان کی نفاست و نزاکت اور عادات و اطوار کو دیکھ کر ہم انہیں شہزادی کہتے ہیں۔ سچ مچ برا تو نہیں مانتیں لیکن جھوٹ موٹ موٹ کی خفگی میں اور بھلی لگتی ہیں۔ جینز جیکٹ ہو، کوٹ ٹراؤزرس ہوں، ساری بلاؤز ہو یا شلوار قمیص، کوئی بھی لباس زیبِ تن کریں، ہر لباس میں خود اپنی مثال لگتی ہیں۔ انتہائی مہذب اور شائستہ خاتون ہیں۔ اردو انگریزی، کشمیری اور پنجابی زبانیں فر فر بولتی ہیں۔ خاکسار کی پہلی تصنیف 'شادابیاں' ان ہی کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔ اب سے کئی سال پہلے جب انہیں اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سنائے تھے تو دل کھول کر مسکرانے کے علاوہ انہوں نے نقرئی قہقہے بھی لگائے تھے۔ جب ہی سے ہمت بندھی کہ کتاب چھپوائی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مضامین لوگوں کے چہروں کی شادابی زائل ہونے کا سبب نہ بنیں۔ خاکسار کی یہ تیسری تصنیف، ترنم ریاض کی جانب سے محاورتاً گھوڑے کو چابک مار کر آگے بڑھانے کا نتیجہ ہے کیوں کی گھوڑا جب رفتار پکڑتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ اس نے کتنے سنگِ میل پار کیئے۔

ایس۔ایم کوثر رضوی۔آل انڈیا ریڈیو، ہنستی بولتی ریڈیو بستی (سنئے کہ نہ سنئے)

سیّد محمد اشرف

ترنم ریاض کا ناول: برف آشنا پرندے

'برف آشنا پرندے' کشمیری ماحول میں زندگی کرنے والی ایک حساس لڑکی کے نقطۂ نظر سے لکھا ایک مختلف انداز کا ناول ہے۔

کشمیر کے ماحول، پھول، پھل، گھاس، پرند یعنی نباتات اور حیوانات کا بے حد خورد بینی بیان ہے جو جزئیات نگاری سے آگے کی چیز ہے۔ کشمیر کو مرکز بنا کر اردو میں اتنی طویل تخلیقی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ مصنفہ کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف اشیاء اور جذبات کی جزئیات ہی کے ذکر پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ مختلف جذبات کے تحت چہرے اور آنکھیں اور تبسم اور چال ڈھال میں کیا اور کیسی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں، ان کا بھی بہت باریک بینی سے جائزہ لیتی ہیں۔ جیسے صفحہ ستاون کا آخری پیرگراف جو بریکیٹ میں بند ہے۔

'امی نے اپنا سر، نہ نہ کرنے کے انداز میں ہلا کر بچوں کو دکھایا تھا اور ان کے کانوں میں پڑے آویزے داہنی سے بائیں جانب اور واپس لہرائے تھے۔ اور ان سے لگے چھوٹے چھوٹے نیلے اور سرخ موتی امی کی گردن سے چار بار چُھو گئے تھے۔'

یا جیسے صفحہ اڑتیس پر ابّو کی سانسوں کی آواز اور جھولے کی رسیوں کی آواز سے تشبیہ۔

'بڑے سے ابو بڑی سی مسہری پر بڑے اطمینان سے سوئے تھے۔ ان کا سینہ آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ نتھنوں سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے جھولے سے اتر جانے کے بعد آتی ہیں۔ جب جھولا ٹھہرنے ہی والا ہو۔'

اور صفحہ ایک سو بہتر،

'چوہدری نجم احمد خان کو اپنے ہاتھوں مٹی کے حوالے کر کے ثریا بیگم گھر لوٹیں تو فہیمہ اور فرخندہ بھی اپنے گھروں کو چل دیں۔ کچھ روز بعد شیبا کو بھی واپس ہوسٹل جانا تھا۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ثریا بیگم کو گھر میں اکیلا دیکھتی ہوئی گھر سے دور جانے کے لئے نکل جائے۔ فرخی کو کچھ دن اور رہنے کے لئے سمجھا لیا کہ فرخی نے بھی اپنے گھر والوں کو سمجھا لیا تھا۔ شیبا کے جانے کے بعد کچھ دن تک فرخی مائکے رہ کر آخر کو اپنے گھر لوٹ گئی اور بڑے سے پائیں باغ والے مکان میں ثریا بیگم تنہا رہ گئیں۔ شیبا گئی تو ثریا بیگم نے اسے گلے لگا کر کئی آنسو

بہائے تھے۔ فرخندہ کے جانے پراُنہوں نے اسے اپنے گھر میں خوش وخرم رہنے کی دعائیں دیں تھی۔اور بعد میں مغرب کی نماز کے لئے کمرے کی طرف چلی گئیں تھیں۔ باورچی خانے میں سے برتن دھونے کی آوازیں آرہی تھی۔

شیبا کے بند کمرے کے پاس سے گزری تو معلوم ہوا کہ اچانک کسی نے دل میں کوئی نوکیلی شے اتاردی ہو۔ جبکہ برابر میں دوسرا کمرہ بھی تھا جس میں فرخی کچھ دن رہ کر ابھی گئی تھی۔شیبا کے کمرے کے دروازے پرلگی تصویر میں گھونسلے میں چونچ واکئے اپنے بچے کو چڑیا دانہ کھلا رہی تھی۔

ان کی چڑیا کتنی دور ہے۔جانے کب آئے گی۔فرخندہ اورفہیمہ تو مہینے ایک میں آہی جاتی ہیں۔مگر شیبا۔آنکھیں کتنی سرخ تھیں اس کی۔کتنا روئی تھی چپکے چپکے میری گڑیا۔‘

ثریا بیگم نے چڑیا والی تصویر پر ہاتھ پھیرا اور ہچکیاں لے لے کر رو پڑیں۔

اورصفحہ ایک سوستتر (۱۷۷) میں ثریا بیگم کا یاد آفرینی کا عمل اوران کے تاثرات کا بیان بیحد پُر اثر ہے اور تخلیقی نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔

یاسر کی سکول کی ٹائی ایک کونے میں گری تھی۔انہوں نے اُٹھا کر اسے الماری کے دروازے کے اندر لگی کھونٹی پر لٹکایا تو سینے میں کچھ ایسی الٹ پلٹ مچی کہ جان نکلتی محسوس ہوئی۔وہ دل پر ہاتھ رکھ کر مسہری کے کنارے بیٹھیں اور بلک بلک کر رو پڑیں اور کچھ پل بعد وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔دیوار پر نجم خان کی ایک بڑی سی تصویر ثریا بیگم کو دیکھتی مسکرا رہی تھی۔ ثریا بیگم نے آنسوؤں سے دھندلا رہی آنکھیں دوپٹے سے پونچھیں اور جانماز پر نیت باندھنے کے لئے کھڑی ہوئیں مگر فوراًدوزانو بیٹھ کر سجدے میں گر گئیں اور ہچکیوں سے رونے لگیں۔ان کی سمجھ میں اپنے رونے کی کوئی خاص وجہ نہیں آرہی تھی۔کیوں رو رہی ہیں وہ اتنا۔اتنے دنوں سے وہ رو ہی رہی تھیں مگر ایسا کیوں اچانک۔ بچے تو پہلے ہی دور دور سے تھے گھر سے۔ اور گاؤں سے آکر وہ کئی دن سے اکیلی تھیں اپنے کمرے میں تو پھر آج اُنہیں ایسا کیوں لگا تھا کہ شیبا کے دروازے پر لگی تصویر بہت اداس ہے کہ پنکھ پھڑ پھڑا رہا چڑیا کا بچہ پنکھ سمیٹ ہی نہیں رہا نہ چڑیا اس کے ننھے سے حلق میں دانہ انڈیل پا رہی ہے اور دونوں تھکن کے مارے ہلکان ہو رہے ہیں۔اور کیوں انہیں لگا تھا کہ یاسر کی ٹائی فرخندہ کے کمرے میں مسہری کے کنارے سے پھسل کر اسی لئے گری تھی کہ اسے وہاں سے اُٹھانے کے لئے یاسر یا فرخندہ وہاں موجود نہیں تھے۔اور کیوں انہیں لگا تھا کہ نجم خان کی برسوں سے ٹنگی تصویر جو اکثر مطمئن سی مسکرایا کرتی تھی دراصل آج بڑی غمزدہ سی مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرخ آنکھوں میں بہت سے آنسو لئے ثریا بیگم نے جانماز سے سر اُٹھا کر اپنے اطراف نظر ڈالی۔ اور کیوں انہیں لگ رہا ہے کہ ان کے کمرے کی الماریاں اور سب کمروں کے دروازے اور ساری کھڑکیاں اور میزیں اور میزوں پر رکھی چیزیں بے حد اکیلی اور اداس ہیں۔کیوں انہیں گھر کا ہر گوشہ خود سے خفا سا معلوم ہو رہا تھا جس کے ہر نشیب میں ایک ہولناک سا سکوت اُنہیں پناہ دینے سے انکار کئے جارہا ہو۔تو پھر وہ کہاں جائیں۔کہاں۔ثریا بیگم نے آنسو پونچھے اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگیں۔

’سنو‘انہوں نے کھڑکی سیدھ میں دیکھ کر لب ہلکے سے ہلائے۔وہاں انجیر کی ایک شاخ خم کھا کر نیچے کو لٹکی ہوا کے جھونکے سے ہل رہی تھی۔

’سنو۔یہاں۔ یہاں اب کوئی نہیں۔رہتا۔‘

انہوں نے زیرلب کہا۔

’یہاں۔سنو۔سنو۔ادھر۔اب ادھر کوئی نہیں رہتا۔‘

ثریا بیگم نے پکار کر کہا۔

’’کوئی نہیں رہتا ہے اب یہاں۔۔یہاں بڑا سناٹا ہے۔۔‘‘

انہوں نے چیخ کر کہا اور دھاڑیں مار مار کر رو دیں کہ کہیں کوئی آواز نہیں تھی اور نوکر پیشہ بنگلے سے خاصا دور مشرقی دیوار کے آخری گوشے میں واقع تھا۔ثریا بیگم بہت دیر روتی رہیں۔انہیں نجم خان کی بے حد یاد آرہی تھی۔انہیں بچے بہت یاد آرہے تھے۔انہیں بچوں کی سہیلیاں بہت یاد آرہی تھیں۔بچوں کی کھلائی عزیز بٹ کی بیوی یاد آرہی تھی۔انہیں بچوں کے بچپن میں پہنے کپڑے بہت یاد آرہے تھے۔سکول کو وردیوں والے ان کے بھولے چہرے اور کتابوں پر جھکے سر یاد آرہے تھے۔ نجم خان کے ہاتھوں جانچے جارہے بچوں کے پراگریس کارڈ یاد آرہے تھے۔ برابر والے بڑے کمرے میں بڑی سی مسہری کے عقب میں تختے پر لکھی ان کی ناداں تحریریں یاد آرہی تھیں۔اور وہ بیش قیمت لمحات یاد آرہے تھے جب وہ تینوں اس کے پیچھے پیچھے مرغی کے بڑے بڑے قدموں کے ساتھ اپنی رفتار قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ننھے چوزوں کی طرح لگے لگے پھرتے تھے۔اس کے مڑنے سے مڑتے تھے اور اس کے ہلنے سے ہلتے تھے کہ اب وہ نایاب لمحے کبھی نہیں آئیں گے اور اب بچوں کی اپنی دنیائیں ہیں اور نجم خان، شام کو گھر آکر بچوں کے فون یا خبر کی بابت پوچھنے والے نجم خان بھی نہیں ہیں۔اب گھر میں کوئی نہیں رہتا۔خود ثریا بیگم بھی نہیں رہتیں۔اب ثریا بیگم کی شکل کی، ایک زمانے کی حسین ثریا بیگم کی شکل سے ملتی ایک ادھیڑ عمر عورت چلتی نظر آتی ہے جس کے ذہن میں اس کے بچوں کا بچپن، اس کے شوہر کی رفاقت اور اس کی اپنی کم عمری ٹھہر گئی ہے۔ وہ اندر سے اپنی اُسی گرہستی میں رہتی ہیں جس میں جوان والدین ہیں، ننھی منی تین بیٹیاں گاہے ہنستی ہیں گاہے روٹھ رہی ہیں اور ثریا بیگم انہیں نجم خان کی گود سے لے کر یا خود گود میں اُٹھا کر سینے سے لگا رہی ہیں۔ان کے رخساروں پر بے شمار بوسے ثبت کر رہی ہیں۔ان کے آنسو اپنے آنچل میں جذب کر رہی ہیں اور انہیں ایک پل بھی اپنی نظروں سے دور نہیں کر رہیں اور ان کی ہر بات نجم خان کو بتا کر نجم خان کے قہقہوں میں اپنی ہنسی شامل کر لیتی ہیں، پھر بھلے ہی وہ بے دلی سے کسی کام میں مصروف ہوں۔کسی بچے سے ہی فون پر بات کر رہی ہوں۔مگر اب وہ گھر میں نہیں رہتیں وہ گھر میں صرف نظر آتی ہیں۔‘

ثریا بیگم اس وقت باغ میں نظر آرہی تھیں۔ وہ نیم اندھیارے باغ میں جا کر جھولے کو ہاتھوں سے ہلا کر لوٹی ہیں۔ جھولے کے اس طرف چبوترے پر اب کئی دن سے روٹی کے ریزے کسی نے نہیں بکھیرے تھے۔ثریا بیگم دروازے کی طرف لوٹتی سوچ رہی ہیں۔یہ پرندے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ثریا بیگم کو اچانک خیال آیا۔ یہ پرندے کیا کہتے

ہوں گے۔ ثریا بیگم ٹھٹھک کرٹھہر گئیں۔ اتنی دور جا کر صبح کیسے دانہ ڈالیں روز روز ۔ کتنی سردی ہوتی ہے۔ وہ باورچی خانے کے باہری برآمدے سے مشرق میں جہاں سے بہت سے نل غسل خانوں کی طرف جاتے ہیں ایک نیا نل لگوا کر ایک حوضیہ تو بنوا سکتی ہیں۔ اور سیمنٹ کا ننھا سا چبوترہ بھی۔ اور اس پر دانہ بکھیریں گی تو چڑیاں روز صبح وہاں آ کر چہکا کریں گی اور روز شام کو پھر آیا کریں گے۔ حوضیہ میں نہائیں گی اور پانی بھی پئیں گی۔ ثریا بیگم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ مسکراہٹ کا خیال آتے ہی آنکھوں میں آنسو آیا ہی چاہتے تھے کہ انہوں نے آنکھیں میچ کر انہیں جذب کر لیا۔

انہوں نے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے باورچی خانے کی طرف نظر ڈالی اور دوپٹے سے چہرہ پونچھنے لگیں۔ انگلیوں کے پوروں سے چہرے کو چھوا تو وہ آنسوؤں سے نم نہیں تھا مگر اتنی ہی دیر میں آنکھوں میں پھر تازہ تازہ آنسو بھر آئے تھے اور یہ آنسو ازل سے اس سماجی جانور، اس اشرف المخلوق کی ابدی دشمن تنہائی پر بہہ بہہ کر زندگی کے ساتھ ہی ختم ہونے والے آنسو تھے کہ دوسراہٹ کا کوئی نعم البدل نہیں ہوا کرتا۔ دوسراپن ہی ہر ذی روح کی کمزوری ہے۔ دوسراہٹ ایک انمول تحفظ ہے کہ کسی کا ساتھ زندگی کی سب سے طاقت ور علامت ہے کیوں کہ تنہا رہنے کے لئے کسی آسمانی طاقت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پھر انسان صوفیوں سنتوں میں شمار ہو جاتا ہے لیکن بڑے ریاض کے بعد۔

ثریا بیگم نے ایک گہری سانس لی اور گھر کے اندر داخل ہو گئیں کہ ابھی مغرب قضا نہیں ہوئی تھی'۔

پروفیسر دانش کا کردار ایک خاموش معذور دانش ور کا کردار ہے لیکن اس کردار کی مدد سے مصنفہ نے اپنی ہیروین کا کردار بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ بہت فطری انداز سے دکھایا گیا ہے کہ شیبا اپنے استاد کو ایک استاد کی طرح چاہتی ہے، ایک ہیرو کی طرح چاہتی ہے اور پھر آخر میں پروفیسر دانش کو ستر سالہ پروفیسر دانش کو اپنے بچے کی طرح چاہ کر عورت کی ممتا کی، ازلی و ابدی ممتا کی تکمیل کرتی ہے یہاں تک کہ اپنا محبوب اور اس محبوب کے ساتھ آسانی کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی بھی قربان کر دیتی ہے۔

اس ناول کے ہر باب میں جو شئے مشترک ہے وہ ہے اعلیٰ درجے کی جزئیات نگاری۔ جزئیات نگاری کارِ آسان نہیں ہے۔ عمیق مشاہدے کے بغیر یہ ہاتھ نہیں آتی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہزار کوشش کے بعد جو جزئیات نگاری ہاتھ آتی ہے وہ صرف اشیاء کی کھتونی ہوتی ہے جو تخلیقی نثر پر بوجھ بن جاتی ہے۔ لیکن اس ناول میں اشیاء' نباتات' حیوانات اور ان کی حرکات' مقامات' تاثرات اور جذبات کی جو جزئیات نگاری ہے وہ نثر کو قدم بہ قدم قوت دیتی ہوئی چلتی ہے۔ پلاٹ اور کردار کی مختلف کیفیتوں کے اظہار میں ایک پُرشوق معاون کا کردار ادا کرتی ہے۔ کسی ایک پیراگراف میں کوئی بات 'درآمد' کی ہوئی نہیں محسوس ہوتی۔ ہر بات پر اظہار اپنی اصل سے وابستہ و پیوستہ نظر آتا ہے۔ کشمیر سے باہر رہنے والے اردو داں قارئین کے لئے یہ بیان اس لئے بھی اہم ہے کہ کشمیر کے بارے میں اتنی تفصیل اور باریک بینی سے اب تک کوئی نثر پارہ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا ہے۔ جدید ناول کی تاریخ میں یہ ناول اس لئے بھی یاد رکھا جائے گا۔ زندگی کے مختلف مظاہر سے شدید محبت کے بغیر اتنی

بیش قیمت تفصیلات کا بیان ممکن نہیں ہے۔

ناول پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے ذہن کو نظر آنے والی ہر شے سے محبت ہے۔ درگاہوں کا طرزِ تعمیر، پکّے اخروٹوں کی مخصوص مہک، آدم خور چیتے کا شکار، حقے کی میز کی تراش خراش، نزہت کے ایامِ حمل کا بیان، بادام کے درخت کے مختلف رنگ' مختلف پرندوں کی شکل و صورت اور ان کی آوازوں کا بیان، برف باری کا بیان، کپاس کے پھولوں کے مانند نظر آنے والے لمبے لمبے باسمتی چاول' پروفیسر شیروانی سے خاموش محبت، غرض یہ کہ ہر چیز، ہر جذبے کے بیان میں خارجی منظر نگاری کے شانہ بشانہ داخلی کیفیتوں کا ایسا سچا اور بھرپور بیان ہے کہ پڑھنے والا جگہ جگہ مسحور سا ہو جاتا ہے۔ مصنفہ نے سماج کے ایک اور رجحان یعنی sib ling rivalary (برادرانہ/خواہرانہ چپقلش) کا ذِکر بھی بہت فطری انداز اور دلچسپ پیرایے میں کیا ہے۔ حقیقی بہنیں آپس میں کتنی حاسد ہو سکتی ہیں، اس ناول کو پڑھے بغیر مشکل سے ہی سمجھ میں آئے گا۔ ایک بات اور کہ مصنفہ کے مکالمے بہت فطری ہیں۔ کرداروں کی مناسبت سے مکالمات تخلیق کئے گئے ہیں۔ صرف مکالمہ پڑھ کر بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسے بولنے والا کس عمر، کیفیت، سماجی طبقے اور رشتے کا حامل ہے۔

ترنّم ریاض نے اس تحریر میں بظاہر کوئی نئی تکنیک نہیں استعمال کی ہے۔ پوری کہانی مرکزی کردار شیبا کے گِرد گھومتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ درمیان میں آنے والے تمام کرداروں کے ساتھ بھرپور انصاف کیا گیا ہے، خصوصاً ماں ثریا بیگم' باپ نجم خان' بہنیں' بھانجے بھانجیاں' دوست احباب خصوصاً میوری' پروفیسر دانش' ملازم سلیم میاں' پروفیسر شیروانی۔ ان سب کا ذکر ضروری تفصیل کے ساتھ ہے۔ آہستہ آہستہ تقریباً سارے کردار اپنا اپنا کام کر کے فیڈ آوٹ ہو جاتے ہیں۔ آخر میں بچتی ہے شیبا، ازلی و ابدی تنہا انسان۔

ٹیڑھی لکیر اور آنگن کے نسوانی کرداروں کی طرح یہ کردار بھی اپنا ان مِٹ نقش چھوڑتا ہے۔ عصمت چغتائی اور خدیجہ مستور کے کرداروں اور ترنّم ریاض کے اس کردار میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ شیبا زمانہ موجود کی وہ لڑکی ہے جو تعلیم اور ملازمت کے لئے اپنے گھر سے باہر دوسرے شہر میں رہتی ہے' دوستوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ اکیلے سیمناروں میں حصہ لیتی ہے اور اپنے فیصلے لینے کے لئے تقریباً خود مختار ہے۔ اس کے اوپر صرف ایک پابندی ہے اپنے دِل اور روایتوں کی پابندی۔ وہ انتہا کی قوت برداشت کے ساتھ (جو عورت کا خاصہ ہے) اپنی زندگی کے بارے میں ایک کٹھور فیصلہ کرتی ہے اور تمام زندگی ایک تنہا فرد کی صورت میں گزارنا اپنا مقدر کر لیتی ہے۔

عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی تخلیقی تحریروں میں سانس لیتے نسوانی کردار ہماری ادبی یادداشت کا بیش قیمت خزانہ ہیں۔ ''چوتھی کا جوڑا '' کی ہیروئن، ''جڑیں'' کی ضعیفہ، بچھو پھوپھی عصمت چغتائی کے ناقابلِ فراموش کردار ہیں۔ ان کرداروں کی زندگی کی بپتا میں ماحول، افراد اور مردوں کی خود غرضی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس طرح قرۃ العین حیدر کی جمیلن ہوں، یا سینٹ فلورا آف جارجیا، کی کارمن ہوں یا نظارہ درمیاں ہے، کی فیروزہ۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کی ثریا ہوں یا چھوٹی بٹیا۔ سب کی زندگی پر فرض یا ماحول یا حالات کا جبر صاف

نظر آتا ہے۔ان تمام کرداروں کی زندگی کے دکھ کا ایک منطقی جواز تلاش اور بیان کیا جاسکتا ہے۔’’ **برف آشنا پرندے** ‘‘ کی شیبا ان معنیٰ میں ان سب کرداروں سے مختلف ہے کہ اس کی محرومی اور دکھ حالات یا افراد کے جبر کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اعلیٰ اقدار اور تہذیب کے زائیدہ اس باطنی صبر و تحمل کا ثمرہ ہیں جسے حاصل کرنے کے لئے جذب وسلوک کی راہوں کے مسافر برسوں ریاضت کرتے ہیں۔وہ اعلیٰ اقدار کیا ہیں اور وہ تہذیب کن عناصر سے تشکیل ہوئی ہے، اسے جاننے کے لئے ایک دو اقتباس کافی نہیں ،مکمل ناول کا مطالعہ ضروری ہے۔آدمی کا انسان بننا اور دِل کا دِل درد آشنا بننا ہی اس ناول کی تھیم ہے۔اور یہ بھی کہ اعلیٰ قدروں اور ذاتی کردار کے جبر کی زائیدہ محرومیاں انسان کو کتنا صابر اور متحمل بنا دیتی ہیں اور ان محرومیوں کے باوجود انسان کس طرح اپنے پندار کے نازک شیشے کو سنبھال کر رکھتا ہے۔مجھے اس ناول کے اختتام پر کبیر کا یہ دوہا بہت یاد آیا،

چاہ مٹی، چنتا گئی، من ہوا بے پرواہ
جا کو کچھ نا ہی چاہیے، وہ ہی شہنشاہ

ناول کی نثر شفاف اور دبیز ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ سب کچھ نہیں بیان کر دیا گیا ہے، بہت کچھ بین السطور کے لئے بھی چھوڑ دیا گیا ہے۔اس ناول نے موجودہ فکشن کی لفظیات میں بھی اضافہ کیا ہے ۔ایسے سینکڑوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا تعلق کشمیر کی ثقافت اور وہاں کے ماحول اور جغرافیہ سے ہے۔

مجموعی طور سے ناول کا جو تاثر ذہن میں ترتیب پاتا ہے، اسے اجمل کمال کے چند جملوں میں اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔(یہ جملے’’آج‘‘شمارہ ۶۳ سے مستعار ہیں)

اس ناول کو پڑھ کر ’’ایک بار پھر تصدیق ہوتی ہے کہ انسانی معاشرت سے بڑھ کر ہوش ربا اور کوئی طلسم نہیں ،اور کسی بامعنیٰ فکشن کے لئے لازم ہے کہ وہ اس زمین پر قائم انسانی معاشرت کی بے شمار شعوری اور غیر شعوری تہوں کو مشاہدے اور بصیرت کی پوری توانائی کے ساتھ دریافت اور بیان کرنے کی کوشش کرے۔‘‘

ناول’’ **برف آشنا پرندے** ‘‘ اپنے تھیم‘ پلاٹ‘ کرداروں‘ مکالمات‘ پرندوں‘ نباتات‘ مقامات اور مختلف جذبوں کی کیفیات کے باوصف ایک آبی رنگوں کی بڑی سی تصویر کی طرح نظر آتا ہے، جس میں طلوع ہوتے اور غروب ہوتے سورج کی کرنوں نے اس طرح آگ سی لگا رکھی ہے کہ بعض حصے دھوپ کے ٹکڑوں کی طرح روشن نظر آتے ہیں اور کچھ حصے رخصت ہوتی روشنی کے ساتھ اتنے دھندلے ہو جاتے ہیں کہ پس منظر کا حصہ لگنے لگتے ہیں۔اردو کے قاری کو بہت دنوں سے کسی بڑے ناول کا انتظار تھا۔ ہم عصر جواں سال ادیبوں کے ناولوں میں شاید ہی کوئی ایسا ناول ہو جو اس ناول کو آئینہ دکھا سکے۔

ترنم ریاض (دہلی)

چمگادڑ

نور جہاں نے یہ منظر دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی اس نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

گو کہ وہ کچھ دور تھی اور بہت صاف طرح دیکھ نہیں پا رہی تھی تاہم اسے یہ نظر آیا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی کسی گندمی سے رنگ کے چمڑے کا ہیرے جڑا لباس پہنے ایک اونچی لعل جڑی کرسی پر، ایک موتی جڑی میز کے سامنے بیٹھا جواہرات سے چنی ہوئی بڑی سی رکابی میں کچھ کھا رہا تھا۔رکابی کے برابر کسی لمبے سے گلاس میں کوئی سرخ رنگ مشروب ہے۔آدمی کے ہاتھ میں کانٹا اور چھری ہے۔پھر آدمی نے چھری کانٹا تھالی میں رکھ دیا اور ہاتھ سے کھانے لگا۔اس نے مشروب کا گھونٹ بھرا تو نور جہاں کو اندازہ ہوا کی وہ مشروب گاڑھا تھا۔سرخ رنگ کا گاڑھا سیال۔

جب نور جہاں نے آدمی کی طرف بغور دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ آدمی کے ہاتھ میں ایک بے حد چھوٹا سا انسانی بازو تھا جس پر سے وہ دانتوں سے گوشت الگ کر رہا تھا۔نور جہاں کی نظر جلدی سے اس کی تھالی پر گئی۔تھالی میں ایک چھوٹا سے انسانی سر نظر آیا تو وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کیا دیکھ رہی ہوں میں ۔
وہم ہو گیا ہے مجھے۔کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔
اس نے سوچا اور پھر آدمی کی طرف دیکھنے لگی۔

سر سے جڑا ایک چھوٹا سا انسانی جسم بھی نظر آیا جس کے پاؤں پیٹ کی طرف خم تھے۔پیٹ کا حصہ کھلا اور کالا سا لگ رہا تھا۔جیسے جلا ہوا ہو۔چھوٹی چھوٹی ٹانگیں بھی سیاہ جیسی نظر آ رہی تھیں۔اور گول سر بھی اسی رنگ کا۔مگر سر تو کالا ہی نظر آتا ہے بالوں کے سبب۔دور سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا وہ حصہ بالوں سے ڈھکا ہے یا جلا ہوا ہے۔نور جہاں نے نظر اٹھا کر آدمی کی طرف دیکھا۔وہ طویل قامت تھا اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔اس کے سر کے بال بھورے اور سفید تھے اور وہ اپنے کھانے میں مگن تھا۔

کیا معلوم دہائیوں سے جاری ان یک طرفہ جنگوں میں مہلوکین کی لاشوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا

۔کون جانے یہ لوگ کس کس طرح سے ان کا استعمال کرتے اور کرنا چاہتے ہونگے ۔ایسے لوگ صرف محاوروں میں ہی غیر انسانی جملہ استعمال نہیں کرتے بلکہ واقعتاً جنہیں یہ دشمن کہتے ہیں ان کا خون مشروب کی طرح پیتے ہیں ۔ان کے منہ سے انسانی خون لگ گیا ہے ۔اب یہ کہانیوں والے مردہ خوروں کی اصلی شکلیں ہیں ۔صرف ان کے دانت لمبے نہیں ہیں ۔

اس نے جھرجھری لی ۔اور منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی ۔

کسی غیر مرئی طاقت نے اسے پھر اُدھر کی اور مڑنے کو مجبور کیا تو اس نے دیکھا کہ آدمی کے بڑے سے دہانے کے قریب ننھی ننھی انگلیوں والا چھوٹا سا پنجہ ہے ۔

نور جہاں کو اُبکائی سی آئی ۔اس نے آنکھیں زور سے بھینچ لیں ۔

کچھ پل بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو آدم خور آدمی کسی اور مخلوق میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ مخلوق بیضوی شکل کی تھی اور اس کے سارے بدن میں سے لمبی لمبی انگلیوں والے بڑے بڑے ان گنت پنجے نکلے ہوئے تھے اور جہاں اس مخلوق کا سر ہوسکتا تھا وہاں ایک چوڑا سا بے شمار دانتوں والا دہانہ تھا۔ جو اوپر سے زِپ کی طرح نظر آتا تھا۔اس حصے میں دماغ کے لئے جگہ نہیں بنی تھی اور باقی جسم میں سینے اور دل وغیرہ کے مقام پر صرف ایک لمبا سا پیٹ تھا۔

نور جہاں کا دل دھک دھک کرتا جیسے اس کے حلق سے باہر آیا چاہتا تھا۔ اسے لگا کہ اس کی دھڑکن رک جائے گی ۔ وہ زور سے چیخنا چاہتی تھی ۔مگر یہ جیسے اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ چلاّ کر رونا چاہتی تھی ۔مگر اس میں بھی وہ ناکام ہوگئی ۔اب اس کی دھڑکن بے قابو ہوگئی تھی ۔

کسی طرح نور جہاں کا ہاتھ اپنے دل کے قریب چلا گیا۔

قریب بیٹھی نرس فوراً اس کے پاس آگئی اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔نور جہاں آنکھیں بند کئے لیٹی رہی ۔نرس کو محسوس ہوا کی اس کی دھڑکن بے ترتیب چل رہی ہے۔اس نے داہنے ہاتھ سے لوہے کے پلنگ کے سرہانے لگا ایمرجینسی بٹن دبایا اور بائیں ہاتھ سے مریضہ کے گلے کی بائیں جانب ہنسلی سے ذرا نیچے پسلیوں پر مساج دینے لگی ۔ڈاکٹر نے فوراً آکر آکسیجن کی نلی سے مریضہ کی ناک اور دہانہ ڈھک دیا۔

شام کے قریب جب نور جہاں کو ہوش آیا تو تو اس سے ملنے اس کا بیٹا اور شوہر دونوں آئے تھے ۔

’’آج ہم گھر لے جائیں گے آپ کو۔۔چاہے کچھ بھی ہو۔۔‘‘

اس کے شوہر نے مسکرا کر اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

’’سُونا ہو گیا بھئی گھر ہمارا۔‘‘

انہوں نے آہ سی بھری۔

’’جی امی ۔۔آپ اچھی ہو جایئے نا جلدی سے ۔۔‘‘

بیٹا اداسی سے مسکرایا۔ ماں نے نیم واسی آنکھوں سے اسے ایسے دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ تم تو جانتے ہو اَب میں اچھی نہیں ہوسکتی ۔ بیٹے نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور ہتھیلی پر اپنا رخسار رکھ دیا۔

’’ہم ابھی آتے ہیں۔‘‘

اس کے والد ڈاکٹر سے ملنے کے لئے باہر نکل گئے ۔نور جہاں کو اپنے ہاتھ پر نمی کا احساس ہوا تو اس نے لمبی سانس لی ۔

’’مجھے معاف کر دیجئے امی ۔خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھال لیجئے ورنہ میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔‘‘

وہ رو پڑا۔

’’یہ میرا ہی قصور ہے ۔ مجھے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ میری امی کتنی حساس ہیں ۔دنیا کے بہترین انسانوں میں سے ایک ہیں ۔۔میں نے کیوں ۔۔کیوں ۔۔‘‘

اس نے اپنے گھنے گھنے بالوں والا سر ماں کے بازو پر رکھ دیا۔ ماں نے بمشکل اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔ ماں کی آنکھ کے گوشے پر آنسو کی ایک بوند ابھر آئی ۔

’’نہیں ۔۔میرا قصور ہے امی ۔ مجھے خیال رکھنا چاہیئے تھا ۔۔میں خود ہی ۔۔‘‘

اس کے والد ڈاکٹر کو لئے اندر داخل ہوئے ۔

کچھ سمجھ میں آیا ڈاکٹر صاحب ۔۔ہو کیا گیا ہماری ہنستی مسکراتی بیگم کو۔۔‘‘

’’کوئی فکر کی بات نہیں ۔۔مگر ابھی ہمیں کچھ دن اور اوبزرو کر لینے دیجئے ۔۔کوئی شاک لگا ہے ۔تھوڑے دن لگ سکتے ہیں اُس سے باہر آنے میں ۔۔‘‘

’’نہیں ڈاکٹر اس دن تو کہیں گئیں نہیں ۔۔ بہت خوش تھیں ۔۔ ہمارا بیٹا باہر سے ہفتے بھر کے ٹوَر سے آیا تھا ۔۔دیر تک اسی کے پاس تھیں ۔۔ پھر آ کر سو گئیں ۔۔اور صبح پھر آپ کو پتہ ہی ہے کہ بے ہوش تھیں ۔۔‘‘

عامر کو اپنے دفتر نے ایک سیمینار میں شرکت کیلئے جنوب مشرقی ایشیا کے ایک حصے میں بھیجا تھا۔ مختلف ممالک سے کئی لوگ آئے تھے ۔ ایک عمدہ ہوٹل میں رہائش کا انتظام تھا۔آخری دن جب آخری اجلاس جلد ختم ہوا تو وہ دو اور لڑکوں کے ساتھ قریب کے علاقے کا چکر لگانے کی غرض سے نکلا تھا ۔عامر کو یاد تھا کہ وہ گھومتے گھومتے کچھ چیزیں خریدتے ایک مقامی ریستوران میں کافی پینے کی غرض سے داخل ہوئے تھے ۔مگر

وہاں سے وہ ایک مرض ساتھ لئے آ گیا جس کا اس کے پاس کوئی علاج ہی نہ تھا۔

اس نے سن رکھا تھا کہ لوگ زندہ بندر کا بھیجا کھاتے ہیں۔مگر اس ریستورا ں کے مینیو پر سب سے اوپر جو پکوان درج تھا، اسے پڑھ کر اس کا اور اس کے ساتھیوں کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔دوبارہ غور سے پڑھا تو چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے۔

سب سے پہلی، سب سے مہنگی ڈِش ' ہیومن فیٹس ' تھی۔انہوں نے خود کو قابو میں رکھ کر ٹوٹے الفاظ میں ویٹر سے تصدیق چاہی تو پتہ چلا کہ ڈِش وہی تھی جو انہوں نے پڑھی تھی۔ بلکہ اس غیر انسانی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے انہوں نے ہوٹل کے مینیجر سے دریافت کیا۔

اس نے الٹا انہی سے سوال کیا تھا کہ کیا ایسا کرنا پریکٹیکل بات نہیں ہے۔کیا ایسا کرنا تکنیکی طور پر غلط ہے۔

اور وہ لوگ ادھ کھلے ہونٹ لئے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

ان کا ایک ساتھی جولا جواب حسِ مزاح رکھتا تھا، خود کو اور اُن کو یہ محسوس کرانے کی خاطر کہ وہ اسی دنیا میں ہیں اور زندہ ہیں اور کوئی ڈراونا خواب بھی نہیں دیکھ رہے، اپنی زبان میں بولا تھا کہ نکل چلو۔یہ آدمی نظر آنے والا مشینی پرزہ، احمق سمجھ کر ہمارے کباب بنائے گا اور خوب پیسے کمائے گا ۔مگر اس کے ساتھیوں کے چہروں سے حیرت اور خوف کے تاثرات ہی گئے نہ وہ خود ہی اپنے کہے جملے سے اک ذرا بھی محظوظ ہو سکا۔

پھر وہ لوگ ایک منٹ ضائع کئے بغیر ریستوران سے باہر نکل آئے۔ایک نے الٹی کر دی۔دوسرے کو ہوٹل پہنچنے تک چکر آتے رہے۔تیسرا رو رہا تھا۔

فلائٹ اسی رات کی تھی ۔دوسرے دن عامر گھر پہنچا تو پتھر سا خاموش تھا۔والدین نے لپٹایا تو ہلکے سے مسکرا دیا تھا مگر چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔گھر والوں نے سوچا کہ سفر میں رات دن کے تفرّق کے سبب Jet Lagged ہے اسی لئے چپ سا ہے۔ آرام چاہیئے اسے۔

وہ اپنے کمرے میں آیا تو اپنے ایک دو قریبی دوستوں کو فون پر یہ باتیں بتائیں۔معلوم ہوا کہ ایک نے پہلے یہ بات سنی تھی مگر یقین نہیں کیا تھا۔کچھ دیر بعد اس کے ایک دوست کے دوست نے اسے کچھ انفارمیشن اور تصاویر میل کیں۔جن میں کچھ پرانے قبیلوں کا ذکر تھا۔جزائر پر صدیوں سے آباد قبائل کی تصاویر تھیں جن کی جدید دنیا تک رسائی نہیں تھی۔مگر کچھ تصاویر ایسی بھی تھیں جو تہذیب یافتہ دنیا کے باشندوں کی ہو سکتی تھیں۔گو کہ ساتھ ہی یہ تحریر تھا کہ یہ کسی مصدقہ ذریعے سے دستیاب نہیں ہوئیں تاہم تصاویر اصلی نظر آتی تھیں اور کسی بھی انسانی صفات رکھنے والی روح کے لئے کسی اذیّت سے کم نہیں ہو سکتی تھیں۔

عامر پتھر کا بت بنا ماؤس گھماتا رہا۔معلومات میں لکھا تھا کہ یہ لوگ وقت سے پہلے ضائع ہوئے یا ضائع کر دئے گئے انسانی بچوں کو ضائع نہیں کرتے کہ وہ حیاتین سے پُر اور ذائقہ دار ہوتے ہیں۔اس نے کچھ عرصہ پہلے جب یہ پڑھا تھا کہ ایبارٹڈ فیٹس، کاسمیٹک سرجری وغیرہ میں استعمال کئے جاتے ہیں تو اس کا دل بہت تیز، بہت دیر تک دھڑکتا رہا تھا۔

وہ عجیب طرح کی ذہنی تکلیف سے دوچار ہوا تھا۔

عجب بے چارگی اور محرومی کا احساس ہوا تھا اسے۔

گھن آئی تھی۔

غم ہوا تھا۔

اور بہت سے ہارے ہوئے جذبوں سے اس کا بے بس سا تعارف ہوا تھا جن کو سمجھنے کے لئے اس کا ذہن تیار نہیں تھا اور جن کو نام دینے کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔

اس نے گھنٹوں خود کو ٹوٹا ٹوٹا سا محسوس کیا تھا اس روز۔

مگر اس وقت جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اس نے اسے خود سے اور گرد و پیش سے بے گانہ کر دیا تھا۔وہ پسینے سے نہایا ہوا، سہما سہما کمپیوٹر سے لگا اس قدر محو تھا کہ اسے خبر ہی نہ ہو پائی کب اس کی والدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔کمپیوٹر دیوار سے لگا تھا اور اس کی پیٹھ دروازے کی جانب تھی۔والدہ نے جو مانیٹر پر دیکھا وہ یکے بعد دیگرے دو تصاویر تھیں۔ایک میں منگولیائی نقش و نگار کا ایک شخص کشتی میں کچھ لئے آ رہا تھا۔اس کے نیچے کی عبارت میں ' روسٹڈ ہیومن فیٹس ' تحریر تھا۔جسے وہ ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عام طور پر اپنے کھانے کی طرف دیکھتا ہو۔اور دوسری تصویر بھی اسی آدمی کی تھی جو ایک معمولی سے رستوران میں اسی تھالی سے کھا رہا تھا اور ساتھ میں سنگترے کا جوس کا گلاس تھا۔وہ چکرا کر گرنے والی تھی کہ بیٹے نے تھام لیا وہ خود بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

''یہ سچی تصویریں نہیں ہیں امی۔۔''

اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ۔۔یہ۔۔''

ماں بول نہیں پائی تھیں۔

''دیکھئے نا کیسے کیسے فوٹو گرافرس ہیں۔۔کمپیوٹر نے تو جھوٹ سچ ایک سا کر دیا۔۔ ایسا لگتا ہے جیسے سچے فوٹو گریف ہوں۔۔''

وہ مسکرانے کے سے انداز میں بولتا گیا۔ماں نے کسی صورت حواس یکجا کر کے اسے بغور دیکھا تو اس

کے ممتا بھرے دل میں ایک اور خوف گھر کرنے لگا۔

عامر بہت چھوٹا تھا۔کوئی تین برس کا۔ایک روز رات کی خبروں کے بعد ٹیلیوژن پر فلم چلنے لگی تھی۔فلم دلچسپ تھی۔گھر میں سب دیکھنے لگے تھے۔عامر بھی نیند سے گویا لڑلڑ کر فلم دیکھ رہا تھا۔ماں نے سلانے کی کوشش کی تھی۔مگر زیادہ نہیں کہ دوسرے دن اتوار کے سبب سکول بند تھے۔وہ کہانی میں محو تھا اس کے بال ماتھے پر آجاتے تو انہیں ہاتھوں سے ایک طرف ہٹاتے وہ نیند بھری آنکھوں کو مسل دیتا۔

کہانی میں ایک گمشدہ پگلی کو ایک نوجوان اپنے گھر لے آتا ہے اور اس کی بہت دیکھ بھال کرتا ہے۔اپنے ہاتھوں سے کھانا اور دوائیں کھلاتا ہے۔اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔اسے لوریاں گا گا کر سلاتا ہے۔وہ اداس یا ناراض ہو تو جانوروں کی نقل اتار کر اسے ہنساتا ہے۔ضد کرے تو گال پھلا کر اس سے تھپڑ بھی کھاتا ہے۔

جب وہ اس کی انتھک خدمت سے صحت یاب ہو جاتی ہے تو اسے پہچان ہی نہیں پاتی۔

وہ لوری گاتا ہے کہ کبھی وہی لوری وہ اس کے ساتھ گانا سیکھ گئی تھی۔

تو وہ حیرت سے اسے دیکھتی ہے۔اسے کچھ یاد نہیں ہوتا۔

وہ بندر کی طرح اچھلتا ہے،تو وہ پہلے کی طرح نہیں ہنستی۔

فلم کے اختتام تک وہ جب اسے کسی طرح یاد نہیں دلا پاتا اور وہ والدین کے ساتھ لوٹ جاتی ہے تو وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر رو پڑتا ہے۔

اس منظر پر عامر دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔اور ہچکیاں لے لے کر تتلائی زبان میں والدین سے سوال پر سوال کئے جاتا تھا۔

''وہ للکی اسے کوں نئیں پیچانتی امی۔۔ابّو اُس للکی کو کون بتائے گا ۔۔وہ لوتا ہے۔۔ وہ کُوں لوتا ہے۔۔وہ چپ نہیں کرتا۔۔''

اور اس رات عامر آدھی رات تک روتے روتے سو گیا تھا۔

ایسے حساس بچے کو ہرگز اس بات کو سچ نہیں سمجھنا چاہیئے ۔

''ہاں بیٹا۔۔میں جانتی ہوں۔۔''

نور جہاں نے کپکپاتی لڑکھڑاتی زبان کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چہرے پر کچھ ہنسی جیسی شے طاری کی۔

''وہ تو پینٹ شرٹ پہنے ہے۔۔کوئی وحشی قبائلی تھوڑی ہے۔۔اور پھر اب تو کوئی ایسا وحشی بھی کہاں

ہوگا۔۔دنیا اتنی سِویلائزڈ ہو گئی ہے۔۔سب کیمرہ ٹِرکس ہیں۔''

بیٹے کو وہ آرام کی تلقین کر کے خود بھی کمرے میں چلی گئی۔

شوہر کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ عامر کے کمرے میں کیا ہوا۔اس کے تھرتھراتے کانپتے دل میں بار ہا یہ خیال آیا کہ وہ شوہر سے اس بارے میں بات کرے تو شاید وہ کوئی تسلی بخش جواب دیں گے مگر شکار کرنے کو پشتینی سند سمجھنے والے خاندان کی دوسری نسل کے تیسرے چشم و چراغ کو جو کسی مرغی کو ذبح ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے،ایسی دل آزار بات کے بارے میں کوئی کیا پوچھے۔چنانچہ کمزور دل پر پتھر کی سل سا بوجھ لئے وہ سونے کی کوشش کرتی رہی۔

وہ پڑھی لکھی،سیاسی وسماجی بصیرت سے بہرہ ور خاتون تھی۔جانتی تھی کہ انسان کی یہ حیوانیت آج کی دنیا کی کنفیوزڈ سیاسی صورتِ حال کے سبب ہے کہ اس دور میں کیا نہیں ہوتا۔

ایک طرف تو اشرف المخلوق کی روحانی اور اخلاقی بنیادیں تبدیل کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف نئی طرز کی سیاست فروغ پا رہی ہے۔

دشمن تخلیق کئے جاتے ہیں اور دوستوں اور دشمنوں کی فہرستیں بدلتی رہتی ہیں۔پھر دنیا کو یہی باور کرانے کی کوشش ہوتی ہے کہ ستم گر،ستم ڈھانے میں حق بجانب ہیں۔

اسے معلوم تھا کہ روغنی زمینوں والے اگر آرام طلب نہ ہوتے،عیاشیوں کے زیرِ اثر حواس گم کر کے اپنی ہی مٹی پر دوسروں کو ٹھکانہ کرنے کی اجازت دے کر ان کے ہاتھوں میں نہ کھیلتے تو اس وقت دنیا کا منظر نامہ الگ ہوتا۔وہ یہ بھی جانتی تھی کہ قدیم علوم اور جدید تہذیب کا سہرا اپنے سر لینے والوں نے بہت سی چیزوں کا استعمال اسی مہذب قوم سے سیکھا جو ندیوں پیڑوں یا پر فضا مقامات کی روح پرور فضاؤں سے نہیں،ریگستانوں سے اٹھی تھی۔اور جب وہ تہذیب کے شروعاتی عمل سے دوچار تھے اس سے کہیں پہلے یہاں اِس سرزمین پر،اس کی اپنی سرزمین پر دانش گاہیں تعمیر ہو کر کئی نسلوں کو کئی صدیوں تک مختلف علوم سے بہرہ ور کرنے کے بعد پھر معرضِ وجود میں آنے کے لئے اجڑ بھی چکی تھیں۔اور اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ یہ زمانہ مثبت تہذیبی کارناموں کو اپنے کھاتے میں ڈالنے کا ہی نہیں، ذرائع ابلاغ کے بے مُہار استعمال سے ایسی دیدہ دلیریوں کے فروغ کے ساتھ ساتھ بہتان اور دِروغ گوئی کا بھی ہے۔

اسے خبر تھی کہ عام انسان کو تیز گام زندگی کی ایسی دوڑ میں دھکیلا گیا ہے کہ اس کے پاس سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔وہ بھی مشین کی طرح دوسرے کَل پرزوں پر انحصار کرتا بھاگا جا رہا ہے۔سوچنے کے لئے ذرا ٹھہر جاتا تو سوچتا کہ دنیا میں بھلا کون اپنے معصوموں کو جواں مرگی کا پیام دے گا۔اپنے تو ایسا نہیں کرتے۔محرومیوں

اور رسوائیوں کا یہ سامان کون کر رہا ہے۔لالچ، بالا دستی، زبردستی۔کون جانے؟

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ اندھی بڑی طاقتیں کس کس بہانے سے آپس میں مل کر خوش حال ممالک کی زمینوں کے اثاثے ہڑپنے کا سامان کرتی ہیں۔

دوست بن کر کمزوریوں کو خریدتی ہیں اور نہ خرید پائیں تو بے سبب کے دشمنوں کی طرح علی الاعلان حملوں پر اتر آتی ہیں۔ ترقی پزیر ملکوں کو توڑنے اور غلام بنانے کے لئے انسانیت سوز حرکات کر رہی ہیں۔

بظاہر اخباروں میں عام انسانوں کی طرح آئس کریم کھاتے اور بچوں سے کھیلتے تصویریں چھپواتے ہیں یہ لوگ۔گویا وہ بھی انسان ہے۔اور بباطن ایسی حرکات کئے چلے جاتے ہیں۔گویا انسان ہی نہیں۔

مگر کسی کے لئے تو رکھتے ہوں گے یہ لوگ بھی نرم گوشہ۔کچھ تو انسانیت کی رمق ہوگی ان کے اندر، کہ ان کی شکلیں انسانوں جیسی ہیں۔

تو وہ رمق سب کے لئے کیوں نہیں۔کوئی تو اس رمق کو جگائے ان کے اندر۔

کون جگائے گا۔

شاید کبھی وقت انہیں سمجھا دے۔مگر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد۔جب یہ لوگ خود ہوں گے نہ ان کے مظالم جھیلنے والے۔

ہٹلر مناظر کو مصوّر کیا کرتا تھا۔مگر تصویر کے گوشے میں پس منظر سے جدا کسی رنگ میں چھوٹا سا 'روڈالف' پینٹ کیا ہوا منظر کسی بھی تہذیب یافتہ شخص نے اپنی نشست گاہ کی زینت بنانا گوارا نہ کیا۔

پھر وہی ہوگا۔آنے والا دور اس دور کے یک قطبی تصور کی ناخدائی، شب خون مارنے والی اس انسان نما، شپرہ چشم مخلوق کو بھول سکے گا؟

خونخواہی کی مسلسل مثال، ان زندہ بدروحوں کو کیسے کیسے یاد کرے گا۔

اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان کے علاوہ کچھ ایسے شدید نسل پرست بھی ہیں جو اپنی نسل کو اتنا اہم اور عظیم سمجھتے ہیں کہ اگر دوسری نسل کے فرد کا بچہ ان کے وہاں کسی کی امید بنا پل رہا ہے تو اس کی نشو ونما کو جراحی عمل سے روک دیتے ہیں۔خود کو ایسا سالم اور خالص سمجھتے ہیں کہ اپاہج بچوں کو پیدائش کے وقت مار کر غالباً دفنا دیتے ہیں کہ ان کے ملک میں کوئی اپاہج انسان نظر نہ آئے۔کبھی رعب ڈالنے کی خاطر اور کبھی انا کی تسکین کے لئے نیوکلیائی تجربے کرتے ہیں۔یہ لوگ محض انا کی تسکین کے لئے جانیں لے سکتے ہیں۔یہ لوگ فاقوں سے بے حال ہو کر پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لئے غلط چیزوں کے استعمال پر مجبور نہیں ہوتے۔یہ لوگ شوق کی تکمیل کے لئے انسانیت سوز کام کرتے ہیں۔

یہ لوگ ان ایبارٹڈ بچوں کو دفنانے کی بجائے کھا بھی سکتے ہیں۔۔

یہ لوگ اپنے بچوں کو بھی۔۔یعنی۔۔یعنی۔یہ لوگ بھی جانوروں کی طرح۔

یعنی جیسے بلی کو ڈر لگا رہتا ہے کہ خود ان کا باپ ہی اپنے بچوں کو نہ کھا جائے۔

جیسے سانپ اپنے ہی بچوں کو کھانے کا موقع ڈھونڈتا ہے۔اور ممتا۔ممتا کی ماری ناگن۔

ان کی عورتیں تو اس میں حصہ دار نہیں ہوسکتیں۔۔ان چند مردوں کی طرح جنہیں ممتا بھرے دل سے نوازا ہو قدرت نے۔جن کے بل پر انسانیت باقی ہے۔

ان ہی باتوں پر سوچتے سوچتے نور جہاں کے تھکے دماغ کے لاشعور نے ان سب انہونی سچائیوں کو خواب بنا کر تصور کی آنکھوں کے سامنے کر دیا تو وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔

خواب میں وہ آدم خور گاہے سرخ وسفید جلد اور نیلی ہری یا بھوری آنکھوں والا طویل قامت ہوتا، گاہے پیلی رنگت چندھیائی آنکھوں اور پھیلی ناک والا جو انسانی کھال میں ہیرے جواہرات جڑ کر زیبِ تن کرتا ہے اور اس کے کمرے کا فرنیچر نہایت عمدہ ہوتا ہے۔اور کبھی وہ منگولیائی نسل کا قدرے کوتاہ قد آدمی ہوا کرتا اور ایک معمولی سے ریستوران میں نظر آتا ۔

نور جہاں کی آنکھ لگتی تو خواب گویا دل کی جانب جاتے ہوئے خون کو منجمد کر دیتے۔ اور یہ سلسلہ آج تین روز سے جاری تھا۔

ڈاکٹروں نے علاج کے لئے زیادہ تر نیند کی گولیاں ہی تجویز کی تھیں۔

ہسپتال میں لیٹی ماں کو دیکھتا ہوا عامر سوچ رہا تھا کہ جب ماں پوری طرح بیدار ہوگی اور اس کے ساتھ گھر چلے گی تو وہ اس سے کہے گا کہ وہ گاؤں جا کر دادا جان کے ساتھ اپنی زمینیں سنبھالیں گے اور باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔۔کیوں کہ یہ۔۔گلوبلائی زیشن۔۔کلوننگ۔۔یہ نیوکلیائی ہتھیار۔۔ہلاکتوں کے یہ جدید سائنسی آلات۔۔دراصل انسانیت کا کمرشلائزیشن ہے۔۔ اور فطرت سے بہت دور بھی۔۔اسی لئے انسان کی معصومیت چھن گئی ہے۔۔اور لوگ جانور ہوگئے ہیں۔۔اور اسے اس ملٹی نیشنل کمپنی کی نوکری نہیں کرنی ہے۔۔اسے نیچر کا حصہ بن جانا ہے۔۔وہ سب نیچر کا حصہ ہوجائیں گے۔

یہ فیصلہ کرتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی ۔کیوں کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماں اس بات کے لئے آسانی سے ہاں کر دیں گی۔اور ابو کو بھی منالیں گی۔



ترنم ریاض

خطائے مسلسل اور دیدہ دلیری

کچھ روز قبل صبح صبح اخبار میں ایک عجیب خبر پر نظر پڑی کہ کسی ادیب نے برسہا برس تک جاری اپنی بعض غلطیوں کا اعتراف کیا ہے۔سوال یہ ہے کہ اگر کوئی لگاتار جانتے بوجھتے ہوئے ایک خطا کئے جائے، تو کیا قدرت اس کی معافی قبول کرے گی؟ بندوں کی بات تو جانے دیجئے۔خطائے مسلسل کی سزا اللہ میاں نے کچھ زیادہ نہیں رکھی ہوگی؟ یا پھر سزا کا احساس دیانت داری کے جذبے سے جڑا ہے کہ کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اسے سزا کی شدت بروقت محسوس نہیں ہوتی۔اور بعدازاں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہ جاتا۔

وِدیادھر سورج پرکاش نے اپنی سوانح لکھنے کا مختار انگریزی کے مقبول قلم کار پیٹرک فرینچ کو قرار دیا تو بہت سی باتیں منظرِ عام پر آئیں۔برہمن نژاد وِدیادھر کے خاندان نے انیسویں صدی کے آخیر میں بھارت کے شہر اتر پردیش سے ٹرینی ڈاڈ (ویسٹ انڈیز) کے لئے ہجرت کی تھی۔انیس سو بتیس سے دنیا میں آنے کے بعد جس وقت ان کا قلم، ناول اور سفرنامے لکھنے کے قابل ہوا تو پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ عالمِ اسلام کے خلاف زہر اگلنا اپنا اصول بنا لیا۔اور اس جذبے میں وہ اس طرح غرق ہوئے کہ تحریر کے فنی پہلو فراموش کر کے صرف ایک ہی موقف کے زیرِ اثر لکھتے رہتے۔یہ بات بھی ایک اذیت ناک سچائی ہے کہ اس طرح کی تحریروں کے خریداروں کی تعداد اب ایک زمانے سے بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔اس کی دل شکن مثال یہ ہے کہ پچیس برس تک نوبیل انعام کی طویل فہرست میں ابھرنے اور مختصر فہرست میں آنے سے پیشتر ہی ڈوب جانے والا، ودیادھر سورج پرکاش نائپال کا نام بالآخر نائن الیون کے صرف ایک مہینے بعد سن دو ہزار ایک کے ادبی نوبیل اعزاز کے لئے ان کی اسلام دشمن خدمات کے اعتراف میں موزون قرار پایا۔سب جانتے ہیں کہ اس فیصلے کے خلاف دنیا بھر کے انسان دوست دانشوروں نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔

ایک بات پر میرا یقین ہے کہ اچھا انسان ہی اچھا فن کار ہوسکتا ہے کہ آوازِ خلق نقارہ ءخدا ہوا کرتی ہے۔ اور ایسے متنازعہ فیہ قلم کاروں کی پشت پناہی میں، ظاہر ہے کہ سیاسی مفادات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔اس طرح کا 'غیر ادیب' جانتا ہے کہ اس کا کمزور ادب اسی بہانے بکے گا۔اور منفی ہی صحیح، شہرت حاصل کرلے گا۔کیوں کہ اس

کے ضمیر کی کوئی منصف مزاج طاقت، اس سے سوال نہیں کیا کرتی کہ وہ اس طاقت کو خود پرستی اور اغراض کے پیشِ نظر تھپک تھپک کر سلائے رکھتا ہے۔پنپنے ہی دیتا ہے، نہ کبھی سینچتا ہی ہے۔یہ الگ معاملہ ہے کہ خطا کے اِس اعتراف میں بھی موصوف کا، چونکانے سے شہرت حاصل کرنے والا وہی عمل پوشیدہ نظر آتا ہے جو نا کام ادیبوں کا خاصا رہا ہے۔

مجھے یہ بات نہیں کہنا تھی۔میں تو اپنے برآمدے کے ایک پسندیدہ گوشے میں چڑیوں کا مشاہدہ کرتی چائے پی رہی تھی کہ اخبار کی سرخی نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔مگر پھر بھی میں نے الجھ الجھ کر سوچتے وقت نظروں کو بے خیالی میں درختوں کے بیچ الجھائے رکھا۔باغ کے کنارے ایستادہ نیم کا درخت پتوں سے خالی ہو رہا تھا کہ دو ایک روز میں ہی پھوٹنے والی ننھی ننھی کونپلیں جو ٹہنیوں کے کناروں پر اپنی نازک گردنیں اٹھائے اُبھرنے لگ پڑی تھیں، اسے پھر ہریالی سے لادنے والی تھیں۔پتوں کے کم ہو جانے سے جہاں ٹہنیوں کی بنیادوں کے سہارے بُنے گئے کچھ گھونسلے واضح نظر آنے لگے تھے وہاں اور بھی بہت سی دلچسپ حقیقتیں مجھ پر آشکارہ ہوئیں۔مختلف نسل اور جسامت کی چڑیاں اپنے آشیانوں کے لئے نیم کے وہ تنکے توڑ کر لے جاتی نظر آئیں، جن کے پتے خشک ہو کر گر چکے تھے۔ یہ تنکے بھی رفتہ رفتہ جھڑ رہے تھے اور ایک اچھے نشیمن کی تعمیر کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔چھوٹی چڑیاں اپنی منی سی چونچ میں بڑی محنت کے بعد چھوٹی شاخوں سے لگے کچھ سوکھے ہوئے سے تنکے نکال کر اُن درختوں کے اندر کہیں لے جاتیں جنہیں ابھی ابھی بہار نے پتوں سے لاد دیا تھا۔اور بڑے پرندے اپنی پرشکوہ منقار میں اپنے جثّے کے حساب سے بڑے تنکے چنتے۔یہ ننھی ننھی جانیں اپنے گول گول پھولے ہوئے پیٹ لئے کئی دن تک ہر صبح مسلسل محنت کرتی نظر آتیں مگر کسی ایک بھی طائر نے نیم کی شاخوں میں پہلے سے بنے گھونسلوں میں سے ایک تنکا نہ چھوا تھا۔گھونسلے کے مکین کی عدم موجودگی میں بھی نہیں۔پرندے وہاں سے ایسے گزر جاتے جیسے چھوٹے بڑے سوکھے تنکوں کا گھونسلہ وہاں پایا ہی نہ جاتا ہو۔ضمناً یہ بھی تحریر کردوں کہ اُدھر باغ کے بیچوں بیچ، دو نادان بلبلیں برقی کھمبے میں لگے قمقمے کے اندر ٹین کی چھت اور بلب کے شیڈ کے درمیان گھونسلہ بُننے میں منہمک نظر آئیں۔بڑا دکھ ہوا۔اتنی مشقّت کے بعد جب رات کو بتیاں روشن ہوتے ہی حرارت کے سبب ان کا وہاں ٹھہرنا دوبھر ہو جائے گا تو کہاں جائیں گی کہ کون جانے کس نشیمن پر کب برق پاشی ہونے لگ جائے۔روح فرسا صدائیں پیدا کرتی ہوئی آگ اور چنگاریاں برسنے لگیں اور زمین پر پہنچتے ہی شعلوں میں بدل کر بستیاں اجاڑتی چلی جائیں۔

نیم کے درخت میں البتہ اپنی مرضی سے چھپتے ظاہر ہوتے طائروں کی ملکیت، اِن ٹہنیوں میں مجھے گلہری کی آمد و رفت بالکل پسند نہیں آئی۔وہ تنے کے آس پاس اپنا گھوم گھام لیا کرے، چینٹیوں کے بلوں کی خبر لیتی، ان کے اناج کے ننھے ننھے ذخائر پر دھاوا بولتی یا موٹی ڈالوں سے لٹک کر کچی پکی نبولیاں کھایا کرے۔ پرندوں کی سلطنت میں گلہری کا بھلا کیا کام؟ نرم نرم پروں سے پرواز کرنے والی آسمانی کائنات کی بادشاہت میں، ہاتھ

پیروں والے جانور کی موجودگی چہ معنیٰ دارد؟ مگر اب تو کسی کی بھی سلطنت پر کسی کا بھی کام نکل آنے کا کوئی بھی جواز نظر نہیں آیا کرتا۔ اور کام ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ بدنصیب خطوں کو تہہ وبالا کر کے بھی۔ خیر!

میرا ایک اور بات پر بھی یقین ہے کہ وہی انسان، انسان کہلانے کا حق دار ہے جس کا برتاؤ اپنے کنبے سے مشفقانہ ہو۔ جس کی زندگی کے رفیق کو اس سے کوئی گلہ نہ ہو۔ چاہے وہ اپنے شعبے میں کتنا بھی کامیاب کہلائے مگر ان باتوں کی عدم موجودگی میں وہ کامیابی ٹھوس نہیں ہوگی۔

وی۔ ایس۔ نایپال کی شادی سن اٹھاون میں پیٹریشیا نام کی ایک معلّمہ سے ہوئی تھی۔ اس کے تین سال بعد سے ہی موصوف نے بالاخانوں کی سیر کرنا شروع کر دی۔ اس بات کا علم ان کی شریک حیات کو نہیں تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ چالیس سالہ ازدواجی زندگی میں چوبیس برس تک ایک بیاہتا اینگلو ارجنٹائن عورت مارگریٹ گُڈر کے ساتھ نائپال کے تعلقات بھی رہے تھے اور اس بات کی خبر ان کی بیوی کو تھی جو کیسنر کے مرض میں مبتلا ہوگئی تھی۔ کینسر اور شوہر کی بے وفائی کو ایک ساتھ جھیلتی ہوئی پیٹریشیا کو جب ان کی اِس شرمناک عادت کا پتہ چلا تو اس کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور بالآخر اس کی موت واقع ہوگئی۔ موصوف کو اعتراف ہے کہ ان کی بے اعتنائیوں کے باعث پیٹریشیا کی جان چلی گئی مگر اس کا کوئی پچھتاوا ان کے کسی طرزِ اظہار میں نظر نہیں آتا۔ بیوی کے بسترِ مرگ پر انہوں نے مارگریٹ سے تعلقات منقطع کر لئے اور اس کی آخری رسومات کی ادائیگی کے دوسرے روز اپنے دولت خانے پر پاکستان کی ایک مطلقہ صحافی خاتون کا استقبال کیا۔ پھر دو مہینے بعد ان ہی صحافی صاحبہ نادرہ خانم علوی سے وی ایس نائپال نے بیاہ رچا لیا اور وہ لیڈی نائپال کہلوانے لگیں۔

پاکستان کے چوٹی کے کالم نگار خالد حسین نے وی ایس نائپال کی تحریروں کے فکری دیوالیہ پن کو ذہنی خودکشی سے تعبیر کیا ہے۔ موصوف کی شادی کے واقعے پر خالد صاحب کا دلچسپ فلمی جملہ کہ نادرہ اب ڈراکیولا کی دلہن بن گئی ہے، صحافتی حلقوں میں خوب مشہور ہوا تھا۔ نیم کے درخت اور باقی درختوں کے طیور کبھی ایک ساتھی کے ہوتے دوسروں کی تلاش میں نہیں رہتے۔ بعض پرندے تو مرجانے والے ساتھی کے غم میں کھانا پینا تیاگ کر جان دے دیتے ہیں۔ مگر میں اس شدت کے حق میں بھی نہیں کہ ربّ الارباب کی عطا کی ہوئی زندگی لینا انسان کے اختیار میں کیوں کر ہوسکتی ہے۔ لیکن وفا بہرحال وفا ہے اور ایمان کا ایک حصہ بھی۔

Among the believers اور An Islamic Journey جیسے شدت پسند سفرناموں کے مُحرّر نائپال نے بابری مسجد کے انہدام کو جائز قرار دیا تھا۔ امن کے نام نہاد علَم برداروں کی طرف سے اس آدمی پر تیسری دنیا یا مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا الزام لگانا تو درکنار، الٹا اسے انعام واکرام سے نوازنا بھی ایک پسندیدہ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا گیا۔

دو، کولونو لائزڈ خطوں، ہندوستان اور ویسٹ انڈیز سے تعلق رکھنے اور انگریزی شہریت والے نائپال، کھلے عام

سیاہ فام قوم کے خلاف بھی نسل پرستی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مگر اس کا بھی کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے ہی جیسے موصوف کی اسلام دشمنی کی کوئی وجہ پتہ نہیں چلتی۔ مغرب کی سفید فام نسل سے وہ خوامخواہ اس قدر کیوں متاثر ہیں کہ نہ تو وہ نسب سے مغربی ہیں نہ شکل سے سفید فام؟ (ہوسکتا ہے یہی سبب ہو) پھر یہ کس احساسِ کمتری کے شکار ہیں کہ ان کی غیر متوازن تحریر صرف ایک مخصوص ریڈرشپ کے لئے ہی ہوتی ہے۔ اور ان کا قاری وہی ہوتا ہے جس کا ادبی ذوق فرقہ پرستی کے اطراف گھومتا ہو۔ کسی بھی قلم کار کے لئے یہ بہرحال ناکامی کے ہی مترادف ہے۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی ایک تحریر میں انہیں اسی سبب سے 'دیسی مخبر' کا نام دیا تھا۔ انہوں نے بعض دوسرے اہم مصنفین کا ذکر کرتے ہوئے بنگالی مارکسی نظریئے کے حامی اپیتا وگھوش کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ادھر کچھ برسوں سے نائپال نے صرف اسلام کے خلاف ہی آگ اگلی ہے اور اپنے ہندوتوانہ خیالات کی تشہیر کا جشن منانے کی غلطی پر تُل گئے ہیں۔ وی ایس نائپال جیسے فرقہ پرستوں کی تندخوئی کیا انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں شمار نہیں ہوتی۔ کس سے پوچھا جائے۔

انہیں دنوں میں نے اپنا نیا ناول، 'صحرا ہماری آنکھ میں' شروع کیا تو ہم دونوں ماں بیٹوں نے ہیروئن کا نام متفقہ طور پر شیبا رکھ دیا۔ ادھر اس کی ڈیوٹی بین الاقوامی اڑان کی طرف منتقل ہوگئی اور وہ اور بھی زیادہ مصروف ہوگئی۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کی اور بہ نفسِ نفیس اسے ڈھیروں دعائیں دینے کی تمنا پنپتی ہی رہی۔ مگر میرے بیٹے کے ہر جنم دن کی صبح، اس کی طرف سے آیا بہت سے گلابی پھولوں والا بڑا سا گلدستہ 'لابی' کی میز پر سجتا رہا۔ پھر کچھ وقت بعد اس کی زندگی میں ایک اچھا لڑکا آیا تو وہ اپنی دوست، اس کے چھوٹے بھائی اور میرے بیٹے کی منظوری کے بعد اُسے گھر والوں سے ملوانے پونا لے گئی۔ اب تین سال سے وہ اس کا منگیتر تھا اور ان دونوں کی حال ہی میں شادی بھی ہونے والی تھی۔ امتحان سے لوٹ کر اخبار دیکھنے کے بعد جب میرا بیٹا چہرے پر دو جہاں کی رنجیدگی لئے سامنے آیا تو میں نے دیکھا کہ سانولے سلونے چہرے اور چمکتی آنکھوں والی جس لڑکی نے سینے پر گولی کھائی تھی وہ شیبا تھامس تھی۔ میرے دل میں کسی نے نیزہ سا چبھو دیا۔

اس ملک کا 'لا اینڈ آرڈر' کب تک ایسے ادھ کھلے گلابوں کی زندگیوں کے تحفظ میں ناکام رہے گا۔ میرے بیٹے نے کچھ دیر پہلے انٹرنیٹ پر شیبا تھامس کا، سڑک پر گرا خاکی جسم دیکھا تھا جس کے قریب ایک اُجڑا اُجڑا سا نوجوان اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ایستادہ تھا۔ اس نے مجھے تصویر کے بارے میں بتایا تو میری آنکھیں پھر بھر آئیں اور 'فائل فوٹو' والا سلونا سا مکھڑا میرے ذہن میں مسکراتا رہا۔ ناول میں اپنی ہیروئن کا رول آگے بڑھاتے، آج سے پہلے میرے اندر عجب سی ممتا موج زن رہا کرتی تھی۔ اب اس کردار کی تکمیل مجھے ہمیشہ رلایا کرے گی۔ خون کے آنسو! (**غنچہ ہائے ناشگفتہ اور لاحاصل انتظامیہ** از **ترنم ریاض** سے اقتباس)

ترنم ریاض

کہیں کوئی نہیں

یہ کس نے بوئی ہیں چنگاریاں تیری زمینوں میں
یہ کس نے آگ سی سلگائی ہے معصوم سینوں میں
کوئی ویران موسم آبسا بارہ مہینوں میں
کہ جیسے ہوں نہ تاثیریں ہی اب جھکتی جبینوں میں
کسی نے باغباں بن کر جلایا مرغزاروں کو
کسی نے سائباں بن کر اجاڑا ہے بہاروں کو

خزاں نے دیکھ ڈالا گھر ترے سب لالہ زاروں کا
نشاط و چشمہ شاہی ، ڈل ،ولر کا شا لماروں کا
ترے جھرنوں ، پہاڑوں ، ندّیوں کا ،آبشاروں کا
سکوں کے ہر خزانے پر ہے پہرا شاہماروں کا
سبھی تیری زمیں پر چاہتے ہیں آسماں اپنا
جڑوں کو گھُن لگا کر ٹہنیوں پر آشیاں اپنا

تری ہر آبجو میں سمِّ قاتل کیوں ملایا ہے
ترے سب گلشنوں کو کس نے گورستاں بنایا ہے
یہ بلبل کے سریلے گیت کو کس نے ڈرایا ہے
دھنک رنگ آسماں پر یہ دھواں کیوں آن چھایا ہے
تری عظمت کے قائل شاہوں کی ہر یاد روتی ہے
ہزاروں سال کی تاریخ شرمندہ سی ہوتی ہے
خدائی نے کسی انصاف میں یوں دیر کی ہے کیوں
ترے صوفی بزرگوں نے خموشی سادھ لی ہے کیوں
خفا خورشید تجھ سے اور روٹھی چاندنی ہے کیوں
تری دشمن بنی آخر تری یہ سادگی ہے کیوں
تری چڑیوں کے نوحوں میں ترنّم کون لائے گا
ترے مجروح ہونٹوں پر تبسّم کون لائے گا
فرشتہ امن کا اجڑے گھروں کو کب بسائے گا
جواں جانوں کے غم کی جھرّیوں میں مسکرائے گا
کنواری بوڑھیوں کی مانگ میں موتی سجائے گا
کہیں کوئی نہیں ، کوئی نہیں ہے، کون آئے گا
مخالف ساعتوں میں تجھ کو ہم دم کون رکھے گا
مری وادی ترے زخموں پہ مرہم، کون رکھے

ترنم ریاض

درد بستی

جس کے چشموں کو کہا اقبال رحمۃ اللہ علیہ سیماب آب
جس کے رعبِ حسن کی نظریں نہ لا سکتی ہوں تاب
وادیٔ کشمیر کی سب وادیوں میں انتخاب
درد پورہ ہے اُسی لولاب کا افسردہ خو اب
اِس سے روٹھی شکل ہوگی کیا کہیں تقدیر کی
درد کی ، دلگیر کی ، زنجیر کی ، نخچیر کی
سرو اس کے سر جھکائے اشک باری سی کریں
طائروں کے غول چھپ کر آہ وزاری سی کریں
لُٹ چکا ہے جن کا سب ،وہ پردہ داری سی کریں
بے حس و خودسر انہی پر چاندماری سی کریں
اب یہاں پر گو کہ اکثر خانماں برباد ہیں
قتل گاہیں بھی بہت سی جابجا آباد ہیں
راہ گھر والوں کی دیکھیں باوَلی گھر والیاں
چوکھٹوں پر نوحہ خواں ہیں گیت کی متوالیاں
شالیاں کٹنے کی رُت میں گائیں کیوں کر بالیاں
غنچے مرجھائے بہت سے ، سوکھی ساری ڈالیاں
خوش طبع ،خوش شکل،خوش اطوار بانکے کیا ہوئے
پھول پھل کی وادیوں میں خار کیوں اگنے لگے

زیست اُن کی رہ گئی ہے بن کے اک پیہم عذاب
جن کو قدرت نے بنایا گوندھ کر میدہ گلاب
مہر تک شرمائے جن سے منہ چھپائے ماہتاب
پھر سیہ رُو کیسے آئے چھیننے اُن کا حجاب
حسن ہی اس سرزمیں کا اک بڑی تقصیر ہے
سادہ دل مخلوق اس کی قابلِ تعزیر ہے
دردبستی کی یہ بیوا قوم ، یہ گونگی پکار
اب نہیں پتھرائی آنکھیں دید کی امیدوار
کوئی پرسش ہی کرے کچھ ہو سبیلِ روزگار
رحمتوں میں اور کتنی دیر ہے پروردگار
آسمانوں تک صدا پہنچے گی کب بیداد کی
شہر تک جاتی نہیں آواز بھی فریاد کی
نصف بیواؤں کی بھی اک پود بستی ہے اِدھر
جن کو عرصے سے نہیں ہے نصف بہتر کی خبر
اِک دیا جلتا ہے جو ، خستہ کسی دہلیز پر
وہ نفی اثبات میں گم ،ہے کوئی زخمی نظر
ذہن کہتا ہے کہ لوٹ آتا وہ ، زندہ ہے اگر
دل تڑپتا ہے ،وہ زنداں میں ہے آجائے گا گھر
مرد سارے مر گئے تو گاؤں کو دیکھے گا کون
مفلس و محتاج سی بیواؤں کو دیکھے گا کون
لاپتہ بیٹے ہوئے، تو ماؤں کو دیکھے گا کون
دستِ ناز اور مہندی والے پاؤں کو دیکھے گا کون
بھولی آنکھیں ،پھول چہرے ، پیرہن یہ تار تار
کس ڈگر کو جاتی ہے ننھے یتیموں کی قطار

ترنم ریاض

موسم کی حسین رانی

بس یونہی برستی جا
موسم کی حسین رانی
دیکھا کروں پہروں میں
راہوں کو، مکانوں کو، اور چند دِوانوں کو
بے فکر سے مسکاتے جو بھیگتے جاتے ہیں
ہاں خوف بھی ہے دل کو ان پانی کی دھاروں کا
اس وقت جو لگتی ہیں رحمت کے فرشتوں سی
آجائیں اگر ضد پر، بن جائیں سمندر بھی
ہر شے کو بہادیں گی
طوفان اُٹھادیں گی

خوش رنگ اشجار

کیکر کے جواں پتے
پیپل کی مہک تیکھی
چھاتے سے کشادہ ہیں
سب برگ یہ املی کے
گولر کی یہ خوش شکلی
ٹیسو کے یہ اوندھے گل
شہتوت پہ بکھری ہیں زلفوں کی طرح بیلیں
ہے رنگ جدا کتنا ہر پیڑ کے سبزے کا
پھر بھی ہیں ہرے سارے
مسکان بھرے سارے۔

ترنم ریاض

محدّب شیشے

محدّب سے شیشوں کے پیچھے سے نظریں بچا کر
ترا چھت پہ جا کر، یہ سگرٹ جلانا
کبھی میز پر جھک کے خاموش لکھنا
میں سوؤں تو گھر میں دبے پاؤں چلنا
مجھے بیش قیمت سی شے کی طرح
موسموں سے بچانا
میں برآمدے میں جہاں بیٹھ کر شام کی سرمئی روشنی
دیکھتی ہوں
وہیں پاس آ کر کوئی بات کرنا
انہی دولتوں سے بھرا ہے یہ دامن برس ہا برس سے
مگر اپنے تازہ محدّب سے شیشوں سے
تم کو میں اب دیکھتی ہوں تو اک درد سا جاگتا ہے
نہ گر میں رہوں تو میری فرقتوں کو نبھاؤ گے کیسے
نہ تم گر رہو اور لینی ہوں سانسیں، بتاؤ گے، کیسے؟؟؟

ترنم ریاض

ساعت

کسی ساعت میں پھوٹی تھی جہاں کی کوکھ سے دنیا
ستارے آسماں پر چھا گئے تھے
مسکرا اُٹھا تھا سورج / بچھ گئی تھیں ندیاں
سر کوہساروں نے اُٹھائے تھے
زمیں سے کونپلیں پھوٹیں
ہری شاخوں پہ نغمے چھیڑنے آئے پرندے
وحی نازل ہوئی پیغمبروں پر
جبینیں جھک گئی تھیں
ہاتھ اُٹھے تھے دعاؤں میں
کسی ساعت!
کسی ساعت میں دیوانہ ہوا فریاد
مجنوں سے ملی لیلیٰ کی نظریں
تم نے جھانکا میرے گھونگھٹ میں!
کہ ساعت ہی ہے سب کچھ
کچھ نہ تھا ماضی
نہ مستقبل ہی کچھ ہوگا۔

ترنم ریاض

دعاؤں سے بھری آنکھیں

سُبک ہاتھوں میں تھامے تیری ننھی مُنی باہیں
میں رنگیں اوڑھنی میں مسکراتی
تیرے رخ سے لگائے اپنا چہرہ، ایسے خوش ہوں
کہ جیسے تجھ کو مجھ سے دور جانا ہی نہیں تھا
گزرتا وقت مجھ سے لے گیا میری عمر یا
تو تُو بھی چل دیا خوابوں کے پیچھے
میری یادوں میں رکھ کے اپنا بچپن
اچانک ہو گیا مجھ سے بڑا تو
میری کمزور بینائی تلاشے
تجھے کمروں میں، باغیچے میں، چھت پر
تیرے بن میرا ہر دن اک برس ہے
مجھے ہر سال لگتا ہے صدی سا
ترے مضبوط شانے تھام کر اب
نئی تصویر کھنچوانی ہے مجھ کو
کہ ان پھولی نسوں اور جھریوں میں
وہی ممتا بھری باہیں چھپی ہیں
جو تھیں تیری پسندیدہ پناہیں
دعاؤں سے بھری آنکھوں میں آنسو
چراغوں کی طرح روشن ہیں آ جا!

ترنم ریاض

ضروری بات

نیلی نیلی شام کی خاموشیوں کے بیچ
کیا سرگوشیاں سی کرتے ہیں شاخوں سے یہ پتے
جھکا ہے گل کلی کے رخ پہ ساری خوشبوئیں لے کر
بکھیرے زلف، سورج کی طرف چلدی ہے اک
بدلی
ہوا اٹھکیلیاں کرتی ہے رُک رُک کر درختوں سے
زمیں کو آسماں نے لے لیا اپنی پناہوں میں
تم آجاتے اگر گھر آج جلدی
مجھ کو بھی تم سے ضروری بات کرنا تھی۔

چیڑھ کی خوشبو

جھومتے لہراتے میری نوٹ بک پر آکے گرتے
چیڑھ کے ادھ سوکھے پتو!
جانتے ہو کیا
کہ تم میں بسنے والی خوشبوئیں دنیا میں ہیں یکتا۔

ترنم ریاض

قطاریں

میں اس مسکراہٹ پہ دوں جان اپنی
ذرا سا جو ہونٹوں کے خم ہونے سے
ناک کی نوک پر کچھ مچلتی سی ہے
پتلیوں میں چمکتی ہے قندیل سی
اور پھر اک حسیں قوس بن کے
اترتی ہے ملنے کو رخسار کے بائیں خم سے
ٹھہر جاتی ہے بس وہیں
ایک ننھے سے گڈے میں
جب پھر اچانک ہی
چھے دانتوں کی
منی سی دو قطاریں چمک اُٹھی ہیں۔

ترنم ریاض

وادی کی زمیں

قدم قدم پہ شکوک وشبہ بھری نظریں
جہاں کی سب سے حسیں خلق پر گڑھی سی ہیں
یہ سانس سانس پہ پہرے عجیب چہروں کے
غرور جن کی ہر اک بات سے ٹپکتا ہے
سیاہ ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہیں بندوقیں
انہیں ستم کے سوا کچھ بھی سوجھتا ہی نہیں
مری زبان کیا، کوئی زباں نہ یہ سمجھیں
یہ وہ اصول ہے جس کا کوئی اصول نہیں
کہ ختم ہونے کو آتا نہیں ہے صدیوں سے
ہر اک نظر میں بہت سے سوال بستے ہیں
ہر اک قدم پہ ہے زنداں کا آہنی دروا
میری زمین کی ہر تہہ میں لاکھ قبریں ہیں۔

ترنم ریاض

ثبات

درختوں میں ہوا جھوما کرے گی
پرندے گائیں گے باغوں کے رخ پر
یونہی رقصاں رواں پانی بہے گا
گرے گی ایسے ہی سبزے پہ شبنم
کھلے گی شام کو پربت میں سرخی
یونہی کھیلیں گے میدانوں میں لڑکے
ملیں گی چھپ کے ہیریں رانجھنوں سے
سنیں گے لوریاں ماؤں سے بچے
مری ہستی کی مُٹھی بھر یہ مٹی
کہیں ذروں میں ذرہ ہو رہے گی۔

ترنم ریاض

وہ اور دن تھے

میں نصف شب کو دریچے کے اُس طرف تکتی
اداس رات کو پل پل سسکتے سنتی ہوں
تیری غرور میں ڈوبی نظر، تنی گردن
شکار مجھ کو کرے کیوں عدم تحفظ کا
کہ پیچھے چھوٹ گئے ہیں اُمید وآس کے دن
نکل گئی ہے اب عمرِ رواں بہت آگے
وہ اور دن تھے کہ دل کے سکوں کو خدشہ تھا،
نہ چاہے جانے کا غم جان بھی لے سکتا ہے۔

آبائی گھر

ماتمی شام اتر آئی ہے پھر بام تلک
گھر کی تنہائی کو بہلائے کوئی کیسے بھلا
اپنے خوابوں کے تعاقب میں گئے اس کے مکیں
منتظر ہیں یہ نگاہیں کہ ہیں بجھتے سے دیے
راہ تکنے کے لئے کوئی بچے گا بھی کیوں
پھر یہ دیواریں بھی ڈھے جائیں گی۔

ترنم ریاض

منطق

مجھے خُدا نے کچھ اس طرح سے بنایا ہے
کہ صبح جاگتے گزرے دنوں کو یاد کروں
کسی پرندے کا بھیگا تھکا شکستہ پنکھ
ہرا بھرا سا شجر ہو زمین بوس کہیں
بکھر گیا ہو کوئی باغ آندھیوں کے سبب
اجاڑ دی ہو کہیں نفرتوں نے بستی
یا،
خوراک ضایع کیا کرتی ہو کہیں پہ خلق
کہیں پہ کھاتے ہوں مٹی کو گوندھ کر بچے
دبے ہوؤں کو دبا کر سفر سوئے مرّیخ
مری سمجھ میں یہ منطق کبھی نہیں آئی !!
ہوائیں صبح کی کھیلیں لباس سے میرے
گھٹائیں حسن بکھیریں مری فضاؤں میں
طیور آ کے سنائیں حسین گیت مجھے
کہ نقرئی سی ہنسی بھی ہنسیں کہیں بچے
ہر ایک شے میں بڑی سسکیاں ہیں پوشیدہ
مری اداس طبیعت بہل نہیں پاتی
مجھے خدا نے کچھ اس طرح ہی بنایا ہے۔

صبا اکبرآبادی

سب پوچھتے تھے اک نگہِ یار کی خاطر
کون کرے گا اب دلِ بیمار کی خاطر

سُورج ہی رہا سَر پہ تری راہگذر میں
ہر دُھوپ سہی سَایہ دیوار کی خاطر

تو سَامنے آیا ہے تو خوددار ہیں ہم بھی
نظریں نہ اُٹھائیں ترے دیدار کی خاطر

ہیں آشیاں برباد مگر رنج نہیں ہے
گھر پھنک گیا آرائشِ گلزار کی خاطر

اِس دَور میں ڈھونڈے سے صؔبا مل نہیں سکتے
سچ بولنے والے رسَن و دار کی خاطر

صبا اکبرآبادی

فِکر کی ضَو دماغ میں گم ہے
روشنی خود چراغ میں گم ہے

کل جو نِکلا تھا ،ڈھونڈنے تجھکو
آج اپنے سُراغ میں گم ہے

خار ہیں راستوں میں آوارہ
بُوئے گل صحنِ بَاغ میں گم ہے

اُس تجلّی سے کون ہے آگاہ
جو مِرے دل کے داغ میں گم ہے

لَب تک آئے تو کوئی بات بنے
کیفِ بَادہ ایاغ میں گم ہے

آج کل رنجِ تنگیٔ ماحول
کوشش انفراغ میں گم ہے

تیرگی کو کہاں تلاش کروں
ہر اندھیرا چراغ میں گم ہے

میں صبا جنگلوں میں پھرتا ہوں
دل تمنائے باغ میں گم ہے

وزیر آغا

قابو میں ہی جب وقت کا رہوار نہیں ہے
میں کیسے کہوں راستہ ہموار نہیں ہے

آواز تو آتی ہے مگر رُک نہیں پاتی
کیا شہر میں تیرے کوئی دیوار نہیں ہے

اصرار مجھے بھی کہ ہوا بن کے اُڑوں میں
اور پھول کی خوشبو کو بھی انکار نہیں ہے

شاید نہیں اب تم سے وہ مانوس وگرنہ
پالے ہوئے پنچھی کی یہ چہکار نہیں ہے

کیا تم سے کہیں ہم کہ زمانے کو ہوا کیا
بس یہ کہ وہ اب در پئے آزار نہیں ہے

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

دکھ زمانے کو ٹالتے رہنا
وقت یونہی نکالتے رہنا

اس طرف سے جو اب آئے نہ آئے
تم سخن کو سوالتے رہنا

ان کو پلوانا سانس امرت رس
شوق جذبوں کا پالتے رہنا

جگمگا رکھنا سب منڈیروں کو
گھر کا آنگن اُجالتے رہنا

وقت ریلے سے دب نہیں جانا
خود کو خود میں اچھالتے رہنا

زندگی کے حسین چہرے کو
نئے رنگوں میں ڈھالتے رہنا

زیست کانٹوں کا رستہ ہے اکبر
دل کا دامن سنبھالتے رہنا

ندا فاضلی (ممبئی)

تمام عمر مجھے جس کا انتظار رہا
وہ مجھ سے ملنے کو مجھ میں ہی بے قرار رہا

خدا سے جوڑا گیا اس کا بعد میں رشتہ
وہ جیتے جی تو زمیں کا گناہ گار رہا

بُرا ہوا کہ شناسائی ہو گئی خود سے
پھر اس کے بعد کسی پر نہ اعتبار رہا

ہنسا رہی تھیں مِری کامیابیاں مجھ کو
وہ کون تھا جو بنا روئے اشک بار رہا

بدلتے وقت نے گم کر دیں ساری پہچانیں
وہ اپنی شکل کے پتھر میں شاہکار رہا

ندا فاضلی

زمین پیروں تلے سر پہ آسماں کیوں ہے
جہاں جہاں جو رکھا ہے،وہاں وہاں کیوں ہے

یہاں تو برف گرا کرتی تھی پہاڑوں سے
تمہارے شہر کا موسم دھواں دھواں کیوں ہے

کہیں ملا جو خدا تو ضرور پوچھوں گا
کئی مکانوں کے ہوتے وہ بے مکاں کیوں ہے

تماشہ دیکھنے والے تو ہیں بہت لیکن
جسے زبان ملی ہے وہ بے زباں کیوں ہے

یزید گھوم رہا ہے یہیں کہیں شاید
نجف کی آب و ہوا پھر سے نوحہ خواں کیوں ہے

مظفر حنفی (دہلی)

وہ گلدستوں میں اشعار لگاتا ہے
اور یہاں لہجے پر دھار لگاتا ہے

غرقابوں نے دیکھا دریا کا انصاف
زندہ مردہ سب کو پار لگاتا ہے

کون زمانے کو سمجھائے چلنے دو
چلنے والے ہی کو آر لگاتا ہے

کہلاتے ہیں دنیا بھر میں ظلِ اللہ
جن پر چھاتا خدمت گار لگاتا ہے

خوشبو قید نہیں رہ سکتی گلشن میں
دیکھیں وہ کتنی دیوار لگاتا ہے

ماضی سے تا حال مظفرؔ ظالم ہی
تاج پہنتا ہے، دربار لگاتا ہے

مظفر حنفی

ہاں بادِ صبا سچ ہے پریشان رہے ہم
غنچوں کے بہر حال نگہبان رہے ہم

شبنم نے کیا پاک تو کانٹوں نے سیے چاک
ہر چند کہ مفلس کا گریبان رہے ہم

سر تا بہ قدم زخم ہے اب کیسے بتائیں
گلدان رہے ہم کہ نمکدان رہے ہم

واللہ کہ بچنے کے لیے سر نہ جھکایا
ناوک فگنی کے لیے آسان رہے ہم

بسمل تھے مگر رقص کیا، رنگ اڑائے
دنیا تری تفریح کا سامان رہے ہم

یہ کیا کہ جدھر دیکھیے خود ہی سے لڑے آنکھ
اس آئینہ خانے میں تو حیران رہے ہم

تھے خاک بسر کِرمکِ شب تاب مظفرؔ
ظلمت میں تری ذات کی پہچان رہے ہم

حامدی کاشمیری (سری نگر)

کیا ہویدا ہے اور خفا کیا ہے
راز کیا، راز آشنا کیا ہے

ماورائے فلک تلاش میں ہیں
دیکھ لیتے کہ زیر پا کیا ہے

جسم و جاں ایک ہو گئے کب کے
غیریت کیا ہے، فاصلہ کیا ہے

موت کی نیند گہری ہوتی ہے
کیسے طائر ہیں یہ نوا کیا ہے

چھوڑ آیا ہوں شہرِ خاموشاں
میرے اس جرم کی سزا کیا ہے

دلدلی دشت ہے جہاں تک ہے
بچ نکلنے کا راستا کیا ہے

حامدی کاشمیری

خلوتِ شب میں تداخل کیوں ہو
چاندنی وجہ تعامل کیوں ہو

تیرگی کھل کے امنڈ آئی ہے
پردے میں نورِ تجمل کیوں ہو

بلبلیں گاتی ہیں کس عجلت میں
پھول کھلنے میں تعطل کیوں ہو

شام سے پہلے ہی بجھ جاتا ہے
مہر سے میرا تقابل کیوں ہو

ڈوبتے چاند نے سرگوشی کی
اوج پر آکے تنزل کیوں ہو

جب یہی صورتِ حالت ٹھہری
تیغ برداری میں تامل کیوں ہو

تاجدار عادل (کراچی)

دل سے اُسکی نظر نے باتیں کیں
دھوپ میں اک شجر نے باتیں کیں

روبرو اس کے آج پہنچے تھے
آج عجزِ ہنر نے باتیں کیں

وہ اچانک ملا تو کیا کہتے
چشمِ گریہ اثر نے باتیں کیں

دل میں اس وقت ہُو کا عالم تھا
جب نظر سے نظر نے باتیں کیں

دل میں آئی جب اُس کی یاد کبھی
کیسی سنسان گھر نے باتیں کیں

اس کے رستے میں کب میں تنہا تھا
مجھ سے میرے سفر نے باتیں کیں

جب وہ آیا تو زندگی آئی
گھر کے دیوار و در نے باتیں کیں

جب میں کئی برس کے بعد گیا
مجھ سے بچپن کے گھر نے باتیں کیں

خوش سمجھتا رہا وہ جب بھی ملا
کیسی حُسنِ نظر نے باتیں کیں

ملنے آیا تھا وہ خموشی سے
کس قدر میرے ڈر نے باتیں کیں

روبرو اس کے ہم خموش رہے
اپنے شام و سحر نے باتیں کیں

خاک کا خاک ہی سے رابطہ ہے
کوزے سے کوزہ گر نے باتیں کیں

وہ بچھڑ کر چلا تو سمجھایا
روک کر رہگزر نے باتیں کیں

دل شکستوں کی کون سنتا بھلا
ہمتِ بال و پر نے باتیں کیں

ساری دنیا خموش سنتی رہی
اور عجب خیر و شر نے باتیں کیں

وہ جب آیا نہیں تو پھر عادلؔ
مجھ سے دیوار و در نے باتیں کیں

تاجدار عادل

کسی کے ذکر کا جب ہم ارادہ رکھتے ہیں
تو ہنسنے والے بھی آنسو زیادہ رکھتے ہیں
جو اپنے گلشنِ ہستی سے پھول چنتے رہے
لہو میں آگ کی گردش زیادہ رکھتے ہیں
ہمیشہ رہتے ہیں خوش پوش اس کی یادوں سے
ہم اہلِ عشق مہکتا لبادہ رکھتے ہیں
وہ جس نے خون کیا ہے ہر اک تمنا کا
اُسی کے سامنے احوال سادہ رکھتے ہیں
ہماری خاک کو نسبت ہے میر و غالب سے
ادب کا ہم بھی بڑا خانوادہ رکھتے ہیں
بسائے رہتے ہیں دل میں جو آرزو تیری
ہمیشہ یاد کوئی جھوٹا وعدہ رکھتے ہیں
ہمیشہ وقت نے خاکے میں سچے رنگ بھرے
ہمیشہ ہم کوئی تصویر سادہ رکھتے ہیں
ستارہ وار سجاتے ہیں اشک آنکھوں میں
ہُنر پہ خاک نشیں کچھ زیادہ رکھتے ہیں
جو چاہے آئے محبت کے پھول لے جائے
ہم اہلِ خیر بہت دل کشادہ رکھتے ہیں
بساطِ وقت کے شاطر عجیب شاطر ہیں
ہمیشہ شاہ کے آگے پیادہ رکھتے ہیں
وہ انقلاب جو اٹھتے ہیں ان نگاہوں سے
ہمارے دل سے تعلق زیادہ رکھتے ہیں
وفا کی راہ میں دھوکا ہوا جو پھر عادلؔ
تو واپسی کا مسافر ارادہ رکھتے ہیں

ناصر علی سید (پشاور)

دل آنکھیں اور پتھر سائیں
اب ہیں ایک برابر سائیں

باہر پھول بہت ہیں لیکن
ویرانہ ہے اندر سائیں

ایک اک کر کے کٹ گئے سارے
میرے سرو صنوبر سائیں

ابرِ کرم کا کوئی چھینٹا
جھلسے ہیں سب منظر سائیں

دھوپ آندھی بارش کی زد میں
شہر میں اک میرا گھر سائیں

ہیرے موتی لوگ سمیٹیں
میرے حصے کنکر سائیں

میرے اندر شور مچائے
چپ کا ایک سمندر سائیں

یار نہیں تو واپس لے لے
جو ہے آج میسر سائیں

کاوش عباسی (سعودی عرب)

دور جانا ہے سفر بھی نہیں کرتا آغاز
دل کو روکے ہوئے ہے پھانس سی کوئی آواز

سامنے حُسن کے یوں رنگ سا اُڑ جاتا ہوں
جیسے میرے لیے تو ہے نہیں وہ رُخِ ناز

اگر آزاد نہیں ہے تو محبت کیا ہے
جبر سے رشتہ بنایا ہو تو کیا اس کا جواز

مٹی کے کچے کڈھب پتلے ،مرے دیس کے لوگ
ایسے ہی جیتے ہیں یہ،دل میں نہ کچھ سوز نہ ساز

جنگ باہر تھی، نہ باہر تو کبھی نکلے ہم
ہم میں جو کچھ تھا،رہا بند کا بند،راز کا راز

یوں اندھیرا نہ بُنو،ایسا بھی ہو سکتا ہے
وہ سَحر رُو کوئی دن کردے وہ دروازہ باز

ڈر نہیں لطف سے دیکھو اسے کاوشؔ یہی وقت
اب جو شب کاڑھتا ہے تھا بھی کبھی صبح طراز

کاوش عباسی

اُنہیں بھی ہم پیار آئے نہ آئے
محبت کو قرار آئے نہ آئے

تری لالی سے دل گل رُو ہے میرا
سو باہر اب بہار آئے نہ آئے

بہت وحشی ہے جی ،اے یار دل کو
خیالِ انتظار آئے نہ آئے

تخیل نے سجائی کہکشاں تو
میرا روشن سوار آئے نہ آئے

زیاد اُس سے ہیں ہم اپنے ہی عاشق
ہمیں خود اعتبار آئے نہ آئے

تھے خواب اور چاند کے جس میں بدن سب
وہ پھر دل کا دیار آئے نہ آئے

پرانے لطف ابھی جیتے ہیں کاوشؔ
نیا پیغامِ یار آئے نہ آئے

احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)

انا کا زعم،وفا کا گھمنڈ ٹوٹے گا
جو تجھ پہ ہے یہ بلا کا گھمنڈ ٹوٹے گا

قدم قدم پہ جلیں گے چراغ رستے میں
تری گلی میں ہَوا کا گھمنڈ ٹوٹے گا

سوال کر کے مرے پاس کچھ رہے نہ رہے
ترا یہ جود و سخا کا گھمنڈ ٹوٹے گا

میں ایک دن اسے بھر دوں گا اپنی وحشت سے
اَزل سے خالی خلا کا گھمنڈ ٹوٹے گا

دوبارہ ملنے کی تقریب جاودانی ہے
سنا نہیں کہ فنا کا گھمنڈ ٹوٹے گا

احمد حسین مجاہد

چاہے جانے کی ہَوس دِل سے نکل پائی نہیں
میں ابھی شائستۂ آدابِ تنہائی نہیں

کن ستاروں کے دکھائے ہیں ہَوا نے سبز باغ
گردِ پا کو مسندِ سَر بھی پسند آئی نہیں

کھڑکیوں میں کیا بھنور پڑتے ہیں میرے نام پر
کون کافر ہے مری جس سے شناسائی نہیں

عمر بھر خود کو کیا کارِ محبت میں خراب
میں محبت سے ، محبت مجھ سے اُکتائی نہیں

اشکِ خوں کی سیرِ مژگاں سے ہے احمد آبرو
ورنہ میرا عشق تَو محتاجِ رُسوائی نہیں

صادق باجوہ (میری لینڈ، امریکہ)

بجھا چراغ تھا پھر سے جلا گیا اک شخص
کسی کی یاد کا جادو جگا گیا اک شخص

بساطِ زیست پہ ہر رنگ اپنا بکھرا کر
دکھوں کی دھوپ کا عادی بنا گیا اک شخص

جہاں سے نفرتیں یکسر اگر مٹا ڈالیں
رہے گا امن و سکوں، یہ بتا گیا اک شخص

رہِ طلب میں نظر بھی ہوئی ہے پتھرائی
بجھی سی تشنگی پھر سے بڑھا گیا اک شخص

طلسمِ ہوش رُبا یا دِکھے کوئی سپنا
مجھے عجوبۂ حیرت بنا گیا اک شخص

مرے وجود کی رگ رگ میں کچھ سماسا گیا
لگے ہے مجھ کو بھی اپنا بنا گیا اک شخص

یہ حسرتوں کا بسیرا دلِ حزیں کب تک
نویدِ مخلصیِٔ غم سنا گیا اک شخص

میں اس کی یاد کو صادقؔ بھلا سکوں کیونکر
تھا خود شناس، شناسا بنا گیا اک شخص

صادق باجوہ

یادوں کی تلخیاں نہ کبھی بھول پائے ہیں
مانا کہ تیر ہائے ستم ہم نے کھائے ہیں

میزانِ وقت کا ہی عروج و زوال ہے
اوجِ کمال ہے کبھی نکبت کے سائے ہیں

ذہن رَسا میں حُرمتِ انساں ہے بَس گئی
کچھ پاسِ دوستاں ہے، نہ دشمن پرائے ہیں

ظلم و ستم، مصائبِ دوراں کے باوجود
ہم نے تو دوستی کے تقاضے نبھائے ہیں

آباد بستیاں بھی اُجڑتی دِکھائی دیں
ہر سُو مہیب ظُلمت و وحشت کے سائے ہیں

کیا مُنصفی بھی نذرِ مفادات ہو گئی
پھر بے گناہ مُوردِ اِلزام آئے ہیں

ہم کھو چکے تھے مدّتوں سے اپنے آپ کو
جانے کہاں سے آپ ہمیں ڈھونڈ لائے ہیں

صادقؔ حیات و مرگ ہیں سانسوں کے مرحلے
رُکنے پہ موت، زندگی ورنہ یہ لائے ہیں

حمیدہ معین رضوی (لندن)

اک زندگی میں پائی ہیں کتنی جراحتیں
ہے کون جو لکھے گا یہ ساری جراحتیں

یوں بھی ہوا کہ ایک ہی منزل کے راہرو
تھے ساتھ اور کاٹی ہیں تنہا مسافتیں

دامن تھے داغدار لہوں رنگ ہاتھ تھے
ایسے تھے پارسا وہ جو لائے شہادتیں

دشمن کی صف میں وہ بھی تھے خنجر لیے ہوئے
کیسے تھے ان کے ظرف،تھیں کیسی نجابتیں

آزار جب شعار ہو الفت کے نام پہ
پھر کس کو اب کہیں گے وفا کی صداقتیں

طعنے ہوں، بدگمانی ہو اور بد ظنی شعار
نفرت کہیں گے کس کو جو ہوں یہ رفاقتیں

عادل رشید (دہلی)

محاورہ غزل

جس کسی دن تم اصولوں کے کٹرے ہو جاؤ گے
بس اسی دن اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ گے
سچ کو سمجھانے کی خاطر، یہ دلیلیں یہ جنون
دیکھ لینا ایک دن تم چڑ چڑے ہو جاؤ گے
میں محاذ زندگی پر سرخ رو ہو جاؤں گا
تم اگر میرے برابر میں کھڑے ہو جاؤ گے
کوئی غیرت مند محسن خود بہ خود مر جائے گا
سامنے اس کے جو تم تن کر کھڑے ہو جاؤ گے
وہ جہاں دیدہ تھا اس نے علم یوں آدھا دیا
جانتا تھا تم برابر سے کھڑے ہو جاؤ گے
سب یہاں اہل نظر ہیں، کیا غلط ہے کیا صحیح
خود کو میں چھوٹا کہوں تو تم بڑے ہو جاؤ گے؟
مسند انصاف پرکیا دوستی کیا دشمنی
تم خفا مجھ سے اگر ہوگے ''پڑے'' ہو جاؤ گے
بات میری گانٹھ میں تم باندھ لو اس دور میں
کام تب ہوگا کہ جب سر پر کھڑے ہو جاؤ گے
پیٹھ پیچھے اس کی غیبت کر رہے ہو تم میاں
آیا! تو تعظیم میں تم سب کھڑے ہو جاؤ گے
ظلم سہنے کی اگر عادت نہیں چھوڑی تو پھر
رفتہ رفتہ ذہن سے تم ہیجڑے ہو جاؤ گے
اہل تاہر کے لیے بچے ہی ہو عادل رشید
تم زمانے کے لیے بے شک بڑے ہو جاؤ گے

راجہ محمد یوسف خان (جرمنی)

شب ہوئی ہلکا سا اک کھٹکا ہوا
پھر درِ دل اُن کی خاطر وا ہوا

پہلے عقل و فہم کی باتیں ہوئیں
پھر مقدم فیصلہ دل کا ہوا

اک خدائی ہم سے ملنے آ گئی
کو بکو جب پیار کا چرچا ہوا

کیا بتائیں لذّتِ کیفِ وصال
خواب پر تعبیر کا دھوکا ہوا

مرحبا یہ آپ کا حُسنِ بیاں
سلسلہ در سلسلہ پھیلا ہوا

ساکنانِ شہرِ دل بے تاب ہیں
کوئی نشہ چڑھ کے ہے اترا ہوا

باندھ کر رکھا تھا جس نے عمر بھر
وہ تکلّف زندگی کا کیا ہوا

دیکھ کر مجھ کو فرشتوں نے کہا
آ گیا ہے رات بھر جاگا ہوا

دل میں یوسفؔ ہے عجب اک اضطراب
ایک شعلہ ہے کہیں بھڑکا ہوا

راجہ محمد یوسف خان

حیرت زدہ ہوں گردشِ حالات دیکھ کر
مسند پہ ایک رندِ خرابات دیکھ کر

منظر پہ جس کو شوق سے لائے تھے پھر عوام
اب دم بخود ہیں اُس کے کمالات دیکھ کر

لُطف و نشاطِ شہرِ نگاراں تھا جن کا خواب
گِریہ کُناں ہیں وادیٔ ظُلمات دیکھ کر

ہاتھوں میں لے کے نامۂ اعمال آج قوم
شرمندہ ہو رہی ہے مکافات دیکھ کر

میں ہوں کہ ایک گوشے میں سرشار و با مراد
اِک دِلربا کا حُسنِ کرامات دیکھ کر

بیٹھی ہے منتظر کہیں دُلھن خیال کی
آیا ہے یاد چاند کی بارات دیکھ کر

لگتا ہے آج قُرب کے امکان ہیں بہت
کیفِ امیدِ وصل اور یہ رات دیکھ کر

جا ہجر میں وصال کے موسم تلاش کر
اُس نے کہا تھا صورتِ حالات دیکھ کر

صحراؤں میں گذاری ہے یوسفؔ تمام عمر
گبھرا نہ جائیں خُلد کے باغات دیکھ کر

حفیظ انجم (کریم نگر)

لبوں کی آنچ تو رخسار کا شرارہ رکھ
نئی غزل میں نیا کوئی استعارہ رکھ

خسارہ اپنا ذرا لا کے رکھ مِرے آگے
پھر اس کا نام بھی اردو کا ادارہ رکھ

اُجالے اور بھیانک سے کالی راتوں سے
اندھیری رات کا تو نام ماہ پارہ رکھ

مِرے خلاف تجھے کون ورغلاتا ہے
کسی کا نام زباں پر نہ لا، اشارہ رکھ

ہے دیکھنے کا مجھے اشتیاق آنکھوں سے
تو اپنی آنکھوں میں محفوظ ہر نظارہ رکھ

بہت دنوں سے ترا انتظار ہے مجھ کو
مِری ہتھیلی میں لا کر مِرا ستارہ رکھ

''جدید ادب'' میں چھپی ہے مِری غزل اب کے
سفر میں ساتھ مِرے تو وہی شمارہ رکھ

اک ایک لمحہ کا انجمؔ حساب دینا ہے
تو اپنی زیست کا تیار گوشوارہ رکھ

حفیظ انجم

ذرا دیر میں اب جواں رات ہو گی
غمِ زندگی سے ملاقات ہو گی

ابھی چرخ پر دیکھو اُبھرے گا سورج
یہیں سے اندھیروں کو پھر مات ہو گی

جو خوشبو لگا کر عفونت دبا دیں
بھلا ایسے ذہنوں سے کیا بات ہو گی

نہ انکش لگایا بری عادتوں پر
تری زیست نذرِ خرابات ہو گی

وہاں جھاڑیوں میں ہے خرگوش سویا
بھلا کیسے کچھوے کو اب مات ہو گی

تو تحقیق کرنا اگر چھوڑ دے گا
تری زیست وقفِ رسومات ہو گی

تری کوٹھی بلڈنگ پہ رم جھم اگر ہے
مِری جھونپڑی پر بھی برسات ہو گی

میں محنت کا اپنی صلہ مانگتا ہوں
وہ خالی اگر دیں تو خیرات ہو گی

میں دنیا سے رُخصت اگر ہو بھی جاؤں
مِری نیکی انجم مِرے ساتھ ہو گی

طارِق حبیب (سرگودھا)

پاس تھا اور پاس بھی کب تھا
وہ مرا غم شناس بھی کب تھا

وہ ستارہ تھا میری آنکھوں کا
راس تھا اور راس بھی کب تھا

میرے لٹنے پہ خوش نہ تھا لیکن
میری خاطر اُداس بھی کب تھا

تھا اثاثہ دل و نظر کا مگر
سر خوشی کی اساس بھی کب تھا

اُس مرے خوش کلام کو طارِق
اپنی باتوں کا پاس بھی کب تھا

طارِق حبیب

ٹوٹ جاتا ہے یہ پندار اچانک اِک دن
چھوڑ جاتے ہیں سبھی یار اچانک اِک دن

بدظنی ساری رعایا کا مقدر ٹھہری
کھل گیا شاہ کا کردار اچانک اِک دن

رُک گئے سانس کے بہتے ہوئے دھارے یک دم
تھم گئی وقت کی رفتار اچانک اِک دن

منکشف ہوگی بہت جلد حقیقت طارق
لگنے والا ہے وہ دربار اچانک اِک دن

عمران اعظم رضا (گوجرانوالہ)

روح پہ کوئی قیامت سی گزر جائے گی
تیرے ہونٹوں پہ مری بات ٹھہر جائے گی

کیا خبر تھی کہ خیالوں میں بسی کوئی پری
وقت کی دھند کے اُس پار اتر جائے گی

چاہے دنیا کے جھمیلوں میں کٹے وقت مرا
نام تیرے ہی مری جان مگر جائے گی

کیا پتہ تھا کہ جدائی میں بلا یادوں کی
میری راتوں کا بدن نوچ کے دھر جائے گی

یاد آئے گا بہت کچھ جو تجھے دیکھوں گا
میرے زخموں کی یہ سُرخی بھی نکھر جائے گی

آؤ اک دوجے کی خاموش نگاہوں کو پڑھیں
بات خوشبو ہے یونہی اور بکھر جائے گی

گھر کے نفرت کے بھنور میں یہ بتاؤں کیسے؟
کون سی راہ رضاؔ پیار نگر جائے گی

عمران اعظم رضا

شیشہ در شیشہ نگاہیں سُرخ رُو تو کیجئے
آئنوں کے فرش پر میرا لہو تو کیجئے

بے سبب ملتیں نہیں سرداریاں اس دور میں
چاہے جھوٹی ہی سہی کچھ ہاؤ ہُو تو کیجئے

آ گئے ہیں جوش میں پڑھنے نمازِ عشق بھی
آبِ غم سے جائیے پہلے وضو تو کیجئے

گر سیاست میں ہے جانا آپ کو تو ٹھہریئے
بے ضمیری کو ذرا طوقِ گلو تو کیجئے

پھول اُگلے گی وفا کے دل کی یہ بنجر زمیں
آنکھ میں پیدا ذرا ذوقِ نمو تو کیجئے

دورِ غم ٹل جائے شاید مے کدے سے شیخ جی
مے کدے میں آیئے اور اللہ ہو تو کیجئے

ظلمتوں میں پھینک دیں شاید وہی حرفِ ضیا
روشنی کے پیکروں سے گفتگو تو کیجئے

آزمانا ہو اگر خود کو رضاؔ جو آپ نے
زندگی کو حادثوں کے رُو برو تو کیجئے

ڈاکٹر فریاد آزر (دہلی)

دل نے اچھائی ، برائی کو بس اتنا سمجھا
یعنی گر خود کو برا سمجھا تو اچھا سمجھا

ہم سمجھنے لگے مجرم ہے ہمیں میں کوئی
حادثہ ایسا رچایا گیا سوچا سمجھا

اب سمندر پہ وہ چلتا ہے تو حیرت کیسی
عمر بھر اس نے سرابوں کو ہی دریا سمجھا

اب تو وہ آگ کے دریا سے بھی آگے ہے بہت
تو نے انساں کو فقط خاک کا پتلا سمجھا

مجھ کو سیلاب نے سمجھایا، زمیں پیاسی ہے
زلزلہ آیا تو میں نے ترا غصّہ سمجھا

قصّہِ درد سنا شوق سے لوگوں نے مرا
یہ الگ بات ہے سب نے اسے قصہ سمجھا

مات دی میں نے جو شیطاں کو بھی عیاری میں
پھر مجھے سارے زمانے نے فرشتہ سمجھا

عمر بھر خامہء تنقید نے مانا مردہ
بعد از مرگ مجھے اس نے بھی زندہ سمجھا

جب مرے خواب حقیقت میں نہ بدلے آزؔر
میں نے دنیا کی حقیقت کو بھی سپنا سمجھا

ڈاکٹر فریاد آزر

فسانہ جو مری توقیر کا بتاتا ہے
کمال اِسے مری شمشیر کا بتاتا ہے

مرے حقوق کو پامال کرنے والا بھی
قصور سب مری تقدیر کا بتاتا ہے

جہاں قیامتِ صغریٰ گزرتی ہے ہم پر
زمانہ عدل جہانگیر کا بتاتا ہے

ہے جس کا نام زمانہ میں عشق ، یہ دل بھی
مرید خود کو اسی پیر کا بتاتا ہے

دلِ عزیز پہ قبضہ ہے کچھ تو اُس کا بھی
سو اِس کو مسئلہ کشمیر کا بتاتا ہے

ہر ایک ملک میں تخریب کاریاں جس کی
وہ سلسلہ انھیں تعمیر کا بتاتا ہے

میں جب بھی درد کو لفظوں کا روپ دیتا ہوں
زمانہ شعر اسے میرؔ کا بتاتا ہے

تخیلات کا شاعر نہیں فقط آزؔر
وہ خواب بھی نئی تعبیر کا بتاتا ہے

حبیب ہاشمی (کولکاتا)

آج پھر پلکوں پہ کیوں جشن نمو کا نکلا
دل میں جو خار چھپا تھا سو کبھو کا نکلا

خاک میں کیسے ملا کر اسے رسوا کرتا
میری آنکھوں میں جو دریا تھا وضو کا نکلا

جس سے امید تھی وہ میری طرف بولے گا
وہ بھی نکلا تو طرفدار عدو کا نکلا

میں نے سوچا کہ نگاہوں سے گرا دوں اسکو
کیا کروں رشتہ مرا اس سے لہو کا نکلا

کس کے آنسو ترے عارض پہ گرے آخرِ شب
کس لئے زعم ترے جام و سبو کا نکلا

زندگی بھر تمہیں چاہا تمہیں آنکھوں میں رکھا
تم ہی کہدو کہ زباں سے مری کب تو نکلا

اس قدر درد ٹپکتے تھے ترے لفظوں سے
کہ ترے شعر پہ الزام غلو کا نکلا

آخرش راہ میں وہ آبلہ پا بیٹھ گیا
دل کا ارمان حبیب آج سبھو کا نکلا

حبیب ہاشمی

یہ قہقہے یہ زر و تاب بھول جائیں گے
ہم اپنی سانسوں کے اعراب بھول جائیں گے

ترے دیار سے لوٹے ہیں سوچ کر اتنا
کہ اپنی آنکھوں کے سب خواب بھول جائیں گے

مری وفا کی عبادت سے جو مزین ہے
فقیہ وقت وہی بات بھول جائیں گے

مرا کمال مجھے جب عروج بخشے گا
مرے خلوص کو احباب بھول جائیں گے

کسے خبر تھی کہ دانشورانِ خود آرا
بشر سے رشتہ آداب بھول جائیں گے

اگر نقاب ترے عارض حیا سے ہٹے
تو لوگ جلوہ مہتاب بھول جائیں گے

حبیبؔ دیکھنا اک روز بے ہنر شاعر
ضرور لہجہ شاداب بھول جائیں گے

افضل چوہان (مظفر گڑھ)

آج پھر یادوں نے آگھیرا مجھے
پھر خیال ہی آگیا تیرا مجھے

بھر دیئے موسم نے گل میں رنگ کیا
ہر طرف اس کا لگے چہرا مجھے

جب درو دیوار چپ چپ سے لگیں
کانٹے لگتا ہے گھر میرا مجھے

میں ہو ا تھا عشق میں خو د ہی اسیر
دل نے تو روکا تھا بہتیرا مجھے

پہلے روگی اور پھر جوگی بنا
کتنا مہنگا پڑ گیا پھیرا مجھے

افضل چوہان

آنسوؤں کا حساب لکھتے ہیں
اپنا چہرا کتاب لکھتے ہیں

اک سحر بن کے یاد اتری ہے
زخم کو آفتاب لکھتے ہیں

خواب سوہنی کی طرح ڈوبے ہیں
ہم نظر کو چناب لکھتے ہیں

ہم تمہیں بے حساب پڑھتے ہیں
اور پھر بے حساب لکھتے ہیں

آؤ اب حرف حرف سانسوں کو
زندگی کا نصاب لکھتے ہیں

خود کو لکھتے ہیں پیاس کا صحرا
اور تجھ کو سحاب لکھتے ہیں

یاد آتی ہے گھر کے آنکھوں میں
ساونوں کا شباب لکھتے ہیں

ہم تو وہ ہیں عدو کو بھی افضلؔ
خط میں عزت مآب لکھتے ہیں

عادل حیات (دہلی)

زباں پہ لفظ جو آئے اسے کہا جائے
جواب اس کے سوالوں کا بھی دیا جائے

ترے خیالوں سے ہوکر تو میں گزرتا ہوں
کہ دل میں تیرے بھی پیکر مرا سا جائے

سنا ہے لہجے میں اس کے بہت صداقت ہے
چلو ملنگ کی باتوں کو بھی سنا جائے

بہت دنوں سے کوئی چھپ کے مجھ میں بیٹھا ہے
کبھی تو آنکھوں کو اپنی جھلک دکھا جائے

مری نگاہوں میں کتنی دشائیں روشن ہیں
مگر یہ کون بتائے کدھر چلا جائے

میں انتظار میں کس کے یہاں پہ بیٹھا ہوں
مری نگاہ میں سورج مرا ڈھلا جائے

ترے بھی لفظوں میں تاثیر اتنی ہو عادل
زباں سے نکلے تو پھر عرش تک صدا جائے

حسام حر (پشاور)

ہمارے عشق میں سودا نہ شوریدہ سری تھی
بس اک دیوانگی بے بال و پر حیرت بھری تھی

ترے پہلو سے ہم خود ہی سرکتے جا رہے تھے
کہ تیری دل نوازی تو فقط سوداگری تھی

نگار شب روایت کے شکنجے میں تھی الجھی
کوئی سایہ نہ تھا قابض نہ سر پر ہی پری تھی

دریچوں سے لگے بیٹھے رہے دن رات لیکن
تماشا دیکھنے والی نظر ہی سرسری تھی

ملاقاتیں نتیجہ خیز کیا ہوتیں کہ ہر پل
کہانی تو وہی من دیگرم تو دیگری تھی

تمہارا قرب تھا جاناں انا کا اک بہانہ
محبت کا سلیقہ آرزوئے ہمسری تھی

لفافے پر لکھی تحریر تھی شاید اسی کی
مگر اب کے شکستہ خط کی رنگت کیسری تھی

افضل صفی (ملتان)

جب بڑھا قد سے مرا سایہ مجھے ڈسنے لگا
عرصہ ء ماضی کا ہر لمحہ مجھے ڈسنے لگا

دھوپ دیواروں سے اتری جب تھکن کو اوڑھ کر
ذات کا پھیلا ہوا صحرا مجھے ڈسنے لگا

سلسلہ در سلسلہ پھیلی ہیں یوں تنہائیاں
اب خیال یار جو آیا مجھے ڈسنے لگا

منفعت کی داستاں کے ہم سبھی کردار ہیں
عصر بے چہرہ کا یہ چہرہ مجھے ڈسنے لگا

عدل کی زنجیر کو پگھلا دیا کس نے صفی
پھر مزاج دہر کا لہجہ مجھے ڈسنے لگا

افضل صفی

جہانگیری نہیں جاتی جہاں بانی نہیں جاتی
حمیت ہو اگر زندہ تو سلطانی نہیں جاتی

درون ذات سے جو آگہی کے راز پاتا ہے
زبان خلق سے اس کی ثناخوانی نہیں جاتی

ہوئے ہیں آئنے دھندلے کریں شکوہ تو کس منہ سے
کہ ہم سے اپنی صورت بھی تو پہچانی نہیں جاتی

مسخر خود کو کرنے سے ملا راز جہاں داری
نگاہ عشق کامل ہو تو سلطانی نہیں جاتی

چلی جاتی ہیں پل بھر میں وصال یار کی صدیاں
نہیں جاتی شب ہجراں کی طولانی نہیں جاتی

یہ کیسے کہہ دیا تُو نے صفی کچھ لکھ نہیں سکتا
شعور شعر پختہ ہو، سخن دانی نہیں جاتی

فہیم انور (کولکاتا)

جاگی ہمارے ذہن کے جالوں میں روشنی
یادوں سے تیری آئی خیالوں میں روشنی
مردہ دلوں میں ڈھونڈھ رہے ہو شعاعِ زیست
تم کو ملے گی صرف جیالوں میں روشنی
انوارِ سیم تن کی حقیقت نہیں کوئی ؟
جیسے کہ آپ ہی ہوں اجالوں میں روشنی
روشن سے اک جواب کی امید ہے اگر
پہلے رکھو تم اپنے سوالوں میں روشنی
تاریکیاں دلوں میں ہیں چہرے سفید ہیں
کیوں ڈھونڈتے ہو زہرہ جمالوں میں روشنی
اہلِ قلم میں ہوگا تمہارا بھی تذکرہ
ہوگی اگر تمہاری مثالوں میں روشنی
مجھ میں تو اک کرن بھی کسی نور کی نہیں
ہے صرف میرے چاہنے والوں میں روشنی
روشن نواحِ جاں ہے مرا اسکے نور سے
کیسے نہ ہوگی چاند کے ہالوں میں روشنی
دنیا میں نور کے جو پیمبر بنے ہو تم
رکھو فہیم اپنے خیالوں میں روشنی

فہیم انور

کون سا لفظ آفتاب نہیں
اسکے جیسی کوئی کتاب نہیں

ایک پرخار رہ گزر ہے یہ
زندگی بسترِ گلاب نہیں

آپ مشہور ہو نہیں سکتے
آپ کی عادتیں خراب نہیں

ایک مجموعہ ہے یہ لفظوں کا
یہ مری بات کا جواب نہیں

ہو ستائش بھی اک سلیقے سے
انکی تعریف بے حساب نہیں

دھوپ ہے تیز اور سفر جاری
میرے سر پر کوئی سحاب نہیں

قولِ حکمت کہوں اسے کیسے
اس میں خوشبوئے بو تراب نہیں

مان لوں تجھ کو میں فہیم انور
تیرے حصے میں تو خطاب نہیں

جاوید اختر (راولپنڈی)

میں نے سکوتِ شب کو ایک سلسلہء سخن دیا
خواہشِ بے لباس کو ضبط کا پیرہن دیا

چوبکِ سوختہ رہی نوبتِ بے صدا کے پاس
جل کے کرشمہ ساز نے مجھ کو گدازِ فن دیا

یہ جو برہنہ لاش ہے مرگِ اَنائے عصر ہے
کس نے عزیزِ شہر کو تحفہء بے کفن دیا

زندہ ہیں پھول جابجا داغِ عدم لئے ہوئے
اُس نے فریبِ رنگ و بو مجھ کو چمن چمن دیا

نیل سے لے کر تا بہ گنگ وحشتِ طرّہء ملوک
ہجرتِ بے معاش نے ولولہء وطن دیا

اُس کے شکست کا سبب اُس میں خدا نے یوں رکھا
سنگ سا اُس کو دل دیا آئنہ سا بدن دیا

ناصر نظامی (ہالینڈ)

کرے گا جو ہر کسی سے یاری
رہے گا تنہا زندگی ساری

موتی سمجھ کے کرتے رہے ہم
جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری

آتش دانوں کے پہلو میں
اُگتی نہیں پھولوں کی کیاری

اُن کے شہر کے پانی کا ہے
رنگ سنہرا، ذائقہ کھاری

شہر کی بھیڑ کا حال نہ پوچھو
ہر سو مچی ہے ہا ہا کار

آوازوں کے شور میں دب گئی
مرتے مسافر کی سسکاری

اپنی انا کے بت کو توڑو
ہے رستے کا پتھر بھاری

حیدر قریشی

آپ کو بھی درپئے آزار ہونا تھا، ہوئے
اور ہم نے زیرِ بارِ یار ہونا تھا، ہوئے

تہمتوں کے اور بہتانوں کے اعزازات کو
جب ہمارے ہی گلے کا ہار ہونا تھا، ہوئے

لاکھ صحرا اور سمندر بچھ گئے تھے راہ میں
اِن فقیروں نے جہاں سے پار ہونا تھا، ہوئے

خواب کی دنیا میں کتنی دیر تک رہتے بھلا
اک نہ اک دن تو ہمیں بیدار ہونا تھا، ہوئے

عشق میں تکریم بھی اپنا مقدر تھی، ہوئی
اور پھر رُسوا سرِ بازار ہونا تھا، ہوئے

یہ بھی آنا تھا مقام آخر تمہاری چاہ میں
ہم نے اپنے آپ سے بے زار ہونا تھا، ہوئے

ذہن و دل کی جنگ میں خاموش رہتے کس طرح
خود سے حیدؔر برسرِ پیکار ہونا تھا، ہوئے

حیدر قریشی

آگ اپنے خون سے آخر بجھانی پڑ گئی
کس قدر مہنگی اسے شعلہ بیانی پڑ گئی

صبر کو میرے جو میری بے بسی سمجھے رہا
دیکھ کیسے اُس پہ میری بے زبانی پڑ گئی

ایک مدت سے الگ ہیں جب ہمارے راستے
پھر مِرے قصے میں کیوں تیری کہانی پڑ گئی

تجھ تلک پہنچا ہوں خاصی دیر سے عمرِ کہن
پہلے آنا تھا مگر رہ میں جوانی پڑ گئی

اعتبار اک دوسرے پر کب ہمیں تھا زندگی
جھوٹی مُوٹی دوستی تھی اور نبھانی پڑ گئی

مُشک جیسی کوئی بھی شے کب چھپانے سے چھپی
آپ کو پھر کس لئے صاحب چھپانی پڑ گئی

خوب واقف تھے کسی کے پیار سے حیدؔر مگر
آزمائی چیز پھر سے آزمانی پڑ گئی

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

ہواؤں میں رچا کچھ اور ہی تھا
وہ جو ہم نے پیا، کچھ اور ہی تھا

اسے چہروں کے جنگل میں نہ ڈھونڈو
وہ چہرے کے سوا کچھ اور ہی تھا

پرندہ مطمئن لگتا تھا لیکن
پرندہ سوچتا کچھ اور ہی تھا

جو باہر لٹ گیا، ہے ذکر اس کا
جو اندر لٹ گیا، کچھ اور ہی تھا

کنارے پر تو بچے کھیلتے تھے
سمندر میں ہوا کچھ اور ہی تھا

زمانے کی زباں کچھ اور ہی تھی
زمانہ بولتا کچھ اور ہی تھا

تمہارے لفظ تھے جاویدؔ کچھ اور
تمہارا مدّعا کچھ اور ہی تھا

عبداللہ جاوید

کیوں رہے آسمان کے نیچے
کیا ملا اس مچان کے نیچے
لان تو ہے ہرا بھرا لیکن
خشک مٹّی ہے لان کے نیچے
جس کو دیکھو زمیں کے پیچھے ہے
کچھ تو ہے خاکدان کے نیچے
ہے زمیں کی بقا اگر منظور
رکھ زمیں آسمان کے نیچے
رات آئی تو اک زمیں والا
سو گیا آسمان کے نیچے
یہ جو اک آن بان ہے اوپر
کیا ہے اس آن بان کے نیچے
گو یقیں تھا گمان کے اوپر
لوگ ٹھہرے گمان کے نیچے
یہ جو سیلاب رود جاں میں ہے
اس کو رکھئے نشان کے نیچے
تھی غزل جب زبان کے اوپر
آبلے تھے زبان کے نیچے
عمر ساری گزر گئی جاویدؔ
صبر کی اک چٹان کے نیچے

عبداللہ جاوید

کچھ یہاں پھیلا ہوا تھا، کچھ وہاں پھیلا ہوا
خواب میں دیکھا، زمیں پر آسماں پھیلا ہوا

شب کے اندھیارے میں دیکھی روشنی ہی روشنی
دن کے اجیالے میں تھا، ہر سو دھواں پھیلا ہوا

ہم نے پھولوں کی طرف جب بھی کیا اپنا سفر
ہر قدم ہم کو ملا، دشتِ تپاں پھیلا ہوا

بے اماں اکثر ہوا ہے، آدمی اس کے تلے
آدمی کے سر پہ جو ہے سائباں پھیلا ہوا

ایک نقطے پر سمٹ آیا یقیں کا ارتکاز
اس سے پہلے، عالم عالم تھا گماں پھیلا ہوا

عمر بھر باندھی تھی، جس دامن میں اپنی ہر طلب
آج وہ دامن تھا سوئے آسماں پھیلا ہوا

عبداللہ جاوید

جانبِ در دیکھنا اچھا نہیں
راہ شب بھر دیکھنا اچھا نہیں

عاشقی کی سوچنا تو ٹھیک ہے
عاشقی کر دیکھنا اچھا نہیں

اذن جِلوہ ہے جھلک بھر کے لئے
آنکھ بھرکر دیکھنا اچھا نہیں

اک طلسمی شہر ہے یہ زندگی
پیچھے مُڑ کر دیکھنا اچھا نہیں

اپنے باہر دیکھ کر ہنس بول لیں
اپنے اندر دیکھنا اچھا نہیں

پھر نئی ہجرت کوئی درپیش ہے
خواب میں گھر دیکھنا اچھا نہیں

سر بدن پر دیکھئے جاویدؔ جی
ہاتھ میں سر دیکھنا اچھا نہیں

ڈاکٹر پنہاں (امریکہ)

کاش یہ خواب حقیقت ہو جائے
تری دنیا مِری جنت ہو جائے
خود پہ آجائے یقیں انساں کو
معتبر دل کی شریعت ہو جائے
آس باقی ہے تو امکاں باقی
شامِ غم صبحِ مسرت ہو جائے
نوعِ انساں ہے بہت خاص تو پھر
عام اخلاص و مروت ہو جائے
گرد کیوں ہو مرے آئینوں پر
صاف ہر دل سے کدورت ہو جائے
ہو محبت سے محبت سب کو
اور نفرت سے ہی نفرت ہو جائے
قلبِ انساں ہو پنہ گاہِ جہاں
اس میں آفاق سی وسعت ہو جائے
وسعت، دشتِ جنوں لا محدود
بیکراں میری محبت ہو جائے
ہو گئی ہے مِری دنیا بیمار
ٹھیک انساں کی طبیعت ہو جائے
درد کچھ اور بنامِ درماں
دل کی کچھ اور مرمت ہو جائے
خوف آتا ہے کہ خود میں نہ کہیں
دفن زندہ کوئی عورت ہو جائے
اس تعیش کا ہے عادی مِرا دل
کم نہ یہ درد کی دولت ہو جائے
آسماں جھک کے زمیں کو چومے
زندگی خواب کی صورت ہو جائے
دل نے کی ہیں جو خدا سے باتیں
کوئی سُن لے تو مصیبت ہو جائے
تیری پنہاؔں ہے کنیزی میں تری
شاعری! کچھ تری خدمت ہو جائے

ڈاکٹر پنہاں

سازِ دل بھی دل شکستہ چاہیے
زندگی کو سوزِ نغمہ چاہیے
مر کے جینے کا سلیقہ چاہیے
عشق کرنے کو کلیجہ چاہیے
مسکراتے چشم و لب کے ساتھ ساتھ
درد کا دل میں دفینہ چاہیے
دن گزر جائے تماشہ دیکھتے
رات بھر کہنے کو قصہ چاہیے
خلوتِ ہستی میں ہر پل ہر نفس
نام کا اس کے وظیفہ چاہیے
ڈھونڈتا تو ہے سکونِ دل مگر
نت نیا انساں کو فتنہ چاہیے
مفلسی کی حد سے نیچے ہیں کہیں
جن کو ہر قیمت پہ پیسہ چاہیے

منزلوں پہ آکے یہ جانا کہ بس
بس مجھے چلنے کو رستہ چاہیے
تن تو مٹی ہے حفاظت اس کی کیا
روح کو آنکھوں کا پردہ چاہیے
زندگی تخلیق ہے اللہ کی
تو اسے خالق سا رتبہ چاہیے
خالق و مخلوق کے مابین بھی
کچھ براہِ راست رشتہ چاہیے
امتیازِ خیر و شر کے واسطے
حادیٔ من دل صحیفہ چاہیے
زندگی مرنے کو بھی کم پڑ گئی
جبکہ جی اُٹھنے کو لمحہ چاہیے
زندگی کی شاعرہ ہونا ہے گر
پھر تو پنہاں کو سکینہ چاہیے

ڈاکٹر پنہاں

زندگی کو خبر کیا تھی جب آئے پر
آشیاں سے بہت دور لے جائے پر
وقت سمجھا گیا طفلِ دل کو وہ سب
میں جو سمجھی نہ تھی ماں کے سمجھائے پر
یادِ صحنِ چمن سے خیاباں قفس
گیت پرواز کے رات دن گائے پر
جس کی چاہت کے سورج تلے جل بجھی
اس کا سایہ نہیں ہے مِرے سائے پر
آنکھ جھپکی ذرا، وقت سب لے اُڑا
ہاتھ آئے نہ پر،لاکھ پچھتائے پر
بھول جائے گا اس بار بھی صبح تک
جو بھی وعدے کیے شام کی چائے پر
ہوش اپنا نہیں،اپنے گھر کا نہیں
انگلیاں کیوں اُٹھاتے ہو ہمسائے پر
یہ وطن ہے ہمارا، تمہارا وطن
آئے جس جس نے حصہ لیا گائے پر
کچھ دوائیں بھی ہوں،کچھ دعائیں بھی ہوں
مشورہ دل کا ہے عقل کی رائے پر
ہو نہ جائیں کہیں نذرِ حرص و ہوا
اپنے حالِ شکستہ سے شرمائے پر
مورنی پر اداسی کے دورے پڑے
ناچتا مور خوش ہو کے لہرائے پر
کوئی پنہاں کہیں لاروے کی طرح
شاعری جیسی تتلی کے اترائے پر

ڈاکٹر پنہاں

زندگی انتشارِ وحدت ہے
آئنہ کرچیوں کی صورت ہے

عکس در عکس غرقِ حیرت ہے
خواب ہی خواب ہر حقیقت ہے

اپنے انجام کی نہیں پروا
مسکرانا کلی کی فطرت ہے

مجھ سے اور آپ کو محبت ہے
اس تکلف کی کیا ضرورت ہے

موسمِ قحطِ انس و مہر و وفا
زندگی مثلِ دشتِ غربت ہے

کون،کب کس لئے، کہاں ،کیوں، کیا
سوچنے کی بھی کس کو فرصت ہے

اور کیا دیکھنا ہے دنیا کو
موسموں میں عجیب شدت ہے

موت بے لطف سا قرار مگر
زیست پُر کیف سی مصیبت ہے

عشق بھی تو سبب نہیں اس کا
دل پہ طاری جو اَب کے وحشت ہے

جسم و جاں کا عجب ہے یہ موسم
دھڑکنوں کو بھی دل سے خفت ہے

شاعری کیا ہے،کیا کہوں پنہاںؔ
کربِ اظہار کی اذیت ہے

ڈاکٹر پنہاں

ابھی اور آج بھی اور کل بھی ہوں گے
مسائل ہیں تو ان کے حل بھی ہوں گے

سفر آساں ہے زندگی کا
کہیں دلدل،کہیں جنگل بھی ہوں گے

جو بویا تھا وہی اب کاٹنا ہے
تھے جیسے بیج ویسے پھل بھی ہوں گے

وہ ہارے گا بھی تو مانے گا کیسے
جلی رسی کے باقی بل بھی ہوں گے

گزر جائیں گے سر سے کالے بادل
فضاؤں میں دھنک آنچل بھی ہوں گے

حسیں ہوگا تری یادوں کا موسم
بہت سی دھوپ،کچھ بادل بھی ہوں گے

چھپا لیں گی مِرے سب راز پلکیں
اگرچہ آنکھ میں کاجل بھی ہوں گے

نفس میں ہم نفس کی ہے جو خوشبو
سلگتے درد کے جنگل بھی ہوں گے

بدل جاتے ہیں آنکھوں کے بھی موسم
یہ ریگستان ہی جل تھل بھی ہوں گے

چکوری کو نہیں معلوم شاید
پرِ پرواز آخر شل بھی ہوں گے

خرد مندوں کی اس دنیا میں پنہاںؔ
مِرے دل جیسے کچھ پاگل بھی ہوں گے

سہیل اختر (بھوبنیشور)

ہو نہ انہونی تو امکان بھی کم پڑتا ہے
ایسے حالات میں وجدان بھی کم پڑتا ہے

پہلے ہم وعدۂ فردا سے بہل جاتے تھے
آج کل آج کا پیمان بھی کم پڑتا ہے

جائیں تو جائیں کہاں لے کے ہم اپنا یہ جنوں
ایسی وحشت کو بیابان بھی کم پڑتا ہے

جب سے جانا اُسے کھونے کے فوائد ہیں بہت
بھول جاتا ہوں تو نقصان بھی کم پڑتا ہے

زندگی جیسی تپسّیا سے گزر جانے کے بعد
کوئی وردان ہو وردان بھی کم پڑتا ہے

شب گئے کرتا ہے بے چین جب انجان سا درد
پھر مری جان ترا دھیان بھی کم پڑتا ہے

جب سہارا ملے کافی ہے سہیلؔ اک تنکا
غرق پھر کرنے کو طوفان بھی کم پڑتا ہے

سہیل اختر

ہمارے ساتھ جو دلبر ہے وہ ہے اور کوئی
مگر جو خواب کا پیکر ہے وہ ہے اور کوئی

ہے زخم زخم بدن چہرہ پُر خراش مگر
جگر کے پار جو خنجر ہے وہ ہے اور کوئی

میں اکثر اپنے پتے پر اسے بھی ملتا نہیں
اکیلے رہنے کا جو گھر ہے وہ ہے اور کوئی

تو مثلِ آتش و مہر و مہ و ستارہ سہی
جو مجھ میں پیکرِ انور ہے وہ ہے اور کوئی

میں تن کے چلتا ہوں پتھراؤ میں کہ جانتا ہوں
جو میرے نام کا پتھر ہے وہ ہے اور کوئی

کسی طرح کی بھی کوئی اُمید مجھ کو نہیں
جو منتظر مرے اندر ہے وہ ہے اور کوئی

ملی جب آنکھ تو لطف نظارہ جاتا رہا
اب اس نظر میں جو منظر ہے وہ ہے اور کوئی

بس اک ذرا سا جھلکتا ہے اپنے شعروں میں
مگر دراصل جو اخترؔ ہے وہ ہے اور کوئی

سہیل اختر

دشت جانے کی ضرورت دوسری
عام جو ہے اب کے وحشت دوسری

جان و دل قربان اب کرتا ہے کون
ہم بھی کرتے ہیں محبّت دوسری

کچھ نہیں بدلے گا اب معلوم ہے
ہے ہماری بھی بغاوت دوسری

مسخ کر ڈالا ہمیں حالات نے
ورنہ تھی اپنی شباہت دوسری

تیری قربت کی وہ شا میں اب کہاں
اپنی صبحوں کی بھی حاجت دوسری

جب نہیں ملنا تو مچلیں کس لئے
اب بنا لی ہم نے عادت دوسری

کیا بنا ڈالا ہمیں تعلیم نے
ورنہ تھی اپنی لیاقت دوسری

ٹھیک سے اجڑے نہ بس پائے سہیلؔ
ہے ہماری بھی اذیّت دوسری

سہیل اختر

کہاں خوابِ جنوں سے میں کبھی بیدار ہوتا ہوں
ہوا تو ہوش والوں پر بھی کتنا بار ہوتا ہوں

ہے آغازِ عروج اپنا تنزّل مت سمجھ لینا
کہ میں تعمیر سے پہلے یوں ہی مسمار ہوتا ہوں

کھنچے جب رات کی سرحد مجھے مت ڈھونڈ اشکوں میں
کہ میں اس وقت بحرِ کرب کے بھی پار ہوتا ہوں

اگر چہ فطرتاً ہوں پھول کی پتی سے نازک تر
وہی میں وقت جب پڑ جائے پھر تلوار ہوتا ہوں

دریچے اور دروازے بنانا کام ہے میرا
نہ جانے کیوں خود اپنی راہ کی دیوار ہوتا ہوں

دلوں میں تو اتر جاؤں بہ آسانی اثر بن کر
ذرا سا ذہن والوں کے لئے دشوار ہوتا ہوں

یہاں رمز و کنا یہ اس نے بھی تو ترک کر ڈالا
اکہرے دور میں میں بھی کہاں تہہ دار ہوتا ہوں

نہیں سچّائیوں کی تلخیوں کا اس قدر عادی
مگر خوابوں کے بھی افراط سے بیزار ہوتا ہوں

اسی خوش فہمی پر تو جی رہا ہوں آج تک اخترؔ
کہ اک نظرِ کرم کا میں بھی تو حق دار ہوتا ہوں

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

پرورش

میں جب اپنے لڑکے کو عام عراقی بچوں سے مختلف پاتی ہوں تو اپنے ذہنی ردِعمل کو خود بھی نہیں سمجھ پاتی۔ مجھے یہ بھی نہیں پتہ کہ میں دل ہی دل میں رو رہی ہوں یا ہنس رہی ہوں۔اس کیفیت سے خود کو آزاد کرنے کے لئے میں کھانسنے لگتی ہوں۔موقع بے موقع اور وقت بے وقت۔کھانسی کوئی مستحسن فعل نہیں یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔میں پڑھی لکھی عورت ہوں۔مقامی اسکولوں کے علاوہ لندن میں بھی کچھ دن پڑھ چکی ہوں۔لندن میں ایک گورا لڑکا فلپؔ جو قد میں میرے برابر لیکن بے حد موٹا تھا میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔اس کو میرے چہرے پر ناک اور میرے بدن میں پتلی کمر بہت پسند تھی۔یہ حقیقت ہے کہ پورے عراق میں شاید ہی کسی لڑکی کی اتنی ستواں ناک کے ساتھ اتنے پتلے نتھنے ہوں۔اور میری کمر تو آج بھی چیتے کی کمر ہے، نہ ہونے کے برابر اور بے حد لچکدار۔مجھے یقین تھا کہ فلپؔ مجھ سے فلرٹ نہیں کرتا تھا وہ سچ مچ مجھ پر مرتا تھا لیکن میں نے کبھی اسے گھاس نہیں ڈالی۔میں جانتی تھی کہ اگر میں فلپؔ سے ملونگی تو دوسرے لڑکے مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں چھوڑنے کے لائق تھی بھی نہیں یہ میں اچھی طرح سمجھتی تھی ۔اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ میں اگر فلپ سے اکیلے میں ملونگی تو اسکول کے بُلی (Bully) لڑکے فلپؔ کو نہیں چھوڑیں گے۔میں نے اپنا اِمیج (Image) ایک ایسی عرب مسلم لڑکی کا بنایا ہوا تھا۔جس پر ایک غیر مرئی لیبل چسپاں ہو ''فاصلہ رکھو''۔وہ بھی کیا دن تھے۔لیکن میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں۔وہ لڑکی جس پر فلپؔ مرمٹا تھا کوئی اور تھی، یہ لڑکی یا عورت جو میں اب ہوں کوئی اور ہے۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ بظاہر آپ ہی ہوں لیکن کوئی اور آپ کے اندر حلول کر جائے اور آپکو کوئی اور بنا دے۔ میں نے یا تو غلط الفاظ کا استعمال کر لیا ہے یا میری سوچ غیر واضح ہے کہ میرے اندر کوئی آ گیا یا حلول کر گیا، ایسا نہیں ہے۔اور نہ ہی میں کسی کے اندر حلول کر گئی ہوں۔۔۔۔تو پھر کیا ہوا ہے؟ یہ بھی ممکن ہے مجھے معلوم بھی نہیں ہوا، لیکن میں مر بھی گئی اور میرا دوسرا جنم بھی ہو گیا۔اگر ایسا ممکن ہے تو میرے ساتھ پھر ایسا ہی ہوا ہوگا کیونکہ مجھے یاد پڑتا ہے اس رات میں مر گئی تھی۔

عجیب رات تھی، شہر لُٹ پُٹ گیا تھا۔شہر کا نام نہیں بتاؤں گی، میں نے اپنا نام کب بتایا ہے۔نام تو ان کو ساجتے

ہیں جن کی کوئی تاریخ ہوتی ہے اور جن کا جغرافیہ اتھل پتھل نہیں ہوتا۔میرا آسمان سے بمباری اور زمینی گولہ باری سے آدھے سے زیادہ ملبے کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ایک میرا مکان ہی کیا اس گلی بلکہ محلے کے سب مکان اور ان کے مکینوں پر قیامت ٹوٹ چکی تھی۔میرے باقی ماندہ گھر کے مکینوں میں سے صرف دو نفوس زندہ بچے تھے ایک میری بوڑھی دادی اور ایک میں۔میرے ماں باپ اور اکلوتا بھائی مرے پڑے تھے۔دوسرے دن ان کے کفن دفن کے لئے مجھے ہی بہت کچھ کرنا تھا۔لیکن تازہ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ گھر میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔گھر کی ٹوٹ پھوٹ سے پانی کا نلکا مسدود ہو گیا تھا۔باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ تو زیرِ زمین سما چکے تھے۔دادی پیاس سے بیتاب تھی اور میں بھی۔اپنے لئے نہیں تو دادی کے لئے پانی مہیّا کرنا ضروری تھا، اور وہ بھی جلد۔باہر تباہی ہی تباہی تھی۔ہمت کر کے میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک جانب چلنا شروع کیا۔چل کیا رہی تھی ملبے کے ڈھیروں سے ٹھوکریں کھا رہی تھی۔آس پاس کے پہچان کے لوگوں کے گھر کھنڈر تو تھے ہی لیکن ان کے مکینوں میں اکثر مر چکے تھے۔باقی ماندہ ادھر اُدھر نکل چکے تھے۔مجھے بھی وہاں سے چلا ہی جانا چاہئے تھا لیکن معذور دادی کو لے کر وہ بھی اندھیری رات میں اس کھنڈر علاقے سے گزرنا آسان نہیں تھا۔بجلی تو شاید شہر بھر کی بند پڑی تھی۔دادی کو ان کی معذوری کے ساتھ چھوڑ کر فرار ہونا مجھے منظور نہ تھا۔ابھی کچھ دور ہی چلی تھی کہ مجھے محسوس ہوا کوئی گاڑی دندناتی، ملبے سے لڑتی ہوئی قریب ہی رکی۔میں خوف سے لرزتی ہوئی ملبے کے ایک ڈھیر میں گھس پڑی اگرچہ ایسا کرنے سے میری ہتھیلیوں، کہنیوں، گھٹنوں میں خراشیں آ گئیں۔وہ فوجی گاڑی تھی اس سے صرف ایک فوجی اترا تھا۔میں یہ سب غور سے دیکھ رہی تھی۔تاریکی کے باوجود مجھے ہر چیز پر نظر رکھنا ضروری ہو رہا تھا۔یہ تو صاف ظاہر تھا جو فوجی ٹرک سے اترا تھا وہ عراقی نہیں تھا۔امریکی، انگریزی، یا اطالوی کوئی بھی ولد الحرام ہو سکتا تھا۔ہیں بغیر آواز کے رو رہی تھی۔''وَ لَا یَئُودُہٗ حِفظُہُمَا وَھُوَا لعَلِیُ العظِیم'' کا ورد میں نہیں بلکہ میرے اندر کا وجود مسلسل کئے جا رہا تھا۔میرے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔میں دل ہی دل میں پورے خضوع اور خشوع کے ساتھ دعا مانگ رہی تھی کہ وہ جو کوئی بھی ہو مجھے دیکھ نہ پائے۔شاید اس پسر ولد خنزیر نے مجھے پہلے ہی دیکھ لیا تھا اس کے آہنی بوٹوں کی گڑ گڑاہٹ جو ملبے کے ٹکڑوں کو چورا چورا کر رہے تھے قریب ہوتی چلی گئی۔میرے قریب آتے ہی اس نے عربی میں تحکمانہ لہجے میں آواز لگائی ''جو کوئی بھی ہو فوراً باہر آ جاؤ، دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ورنہ میں فائر کھولتا ہوں۔''۔''کم بختوں کو ٹوٹی پھوٹی عربی سکھا دی جاتی ہے'' میں نے اس سور کے تخم کو کوستے ہوئے سوچا اور ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے باہر آ گئی۔اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، چھلانگ لگا کر دبوچا اور انتہائی پھرتی سے میرے بدن کو ٹٹولا۔۔۔ہنسا اور بولا ''اس کھنڈر میں کیا تلاش کر رہی تھی۔''

''پانی'' میں نے جواب دیا۔

''پانی تو بہت ہے میرے پاس'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور مجھے گھسیٹنے لگا۔

''میری دادی کے لئے پانی'' (Drinking water for my Granny)اس مرتبہ میں نے انگریزی میں جواب دیا

'' تو انگریزی جانتی ہے۔؟ '' (You know English)اس مرتبہ اس نے انگریزی میں سوال کیا۔

'' ہاں۔لندن میں 'میری کلاسیوا اسکول' میں پڑھ چکی ہوں۔''میں بولی۔

یہ سن کر اس کا رویّہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔'' کہاں ہے تمہاری دادی'' اس نے انتہائی ہمدردانہ لہجے میں پوچھا ۔

میں نے اپنے کھنڈر مکان کی جانب اشارہ کیا جو دکھائی نہیں دے رہا تھا اور بولی ''یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا ۔

'' میں ڈیوٹی پر ہوں اور ہم کو اجازت نہیں کہ مقامی لوگوں سے ملیں جلیں۔ پھر بھی میں تمہارا ٹھکانہ دیکھ لیتا ہوں۔ شاید کل کچھ کر سکوں۔تم آگے چلو میں تمہارے کچھ پیچھے آتا ہوں۔ ''

''اوکے۔۔ بہت بہت شکریہ! میں انگریزی اور عربی ایک ساتھ بولی۔

''یو آر ویلکم'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ وہ جس کو تھوڑی دیر پہلے میں نے خنزیر کی اولاد کہا تھا، اس وقت مجھے فرشتہ نظر آ رہا تھا۔ اور خوبصورت بے حد خوبصورت ۔۔۔۔۔ میرے ٹوٹے پھوٹے مکان تک پہنچ کر اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی، پانی کی بوتل اور بسکٹوں کا ایک پیکٹ اپنے یونیفارم میں کسی جگہ سے برآمد کر کے مجھے پکڑایا۔''بائی بائی۔'' کہتے ہوئے میری پیشانی کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی سے چھوا اور مستعد فوجیانہ انداز سے وہاں سے چلا گیا۔

میں نے دادی کو فوری طور پر پانی دیا۔ وہ بے چاری سمجھ رہی تھی کہ میں یا تو مر گئی یا اس کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ہم دونوں نے بسکٹ کھائے اور ایک بار اور پانی پیا۔ ہمارے بالکل پاس ہمارے پیاروں کی لاشیں پڑی تھیں، ان کے مردہ جسم اکڑ گئے تھے اور ان کی روحیں ہم دونوں دادی پوتی کے آس پاس بھٹک رہی تھیں یا پھر ان فرشتوں کے حصار میں تھیں جو مرنے والوں کی روح سے ابتدائی پوچھ گچھ کرتے ہیں۔

کھنڈر میں رات گزری اور صبح ہوئی۔ یوں لگا جیسے میری زندگی کی پہلی رات اور پہلی صبح تھی۔ جاتے ہوئے وہ اپنا نام بتا گیا تھا اور میرا پوچھ گیا تھا۔ دوسرے دن اس نے آنے کو کہا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ البتہ وہ ہم سے غافل بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی توجہ ہی تھی جس کی وجہ سے مجھے اور میری دادی کو ''ریڈ کراس'' والوں کی حفاظت میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ ہم دادی پوتیوں کو اپنی عارضی پناہ گاہوں میں لئے پھرتے رہے۔ دادی کا علاج ہوا اور تدفین میں بھی کامیابی ہوئی۔ اس تمام دوران وہ نہیں آیا لیکن اس کی پرچھائیں میرے آس پاس لہراتی رہی۔ عجیب آدمی تھا۔۔۔ یا فوجی ڈسپلین سے بندھا تھا کہ ایک پرچہ بھی اس کی جانب سے موصول نہیں ہوا البتہ میرے معاملات بہتر سے بہتر ہوتے گئے۔ ریڈ کراس کے اس گروپ نے مجھے اپنے عملے کے ساتھ شامل کر لیا۔ میں زخمیوں کی مرہم پٹّی کے کام میں تربیت یافتہ نرسوں کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی۔ ہماری حفاظت کا بندوبست بھی تھا البتہ ہمارے کاموں میں اڑچن پیدا ہوتی رہتی تھی۔ ان رکاوٹوں کا باعث باہر والوں سے زیادہ عراقی ہوتے تھے وہ عراقی جو باہر والوں کو اپنے ملک سے باہر نکالنا چاہتے تھے اور ان کے لئے جگہ جگہ دیوار بن رہے تھے۔ ان ریزسٹ (Resist) کرنے والوں میں تھوڑے ہی سہی، ایسے اہلِ عرب بھی تھے جو 'ریڈ کراس' والوں کو بھی شبے کی نظر سے دیکھتے تھے اور موقع ملتے ہی ریڈ کراس کے چھوٹے بڑے کیمپوں یہاں تک کے ہسپتالوں کو بھی اپنا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے تھے۔ حفاظت کے ہمہ وقت اور ہمہ جہت انتظامات کے باوجود ریڈ کراس والوں کو طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑتے تھے۔ زخمیوں کے لئے مرہم پٹّی کا سامان ضائع ہو جاتا تھا، دوائیں برباد ہو جاتی تھیں، چھوٹے بڑے آپریشن کے لئے ضروری آلات ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے، بستر وغیرہ کی قلّت میں اضافہ ہو جاتا تھا، غذاؤں کی کمی ہو جاتی، ڈاکٹر، نرسیں، اور میڈی کیئر کے دیگر افراد بھی کبھی کسی حملے کی زد میں آ کر ختم ہو جاتے اور تو اور شرمناک پہلو یہ بھی تھا کہ ریڈ کراس کی خواتین کی عصمتیں بھی محفوظ نہیں تھیں۔ اس میں باہر والوں اور مقامی لوگوں میں خاص فرق نہ تھا موقع دستیاب ہونے پر دونوں ہی اقسام کے مرد اپنے ہاتھ رنگ لیتے تھے اگرچہ عام عراقی خواتین کے مقابلے میں ریڈ کراس والیاں قدرے محفوظ ضرور تھیں۔ میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتی رہتی تھی، ربّ العالمین کا سایہ مجھ پر تھا میں عراق کی خواتین کے مقابلے میں ہزار گنا محفوظ تھی اور ایک نہایت ہی افضل کام سے جڑی ہوئی تھی۔ زخمیوں کی مرہم پٹّی اور خدمت کا کام۔ میرا اشمار عام عراقی عورتوں میں نہ تھا جو فوجیوں کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ مفتوحہ ملک کی مفتوحہ عورتیں ۔۔۔ باہر والوں کے لئے 'مالِ غنیمت' اور مقامی اہلِ حرب کے لئے 'مالِ مفت'۔ ریڈ کراس کیمپ اور عارضی ہسپتال خانہ بدوشوں کی حالت میں کام کر رہے تھے۔ ان سے متعلق عورتیں، ٹین ایجر لڑکیاں، ادھیڑ عمر کی خواتین، پیرا میڈس نرسیں، اور ڈاکٹرز اس روز روز کی شفٹنگ اور تبدیلی کی وجہ سے غیر محفوظ مرحلوں سے بھی گزرتیں۔ میں بھی لاکھ کوشش کے باوجود غیر محفوظ ہونے سے محفوظ نہ رہ سکی۔۔ فوجیوں سے روندی گئی جن میں دو عراقی اور ایک باہر والا تھا۔

ایک شام اس کا دیدار ہوا۔ اس مرتبہ بھی وہ ملنے نہیں آیا تھا بلکہ اسے لایا گیا تھا ایک زخمی کے طور پر۔ جیسے ہی میں نے اسے دیکھا میں پہچان گئی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بغیر دیکھے میں اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ وہ بے ہوش تھا زخموں سے چور تھا۔ اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ہمارا کیمپ ان دنوں خاصے محفوظ علاقے میں تھا اور وہاں پر ہر سہولت موجود تھی۔ میرے اس تک پہونچنے سے قبل وہ ایک نہایت ہی لائق ڈاکٹر کے معائنے سے گزر چکا تھا۔ اور اسی کی ہدایت کے مطابق ایک نرس نے اس کو انجکشن دے کر درد کی اذیت سے چھٹکارا دلا دیا تھا۔ جس کے زیرِ اثر وہ نیند کے آغوش میں جا چکا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا مارفین کے زیرِ اثر نیند میں عارضی طور پر وہ اپنی جسمانی اذیتوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بے حد حسین لگ رہا تھا، مردانہ حسن کا مکمل نمونہ۔ اگرچہ قبیح اور بد صورت جنگ نے اس کے حسین جسم کو سر سے پیر تک چھید ڈالا تھا۔ اس سے قبل اس رات بھی وہ مجھے بے حد حسین لگا تھا جب اس نے پیاسی دادی اور میرے لئے بسکٹ کا پیکٹ اور پانی کی بوتل دی تھی۔ کھنڈر میں وہ اس سے پہلی ملاقات میری زندگی کی یادگار ملاقات تھی اگرچہ اس رات میں اپنے والدین سے محروم ہو گئی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ۔۔۔ اس کیمپ میں لائے جانے کے دوسرے دن ہی جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، اس کے ہونٹ مسکرائے، اس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی میرے نچلے ہونٹ پر

ہلکے سے دبائی۔اس کھنڈر والی ملاقات میں رخصت ہوتے سمے اپنی وہی انگلی میرے ماتھے سے چھوئی تھی۔وہ لمس ماتھے پر ہنوز تازہ تھا۔یہ کیسا مرد تھا،فوجی مرد، فاتح فوجی، یا دوسرے لفظوں میں قابض فوجی،جن کو مقامی حریت پسند غاصب کہتے تھے۔میں تو اس کے فوجی بوٹوں تلے آئی ہوئی مفتوحہ زمین تھی جس کے کبھی ماتھے اور کبھی ہونٹ کو اپنی شہادت کی انگلی سے محض ہلکے سے چھو رہا تھا۔مجھ مفتوحہ عورت کو وہ اپنے پیار سے کیوں فتح کرنا چاہتا تھا۔فوجیوں کا پیار سے کیا واسطہ۔؟۔۔دیوانہ! میں اپنی ڈیوٹی سے غافل نجانے کیا کیا سوچتی رہی تھی۔

'' ہیلو! ہاؤ آر یو ۔''اس نے سرگوشی کی یوں بھی اس کی آواز میں نقاہت آگئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔تم نے اپنے آپ کو توڑ پھوڑ لیا۔''

''میں نے تمہارے ملک کو توڑا پھوڑا۔میری یہی سزا ہے اور سچ پوچھو تو یہ سزا بہت کم ہے۔''

جیسے ہی وہ کھڑے ہونے کے لائق ہوا وہ اس کو لے گئے۔اس نے ''بائی بائی'' کہتے سمے میرے سامنے اپنی داہنے ہاتھ کی انگلی بڑھائی اس سے پہلے وہ میرے ہونٹ یا ماتھے کو چھوتی میں نے اس کو پکڑ لیا اور اپنی جانب کھینچا،انگلی کے ساتھ وہ بھی کھنچتا چلا آیا اور میں اس سے بغلگیر ہوگئی عراقی انداز سے۔معانقہ کرنے کے۔بعد میں نے مغربی انداز سے اس کو ایک طویل بوسہ دیا۔

کیمپ سے لے جائے جانے کے بعد اس کو نجانے کس کس کے آگے پیش کیا گیا لیکن بالآخر اس کو فرنٹ کے ناقابل قرار دے دیا گیا۔وہ ایک بار پھر آیا۔بہت سارے چھوٹے چھوٹے تحائف کے ساتھ۔جو سگریٹ، چیونگم، ویفرس،بسکٹ، چاکلیٹ،ڈسپوزیبل ریزرس،شیمپوز وغیرہ پر مشتمل تھے۔جو اس نے عملے میں تقسیم کئے۔میرے لئے ایک فلاور بُکے لانے میں کامیاب ہوگیا تھا جو ان حالات میں قریب قریب ناممکن تھا۔میں نے اس کو دیکھتے ہی دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔''اللہ کرے وہ مجھے پروپوز کر دے۔''

میں جو اندر سے اس کی ہو چکی تھی۔باہر سے بھی اسکی ہو جانا چاہتی تھی۔کاش! وہ کسی گوری سے بندھا نہیں ہو۔میری دعا قبول ہوگئی اس نے مجھے عیسائی آداب کے مطابق زمین پر گھٹنا ٹیک کر پروپوز کیا۔اس نے عیسائی طریقے سے اور میری فرمائش پر اسلامی طریقے سے مجھ سے شادی کی۔پہلے وہ خود اپنے ملک چلا گیا بعد میں مجھے بلوانے میں کامیاب ہوگیا۔لیکن ہماری شادی شدہ زندگی بہت مختصر رہی۔اس کے بدن پر لگے ہوئے گھاؤ جو بظاہر بھر گئے تھے ،جان لیوا ثابت ہوئے۔جاتے جا تے وہ اپنے اور میرے بیٹے کی صورت میں اپنی نشانی دے کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔میں اس گورے فوجی کی نشانی لے کر ایک بار پھر اپنے ملک لوٹ آئی اور ریڈ کراس والوں نے مجھے ایک بار پھر شریک کار بنا لیا۔میرا عراق لوٹنا میرے ریڈ کراس کے بہی خواہوں میں زیرِ بحث آتا رہا۔۔۔اور میرے اندر بھی۔۔کیا اس کے اور میرے بیٹے کو اُس کے ملک میں پرورش پانا چاہئے تھا یا میرے ملک میں۔۔۔۔۔فاتحوں کے درمیان یا مفتوحین میں۔۔۔۔؟

سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)

نوحہ گر

کسی شریر بچے کی طرح کھڑکی کے ادھ کُھلے پٹ سے ہاتھ بڑھا سورج نے مٹھی بھر دھوپ اس کے چہرے پر پھینکی تو نیند، جو آنکھوں میں پاؤں پسارے پڑی تھی ہڑابڑا کر اٹھ بیٹھی۔اس نے آنکھ کھولے بغیر سورج کا ہاتھ پرے کر کے کھڑکی کا پٹ بند کیا اور نیند کو تھپکنے لگا مگر اندھیرے اور بند کمرے میں اڑنے والی چڑیا کے مانند نیند بےکل ہو چکی تھی۔اس احساس کے ساتھ اگر آنکھوں کے روشندان نہ کھولے تو یہ پھڑ پھڑاتی ہوئی نیند بےچین کرتی رہے گی۔اس نے آہستہ آہستہ پلکوں کے پردے اٹھا دیئے۔ایک انگڑائی لے کر وہ بستر سے اٹھ گیا۔

آنکھوں میں نیند کی ڈالی ہوئی خراشوں پر ٹھنڈے پانی کے دو چار چھینٹے مارے۔سورج کی بےجا مداخلت سے حلق میں کڑواہٹ سی جو گھل گئی تھی وہ کلیاں کر کے تھوکی......پھر گیلے ہاتھ بالوں پر پھیرتا ہوا ناشتہ کی میز پر پہنچ گیا۔

تعطیل کے روز اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ سارے کاموں کی چھٹی کر دے اور گھوڑے بیچ کر دیر تک سوتا رہے مگر ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ وہ حسب مرضی اٹھے پھر بھی جلدی اٹھ جانے یا اٹھا دیئے جانے پر وہ جھنجھلاتا نہیں تھا۔وہ سمجھتا تھا کہ ہفتے میں یہی ایک دن تو آتا ہے جب مصرفیتوں کے نت نئے زاویوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ورنہ ہر روز تو کام کا ایک ہی آئینہ ہوتا ہے۔مگر آج......آج کا دن تو کچھ زیادہ ہی اہم اور ہنگامہ خیز ہے۔آج کے دن کے لیے تو ہفتہ بھر سے وارننگ دی جا رہی تھی۔آج اس کی بیٹی کی سالگرہ کا دن ہے۔

ناشتے کی میز پر بیٹھتے ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کچھ دیر کے بعد ڈرائیونگ بھی کرنا ہے اور گھریلو ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لیے بیوی کے ساتھ دکان در دکان پھیرے بھی لگانے ہیں کیونکہ آج بڑے صاحبزادے تو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائیں گے کہ ان کا سارا دن ٹی وی کے سامنے کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے گزرے گا۔

ناشتے کی میز پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی دیکھا جو سب سے بےخبر روئی کے گالے جیسے اس چوزے کے ساتھ کھیل میں مصروف تھا جو دو ہی دن پہلے ضد کر کے خریدا گیا تھا۔

سارے گھر اور خاص طور سے ڈرائنگ روم کی حد سے زیادہ جھاڑ پونچھ سے یہ اندازہ بھی لگایا کہ شاید آج ملاقات کے لیے آنے والے دوستوں کو اپنے بیڈ روم ہی میں بلا کر بٹھانا پڑے گا اور یہی بات ان کے طنزیہ فقروں کا نشانہ بننے کے لیے کافی ہوگی۔

وہ اپنی تمام مجبوریوں اور مصروفیتوں کا خیال کر کے ان ذمہ داریوں اور محبتوں پر مسکرایا جو اس سے وابستہ

ہیں اور ان سب نے مل کر اس کی ذات کو اس قدر مجبور، اتنا بااختیار اور ایسا اہم بنا دیا ہے کہ اگر وہ درمیان سے نکل جائے تو سارا گھر...... گھر سے وابستہ تمام رشتے اور واسطے کسی ان بریک ایبل گلاس کی طرح ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ اپنی اہمیت کو محسوس کیا تو چہرے پر طمانیت کا رنگ پھیل گیا۔ اسی خوشگوار کیفیت میں اس نے ایک ہاتھ سے چائے کی پیالی اٹھائی اور دوسرے سے اخبار...... اس کا ہاتھ کانپا اور اچانک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ اگر پیالی کو فوراً نہ رکھ دیتا تو چائے چھلک کر اس پر گر پڑتی۔ تنہا تنہا نظریں...... بغیر کسی خیال کے لمحے بھر تک اخبار پر گھومتی رہیں۔

کسی صحرائی علاقے کے عفریت نے ایک ہوائی جہاز کو نگل لیا تھا۔

سیاہ حاشیوں میں لپٹی ہوئی سرخی نے اس کا رنگ پھیکا کر دیا۔ اخبار کے صفحے پر پھیلے ہوئے الفاظ کن کھجورے کی طرح اس کے ذہن پر پنجے گاڑنے لگے۔ تصور اتنی تیزی سے حادثے کے مقام پر پہنچا کہ حالات کی گرد اڑنے لگی۔ فضا کی وسعتوں سے چھین کر جن کو زمین نے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اس کا ان سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ خون کا نہ جذبات کا...... مگر آدم نسبی کا تعلق تھا۔ مٹی کا رشتہ تھا۔ اور اب وہی مٹی اس کے وجود میں تڑخنے لگی تھی۔

ذہن میں اوپر تلے کئی خیال آئے۔ سر اتنا بوجھل ہوا کہ گردن پر اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ نڈھال سا ہو کر خاصی دیر تک میز پر کہنیاں ٹکائے۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، اخبار کی بے جان سطروں کو یوں تکتا رہا جیسے صحرا میں بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ رہا ہو اور یہ بات سمجھ میں نہ آ رہی ہو کہ اس مرگ انبوہ پر وہ کیا کرے!

اچانک موسیقی کی ایک خاص دھن انگڑائی لے کے اٹھی اور دھوئیں کے مانند سارے گھر پہ چھا گئی۔ آنکھوں کے سامنے اخبار کی سطریں...... کانوں کے ذریعے وجود میں اترنے والا سازوں کا شور...... اس نے محسوس کیا کہ یہ اونچے سر اس کے اندر یوں اترتے جا رہے ہیں جیسے کسی غبارے میں ہوا بھری جاتی ہے...... اس سے پہلے کہ وہ پھٹ پڑے، اپنی کسی سہیلی سے ٹیلیفون پر باتیں کرتے کرتے اس کی بیٹی ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کے چیخی۔

'بھیا! آواز کم کیجئے!'

میچ شروع ہونے کو تھا اس لیے بیٹے نے ٹی وی کھول دیا تھا اور سارے گھر میں سازوں کی گیند لڑھکتی پھر رہی تھی۔ بیٹی کی بروقت مداخلت نے غصے کے غبارے میں سے ہوا نکال دی۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر چائے کی پیالی اٹھائی۔ اور گھونٹ گھونٹ کر کے اپنے جذبات پینے لگا۔

دوپہر کے اختتام پر ایک تھکا دینے والی ڈرائیونگ کے بعد جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس وقت بھی سارا گھر مختلف آوازوں سے پٹا پڑا تھا۔ کرکٹ کی کمنٹری، ریڈیو سے فلمی گانے، اور چھوٹے بیٹے کے رونے کی آواز۔ بیوی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے روتے ہوئے بچے کی جانب لپکی اور اس نے تمام چیزیں لا کر کھانے کی میز پر ڈھیر کر دیں، پھر آگے بڑھ کے ریڈیو کی آواز کم کی۔ بیٹی نے شام کی پارٹی میں کام آنے والی تمام چیزیں اس سامان سے الگ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابو! شاہدہ آنٹی کا فون آیا تھا۔ ان سے بات کر لیجئے گا۔ ڈائریکٹری کے پہلے پیج پر میں نے ان کا نمبر پینسل سے لکھ دیا ہے''۔

وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ بے نام سا بوجھ، جس نے اس کے

سارے بدن پر تھکاوٹ پھیلا دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے کمرے میں جا کے تمام دروازے بند کر لے اور خاموش لیٹ جائے۔ کوئی اس سے بات نہ کرے اور وہ اس وقت تک اکیلا اپنے کمرے میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا رہے، جب تک ذہن پر چھایا ہوا بوجھ اور بدن سے لپٹی ہوئی تھکاوٹ کم نہیں ہوتی۔ مگر ساری چاہے جانے والی باتیں کہاں پوری ہوتی ہیں۔ تو اس نے بھی شاہدہ کا فون نمبر ملایا۔

شاہدہ نے دو ایک رسمی باتیں کرنے کے بعد پوچھا۔ ''حامد بھائی! سنبل یاد ہے آپ کو؟''۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اس نے سوچا کہ اکثر یاد نہ آنے والوں کو بھلانا بھی کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر آہستہ سے کہا۔ ہاں...... یاد ہے!

''بے چاری!''۔ شاہدہ نے اتنا کہنے کے بعد آواز کو یکسر تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آج پلین کے کریش کی خبر پڑھی آپ نے؟ وہ اسی میں تھی''۔

یہ سن کر وہ بوکھلا گیا بلکہ ایک لحظہ کے لیے تو ساکت ہو گیا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاہدہ نے یہ خبر سنائی ہے یا سنبل کو نہ بھولنے کی سزا دینے کے لیے دل میں چٹکی لی ہے۔ ریسیور کان سے لگا ہوا تھا مگر اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ریڈیو بھی خاموش ہو گیا تھا۔ ٹی وی کا مبصر بھی چپ تھا۔ گھر بھر میں پھیلے ہوئے شور کو سناٹا نگل گیا تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری ہو گیا۔ لمحہ بھر تک کوئی آواز نہیں آئی...... اور تب اس کے وجود میں خاموشی کی گونج اتنی پھیل گئی کہ دم گھٹنے لگا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ چھت سے لٹکا ہوا پنکھا اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا۔ دنیا اپنے محور پر گھوم رہی تھی۔ پھر سارا شور امڈ پڑا۔ کان سے لگے ہوئے ریسیور میں شاہدہ کے زور زور سے ہیلو ہیلو کہنے کی آواز سنائی دی۔ ریڈیو کی موسیقی، ٹی وی پر میچ کا ہنگامہ، برتنوں کی کھڑ بڑ، ان ساری آوازوں کو حملہ آور پایا تو آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر، کوئی جواب دیئے بغیر اس نے ریسیور رکھ دیا اور پسپا ہو جانے کے انداز میں کرسی پر ڈھے گیا۔ پھر بیٹھے بیٹھے وہ وقت آ گیا کہ اسے اپنا تماشا خود نظر آنے لگا۔

اس نے دیکھا۔

وہ اپنے بیٹے سے یہ پوچھنے کے لیے آگے بڑھتا ہے کہ آج ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر قرآن خوانی کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ مگر بیٹے کے قریب پہنچتے ہی وہ اسکور پوچھنے لگتا ہے اور میچ کے بارے میں اس کی رائے معلوم کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی سالگرہ کی تقریب میں بھی شریک ہوا ہے۔ جب نو عمر لڑکیوں نے کلیپنگ کی ہے تو اس نے بھی بھرپور محبت سے تالیاں بجائی ہیں اور سب کے ساتھ مل کر ہیپی برتھ ڈے والا فقرہ لحن کے ساتھ پڑھا ہے۔ تمام بچوں کے بیچ میں بیٹھ کر مسکراتے ہوئے اس نے تصویر بھی اتروائی ہے۔ مصروف بیوی کا ہاتھ بھی بٹایا ہے۔ اور دل کے زخموں سے اٹھنے والے درد پر مسکراہٹوں کے پھائے بھی رکھے ہیں۔

غرض سورج ڈوبنے تک وہ اپنا تماشائی بنا رہا ہے! اپنی اتنی کامیاب اور شاندار اداکاری پر جب اس نے خود کو مبارکباد کا پیغام دیا تب بھی اس کے من میں تاریکی کا بسیرا رہا۔ خوشی کا کوئی جگنو نہیں چمکا بلکہ بجھے دل کے ساتھ وہ اپنے کمرے میں آیا اور پلنگ پر یوں ڈھیر ہو گیا جیسے سارے دن کی مصروفیت نے اس کے جسم میں تھکن کے کانٹے

چھبو دیئے ہوں۔ بے سدھ ہوکر چند لمحے بستر پر گزارنے کے بعد وہ اچانک اٹھ بیٹھا۔

اس کو اپنے دل میں شاہدہ کے فون کی گھنٹی بجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ذہن میں ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ گونجی۔ صحرا کی وسعت کو اپنے سینے میں سمٹا ہوا محسوس کیا۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے وہ بہت بلندی سے نیچے کی طرف آرہا ہے۔ اس کا سانس رکنے لگا کہ ہوا نہ ہو تو دَم نکلتا ہے اور ہوا بہت ہو تو دَم گھٹتا ہے۔ اس نے سوچا کہ جب دَم گھٹ کر نکلتا ہوگا تو آوازیں بھی سینے میں دب کر مرجاتی ہوں گی۔

وہ یہ بھی محسوس کرنے لگا جیسے تیز ہوا میں لپٹی ہوئی آوازوں کے خنجر اسے لہولہان کیے دے رہے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ اس کا دل کٹ کر رہ گیا اور وہ اذیت بھری چادر لپیٹ کر ماضی کی قبر میں جالیٹا۔ وہ تو ہنگاموں کے سمندر میں ڈوب کر ختم ہو چکا تھا۔ رات کی سطح پر اندھیرے کی کشتی ڈول رہی تھی۔ سناٹے نے اپنے بادبان کھول دیئے تھے اور تنہائی کی مہیب لہریں آپس میں ٹکرا کر ایک ہی نام کی تکرار کیے جارہی تھیں۔ سنبل سنبل سنبل...... اس نام کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ یادوں کے صحرا میں آنکلا۔ مگر یہاں کیا ہے۔ اس دشت میں تو اب پرچھائیاں بھی نہیں رہی ہیں۔ ہر تحریر مٹ گئی ہے۔ ہر چہرہ چھپ گیا ہے۔ بس آنکھوں میں چبھنے والی ریت رہ گئی ہے۔

جب اسے یہ محسوس ہوا کہ آنکھوں کے ویرانے میں آنسوؤں کی لاش پڑی ہے تو اسے اپنے کمرے میں آنے والے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بازو اٹھا کے اس لاش کو آستین کے کفن میں لپیٹ دیا۔

بیوی پاس آکر بیٹھ گئی۔ ’’کیا بات ہے؟ کمرے میں لائٹ بھی نہیں کی۔ کیا سوچ رہے ہو‘‘۔

اس نے بے پروائی سے کہا۔ ’’کچھ نہیں...... تھک گیا ہوں۔ کیا وقت ہوا ہے؟‘‘۔

’’نو بجنے والے ہیں۔ میں بھی بہت تھک گئی ہوں۔ ذرا سی پارٹی نے کاموں کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ سارے برتن دھو دیئے ہیں مگر رکھنے کی ہمت نہیں رہی ہے۔ آپ تھوڑا سا یہ کام اور کر دیجئے کہ اپنے لاڈلے بیٹے کو چپ کرا دیجئے‘‘۔

’’کیوں اس کو کیا ہوا‘‘۔

’’ارے وہ مرغی کا بچہ تھا نا...... وہ مر گیا۔ کمبخت پیچھے پیچھے بھاگتا تھا۔ بس آ گیا پاؤں کے نیچے۔ اسی کے غم میں رو رو کے جان ہلکان کر رکھی ہے‘‘۔ اتنا کہہ کر بیوی آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر اٹھا اور پیر گھسیٹتا ہوا چھوٹے بیٹے کے پاس پہنچا جو مرے ہوئے چوزے کے غم میں بیٹھا سسکیاں لے رہا تھا۔

اس نے جھک کر بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا بیٹے نے گردن گھما کے دیکھا اور زور زور سے رونے لگا۔

وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

’’نہیں بیٹے! اس طرح نہیں روتے۔ ہم آپ کے لیے دوسرا چوزہ دلا دیں گے‘‘۔

بیٹے نے باپ کو غم گسار پایا تو اٹھ کے گلے لگ گیا اور ہچکیوں سے رونے لگا۔ کچھ دیر تک وہ بیٹے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر ایک دم پوری گرم جوشی کے ساتھ...... روتے ہوئے بیٹے کو سینے سے لگا کے بھینچ لیا اور خود بھی رونے لگا۔

نورالحسنین (اورنگ آباد)

کلمہ گو

ابّو دادا نے ازار بند باندھ کر لُنگی کو کھوٹی پر لٹکایا ہی تھا کہ موبائیل نے رنگیلا رے۔۔۔ کا راگ الاپنا شروع کیا۔ اُس نے فوراً موبائیل اٹھایا اور ہیلو کہتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

’’کیا ابّو بھائی آج کل فارِن کی پوٹیوں کو گھی کھلا رہے۔۔۔؟‘‘

’’ہو میاں۔۔۔ تم کو تو مالوم ہے، اپنا ہے سود ودھ گھی کا دھندہ ہے۔ گاہک آیا تو کھلانا ہی پڑتا۔۔۔ کیا۔۔۔؟‘‘

موبائیل پر قہقہے کی آواز گونجی، ’’ مگر کچھ بھی بولو ابّو بھائی لونڈیا ہے پِستہ ہاؤس کی حلیم۔۔۔ بس چاٹتے رہو۔۔۔!‘‘

’’ارے کیا بکواس لگائے میاں۔۔۔!‘‘ اِبّو دادا نے مصنوعی غصّے سے کہا، ’’ تم کو تو مالوم ہے نا میں ہے سو جمعہ کے دِن کوئی بُرا کام نہیں کرتا، ارے نماز نہیں پڑھتا تو کیا ہوا۔۔۔ ہوں تو کلمہ گو۔۔۔! چلو فون بند کرو، میرے کو آج کچھ اچھّے کاماں کرنے دیو بولا۔۔۔!‘‘

موبائیل کو نہرو شرٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے اِبّو دادا نے جونہی دروازے سے باہر دیکھا، بھاسکر پان کی ٹپری پر کھڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ تیر کی طرح نکلا اور اُس کی گردن دبوچ کر اپنی بیٹھک میں لے آیا۔ اور پھر ایک زور سے جھٹکا دے کر دھاڑا، کیوں رے میرے کو کیا گلا ہوا سیتا پھل سمجھا تھا تو۔۔۔ ہو۔۔۔؟‘‘

’’نہ نہ نہ۔۔۔ نہیں بھائی۔۔۔!‘‘ بھاسکر نے ہاتھ جوڑے اور اُس کے قدموں میں گر گیا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اِبّو دادا کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھنے لگا۔ بھاسکر کے دانتوں کے پیچھے زبان کُلبلا رہی تھی لیکن وہ سارے ہی الفاظ بھول گیا تھا۔

’’تیرے کو مالوم ہے۔۔۔؟ میں ایسا ہی دادا نہیں بنا۔۔۔ بستی میں پوچھ لے۔۔۔ جو میرے کو غچّہ دینے کی کوشش کرتا اُس کے دانتاں بھی اُس کے ہاتھ نہیں گِنتے۔۔۔ کیا۔۔۔؟ دوسرے لوگاں اُٹھا کر اس کی جیب میں ڈالتے۔۔۔ سمجھا۔۔۔؟ اور تو میرے کو چٹّی دینے کی سوچ را۔۔۔ ہو رے۔۔۔؟ دادا کا ہاتھ پوری

طاقت کے ساتھ ہوا میں لہرایا اور پھر بھاسکر کی کھوپڑی پر اُترنے کے بجائے کرسی کے ہتھے پر گرا، ’’ اللہ قسم ۔۔۔میں جمعہ کو کوئی بُرا کام نہیں کرتا۔۔۔بچ گیا تو سالے۔۔۔چل نکال سود سمیت میرے سارے روپیے ۔۔۔؟ ‘‘

خوف ایک بار پھر بھاسکر کی زبان پر گھگھیایا،’’ بھائی۔۔۔میری عورت ۔۔۔!‘‘

’’ تیری عورت ۔۔۔؟‘‘ اِبّو دادا کی آنکھوں میں شانتی کا گدرایا ہوا بھرپور جسم اُبھرا اور شہوت کسی رس گُلّے کی مانند اس کے حلق کو میٹھا کر گئی۔اس کے بدن میں ایک عجیب سی مسرت دوڑنے لگی۔اس دوران بھاسکر نے کیا کچھ کہا وہ اُس نے سُنا ہی نہیں۔وہ بس اُسے گھورے جا رہا تھا۔کچھ لمحوں کے بعد وہ ایکدم چونکا،’’ کیا بول رہا تھا رے تو۔۔۔تیری عورت کو۔۔۔!‘‘

’’بھائی وہ مچان پر سے گِر گئی۔اُس کے ہاتھ کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔۔۔بولکے۔۔۔!‘‘

’’ بول کے میرے کو بھانپ دے رہا کیا۔۔۔؟ ‘‘وہ کرسی پر سے اُٹھ گیا اور ٹہلنے لگا،’’ دیکھ بھاسکر کئی مہینوں سے بہت بہانے بنالیا تو نے۔۔۔اب نہیں چلے گا۔۔۔ابھی سیدھے سیدھے میرے روپیے نکال، نہیں تو کھوپڑی کا گودا نکال کے رکھ دیتوں میں۔۔۔کیا۔۔۔؟‘‘

بھاسکر نے محسوس کر لیا تھا کہ دادا کی ڈپٹ میں اب وہ پہلے جیسا جلال نہیں ہے۔اُس کی آواز کی شدّت بھی قدرے کم ہوگئی تھی۔اُس نے فوراً جیب میں سے سو کا نوٹ نکالا اور اِبّو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا،’’ یہ ایک مہینے کا بیاج ہے بھائی۔۔۔اگلے مہینے۔۔۔!‘‘

’’ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔!‘‘ابّو دادا نے نوٹ کو جیب میں رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا،’’ آج جمعہ کا دن ہے۔۔اللہ کا بڑا دن، سوب کو مالوم ہے میں آج کوئی بُرا کام نہیں کرتا، ارے نماز نہیں پڑھتا تو کیا ہوا رے۔۔مگر ہوں تو کلمہ گو۔۔۔کیا۔۔چل اُٹھ۔۔اِدھر سے انٹی پو ہوا اور بیوی کا علاج کر۔!‘‘

اُس کے ذہن میں پھر ایک بار شانتی کا بدن گھوم گیا، سانولی رنگت، سیاہ گھنے گھنگھریالے بال، اُبھرا ہوا سینہ اور ٹھسا ہوا گوشت ۔۔۔اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور چپکے سے پانی کو حلق کے نیچے اُتار لیا۔

بارکس سے مغرب کی جانب جانے والی سڑک کے آخری حصّے پر پھیلی ہوئی بستی ابو دادا کی سلطنت تھی ۔اُس کے پاس بھینسوں کا ایک بڑا طبیلہ تھا۔جس میں پچیس تیس بھینسیں ہمیشہ بندھی رہتی تھیں ۔اُن کے گوبر اور پیشاب کی بدبو سے صرف طبیلہ ہی نہیں بلکہ ساری بستی متاثر تھی لیکن کسی میں ہمت نہ تھی جو اُس گندگی کے خلاف آواز اُٹھاتا۔طبیلے کے اِدھر اُدھر غریب پس ماندہ طبقات کی جھونپڑیاں تھیں ۔وہ اُن کا مائی باپ تھا۔کوئی شادی بیاہ اُس کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتی تھی۔اُسے سب معلوم تھا کہ کِس جھونپڑے کی کونسی لڑکی سِنِ بلوغ کو پہنچ رہی

ہے۔وہ ان کی فرمائشیں بھی پوری کرتا۔اُن کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتا۔اُن کے جھگڑے ٹنٹے بھی مٹاتا۔وقتاً فوقتاً ان کی پٹائی بھی کرتا رہتا۔اِس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ان کی چھوٹی موٹی ضروریات کی تکمیل بھی کر دیتا۔سڑک کی دوسری طرف کچھ سمنٹ کانکریٹ کی عمارتیں تھیں اور کھپریل کے چھتوں سے آراستہ مکانات کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔جن میں کچھ مزدور پیشہ افراد، کچھ کلرک اور اساتذہ برادری آباد تھی۔اُس کے علاوہ اُسی حصّے میں کنگال نواب کی بوسیدہ دیوڑھی بھی تھی جس کے مہمان خانے کے حصّے کو بوڑھے نواب نے ہوسٹل میں تبدیل کر دیا تھا۔اُس میں اسٹوڈنٹس کرائے سے رہتے تھے۔اُن ہی میں ایک کمرے میں ماریا برونٹ بھی رہتی تھی جو دکنی سلاطین کی ادبی خدمات پر ریسرچ کرنے انگلستان سے یہاں آئی تھی۔اِبّو دادا کا نہ صرف دودھ کا کاروبار تھا بلکہ وہ بیاض بٹّے کا دھندہ بھی کرتا تھا۔اسی وجہ سے ساری بستی کسی نہ کسی طور اُس سے جُڑی ہوئی تھی۔

ایسے ہی ایک دن دوپہر کے وقت جب طبیلے میں بھینسیں جگالی کر رہی تھیں اور ان کے خادم اونگھ رہے تھے اور ابو دادا کرسی پر بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ماریا برونٹ نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور وہ اپنی کرسی سے ایسے اُچھلا تھا گویا کسی نے اس کے حق میں لاٹری کا نتیجہ سنا دیا ہو،’’ آپ ۔۔بی بی ۔۔۔بولے تو میڈم ۔۔۔!‘‘وہ بُری طرح ہکلایا اور اس کی نظریں سفید ٹاپ کے چوڑے گلے کے اندر جھانکنے لگیں۔

’’ ام ماریا برونٹ ۔۔۔!‘‘وہ اپنا تعارف کروانے لگی،’’ اُدھر نواب کے ہوسٹل میں رہتا ہے۔!‘‘ پھر وہ مسکرائی،’’سنا ہے تم انٹریسٹ پر روپیہ دیتا ہے ۔۔۔!‘‘

’’ دیتا ہے۔۔۔آپ اندر آؤ نا۔۔۔!‘‘ دادا کی باچھیں کِھل اُٹھیں۔وہ اندر آ گئی اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی،’’ ام کو دے گا۔۔۔؟‘‘

’’آپ کو۔۔۔؟ آپ کے لیے تو ہم اپنی جان بھی دے دے گا۔۔۔‘‘لیکن یہ الفاظ اُس کی زبان سے نکلے ہی نہیں،’’ دے گا۔۔۔ضرور دے گا میڈم ماریا بروکٹ ۔۔۔!‘‘

’’ بروکٹ نہیں۔۔۔برونٹ۔۔۔ماریا برونٹ ۔۔۔!‘‘

’’ وہی وہی وہی ۔۔۔!‘‘ابو دادا اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

’’ امارا ڈیڈی لندن میں بیمار ہوگیا۔وہ ام کو روپیہ نہیں بھیجا۔وہ بھیجے گا تو ام واپس کر دے گا۔۔!‘‘

دادا کی ہوس بھری نظریں اس کے منی اسکرٹ سے نکلی ہوئی خوبصورت ٹانگوں پر جمی ہوئی تھیں۔

’’ خوبصورت ۔۔۔بہت ہی خوبصورت ۔۔۔!‘‘ وہ بڑبڑایا۔

’’ واٹ ۔۔۔؟‘‘ماریا نے پہلو بدلا۔اُس کے چہرے کے تاثرات بگڑنے لگے، لیکن غرض نفرت پر غالب آ گئی۔اُس نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پا لیا،’’ام کو پانچ ہزار روپیہ منگتا۔۔۔!‘‘

’’ دے گا۔۔۔دے گا۔۔۔!‘‘ ہوس بھری مسکراہٹ اُس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور پھر اپنی

حرکت پر بنا شرمندہ ہوئے اُس نے بھی اپنا تعارف کروایا،'' میڈم جمعہ کو ہم کوئی بُرا کام نہیں کرتا۔۔۔مسلمان ۔۔۔کلمہ گو۔۔۔!''

''اوہ۔۔ریلّی یو آر گریٹ۔۔۔! ''(OH REALLY YOU ARE GREAT) وہ پھر ایک بار دادا کو دیکھ کر مسکرائی ۔ ابو نے پانچ ہزار نوٹوں کا بنڈل اُس کے حوالے کیا اور پھر بولا،'' ہم تم کو بتا دیتا میڈم ۔۔۔ہمارا روپیہ واپس کر دینا۔ہم وصولی کے معاملے میں بہت بُرا آدمی ہے۔۔۔!''

'' اوکے۔۔۔اوکے۔۔۔ہم تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔۔۔تھینک یو۔۔۔!'' وہ ابو دادا کی طرف دیکھ کر پھر ایک بار مسکرائی اور ایک خاص ادا سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

'' سالی سر سے پیر تک اصلی ملائی ہے۔۔۔'' وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔اُس کی آنکھوں میں ماریا برونٹ کی مسکراہٹ ساکِت ہوگئی۔اور دماغ میں بار بار فلیش ہونے لگی اور اس کے حلق میں پھر رس گلّا پھوٹا اور پورا بدن نہال ہوگیا۔خوشی اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔وہ اپنے اس کارنامے کو دوستوں میں بیان کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔اور موبائیل پر کالس کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

عورتوں سے جنسی تعلقات کے جھوٹے سچّے واقعات،غنڈہ گردی،شراب اور پارٹیاں ابو دادا اور اُس کے ساتھیوں کی زندگی کا یہی ماحاصل تھا۔پارٹی اپنے شباب پر تھی شراب کے گلاس کو رکھتے ہوئے ابو دادا نے اپنے دوستوں پر خمار آلود نگاہ ڈالی،'' اللہ قسم باپ۔۔۔لڑکی کیا تھی پلا ریڈی کے دکان کی برفی۔۔۔!''

سب نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

'' میں اگر جھوٹ بولا تو میرے منہ میں ہے سو خاک۔۔۔!'' ابو نے مرغ کی ٹانگ کو دانتوں سے نوچتے ہوئے کہنا شروع کیا،'' اب ہے سو کیا بولوں۔۔۔میں ایک دم اکیلا۔۔۔اُن نے منی اسکرٹ میں۔۔اُس کی ننگی ٹانگیں۔۔۔باپ میری طبعیت ایسی مچلی کہ بس۔۔۔!'' اس نے جلدی جلدی مرغ کی ٹانگ کو چبانا شروع کیا،''اور مالوم۔۔۔چوڑے ٹاپ میں سے جھانکتے ہوئے دو سفید براق کبوتر۔۔۔ائے ہائے۔۔۔میں تو تڑپ کر رہ گیا۔۔۔کیا۔۔۔؟ بس باپ قسمت اچّھی نہیں تھی۔۔۔وہ جمعہ کا دن تھا۔۔۔اور تم کو تو مالوم ہے میں ہے سو اُس دن کوئی بُرا کام نہیں کرتا۔۔۔ارے نہیں تو کیا وہ کبوتر ابو دادا کی بیٹھک سے اُڑتے۔۔۔؟''

'' کیا ابو بھائی اُڑے ہوئے کبوتروں کی کہانی سنا رہے۔۔۔؟'' اجمل نے شراب سے بھرے ہوئے گلاس کو ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

'' بابو۔۔۔تم کیا سمجھ رہیں اِبو کو۔۔۔؟ دانے ڈال دیا نا۔۔۔تم بس ٹوکری کے ڈوری کے کھینچنے کا انتظار کرو۔۔۔!'' اس نے فاتحانہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا،'' ارے بچپن سے یہی کھیل کھیل روّں نا میں۔۔۔!''

''فارن کی عورتاں تو کتے ویسے بھی بہت آزاد خیال رہتی نا ابو بھائی۔۔۔؟'' سبحانی نے ڈکار لے کر اپنی پلیٹ کو سرکا دیا۔

''ارے تم پوری پلیٹ صاف نہیں کرے سبحانی۔۔۔؟'' بلی نے بچی ہوئی بریانی کو اپنی پلیٹ میں اُتار لیا۔''اِبو بھائی چُڑی کے جیسا کھانے والا ان نے فارن کی عورتوں کی آزاد خیالی سے کیا فایدہ اُٹھائیں گا۔۔۔ہو۔۔۔؟''

سب کے منہ سے ایک ساتھ قہقہہ بلند ہوا۔

'' میاں دستر پر کھانا اور بستر پر عورت کو زخمی حالت میں نہیں چھوڑتے۔۔۔!'' اجمل نے شراب کا گلاس ابو کی طرف بڑھایا،'' میرے قصّے نہیں سُنے کیا۔۔۔؟''

'' بس چُپ رہوا جمل۔۔۔!'' سبحانی کی آنکھیں باہر نکل آئیں،''میرا منہ نکّو کُھلا ؤ بولا۔۔۔!''

اجمل کی بھی تیوریاں چڑھ گئیں اور اس سے پہلے کہ مذاق جھگڑے میں تبدیل ہو جاتا بلی نے دادا کو مخاطب کرلیا،'' اِبو بھائی وہ تمہاری والی بہت خوبصورت ہے کیا۔۔۔؟''

'' ارے ہو رے۔۔۔فاری نر ہے نا اُن نے۔۔۔!''

''واہ اللہ میاں واہ۔۔۔ساری خوبصورتی، رنگ، قد و قامت، ناک، آنکھ، نقشہ، بال، مسکراہٹ سوب کچھ اُن کے حوالے کر دیے اور ہماری قسمت میں کیا رکھے بولے تو وہی قلی قطب شاہ والی بات۔۔۔سانولی، کنولی۔۔۔مزے تو بس ابو بھائی کے ہیں۔۔۔کیوں ابو بھائی۔۔۔؟''

اور اِبو کی آنکھیں جیسے آپ ہی آپ بند ہوگیں اور ماریا برونٹ پورے قد کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں اُتر آئی اور وہ تصّورات کی وادیوں میں بہت دور نکل گیا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ابو دادا کا کاروبار زوروں پر جاری وساری تھا۔لیکن اس کے دماغ سے ماریا برونٹ کی وہ تصویر دھندلی نہیں ہوئی تھی۔ پہلے تو وہ چوری چھپے دور سے کنگال نواب کی دیوڑھی کے اُس حصّے کو گھورتا رہتا جہاں سے ماریا اُسے دکھائی دے اور جب وہ نظر نہ آتی تو اُس کا غصّہ بھڑک اُٹھتا اور خواہ مخواہ دوسرے لوگ پِٹ جاتے۔عورتیں تو اب اُس کے نام سے ہی گھبرانے لگتیں لیکن ماریا برونٹ نے دوبارہ اُس کی بیٹھک میں قدم نہیں رکھا تھا اور نا ہی روپیہ واپس کیا تھا۔ایک دن وہ بے خود ہو کر دیوڑھی تک جا پہنچا تھا اور ماریا اُس پر برس پڑی تھی،'' مین MAN تم اِدھر کاہے کو آیا۔ام بولا نا پیسہ آئے گا تو تمہارا ایک ایک پائی ام واپس کر دے گا بٹ تمہارا اِدھر آنا ام کو پسند نہیں۔۔۔گو مین گو۔۔۔ام کو بدنامی نہیں مانگتا۔۔۔ابھی تم اِدھر بالکل نہیں آنے کو مانگتا۔۔۔!''

اور وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے وہاں سے اس طرح نکلا جیسے اُس کو دیکھ کر اُس کے مقروض چھُپتے

چھپاتے بھاگ نکلتے ہیں۔ وہ گھر آیا اُسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ سامنے سُرمے دانی رکھی ہوئی تھی۔ بے اختیار اُس کے ہاتھ اُس طرف بڑھے اور وہ سُرمے کی کاڑی کو آنکھوں میں پھیرنے لگا۔ ٹھیک اُسی وقت اُس کا گُرگا رمضانی داخل ہوا اور اُسے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے بولا ''کیا جمعہ کی تیاری ہے باپ۔۔۔آج تو بھائی آپ گھر سے باہر نکلو چ نکّو۔۔۔سارے پیسے ڈوب جائیں گے۔۔۔!''

اِبو ایک دم بھڑک اُٹھا'' چُپ رے سالے۔۔۔میں ہے سو پہلے ہی ایسے سمندر میں جال ڈال کے بیٹھا ہوں، نہ مچھلی آ رہی نہ جال باہر نکل رہا، اور اوپر سے تو ڈوبونے کی باتاں کر رہا۔۔۔چل حساب دے۔ کتنی وصولی کرا تو۔۔۔؟ وہ نکال۔۔۔!''

رمضانی گھبرا گیا اور نوٹوں کی گڈّی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے طوطے کی طرح سبق پڑھنے لگا'' بھائی راجمّاں سود سمیت پیسے لوٹا دی، کریم ہے سو خالی سود دیا، تاراماں بولی وہ خود شام کو آئے گی، وِنے ماسٹر کا وہیچ رونا تھا، ابھی پگار نہیں ملی، ریڈی پورے پیسے واپس کر دیا، پوچمّاں اصل رقم دے دی، سود شام کو لاتی بولی، وہ شیخ لعل ہے نا بھائی، ارے وہیچ جو سپنا ہیر سلون کے پیچھے رہتا، میرے کو دیکھ کے بھاگنے لگا، میں چیل کے جیسا اُس پر جھپٹا اور پورا قرضہ وصول کر لیا بھائی، اور وہ نرسمہا ہے نا۔۔۔اُس کے پیسے میں چھین لیا تو اُن نے رو رہا تھا۔ کاہے کو بولے تو کتے بچّے کے امتحان کی فیس بھرنا تھی۔۔۔ارے ہم کو کیا کرنا ہے۔۔۔ہے نا بھائی۔۔۔!''

''رمضانی تم ہے سو مسلمان ہے نا۔۔۔؟ ارے اللہ میاں حکم دیا نا کہ علم کو عام کرو، اور تم اُس کو پڑھنے سے روک دیے۔۔۔؟ ابھی جاؤ اور نرسمہا کو میرے پاس بھیج دو۔۔۔میرے کو تمہارا یہ کام ہے سو پسند نہیں آیا۔۔۔!''

''بہت اچّھا بھائی۔۔۔آگے سنو۔۔۔!''

ابو دادا نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ پھر شروع ہو گیا'' وہ چندن ہے نا بھائی۔۔۔بس دیکھو اُن نے میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ بہت ڈھونڈا اُس کو کہاں چھپ گیا کیا ہے کی۔۔۔اور بھائی وہ فارن ماڈل۔۔۔!''

''تم کو اُس کے پاس جانے کا بولا تھا میں۔۔۔؟'' ابو دادا کی آنکھیں چڑھ گئیں۔

'' ارے میں کدھر اُدھر گیا۔ بھائی بس تم کو یاد دلا دیا۔۔۔!''

ابو خاموش ہو گیا۔ اس کے دماغ میں پھر فلیش شروع ہو گئے تھے۔

'' بھائی میں سوب سمجھ رؤں۔ آپ اُس لونڈیا سے پیسے کیوں نہیں وصول کر رہے۔۔۔!'' رمضانی نے سیدھی آنکھ دبائی اور اس کے چہرے پر شرارتی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ارے نہیں رے۔۔۔!'' ابو نے جھینپتے ہوئے جواب دیا'' ابو دادا نے آج تک کسی پر ایک دمڑی بھی نہیں چھوڑا۔۔۔!''

'' ہو بھئی۔۔۔! میں شانتی کو بھی ایسے ہی رات کو آپ کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔۔!''

'' آں۔۔۔'' ابو نے چونک کر رمضانی کی طرف دیکھا'' تم رات کو میرے گھر کے سامنے کیا کر رہے تھے۔۔۔؟''

''ارے کون کیا کر سکتا ہے۔۔۔؟ جو میری ہمت۔۔ بھائی میں پکچر دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔۔۔مگر بھائی وہ فارِن ماڈل کی بات ہی کچھ اور ہے۔۔'' رمضانی نے کہنے کو تو یہ جملہ کہہ دیا تھا لیکن اُسے ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے دادا کی طرف دیکھا لیکن دادا وہاں پر کہاں موجود تھا۔ وہ تو ماریا برونٹ کے ساتھ دور کہیں تصّورات کی وادیوں میں پہنچ چکا تھا۔

رمضانی کچھ دیر تک چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا اور پھر بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

''ارے اِبّو بھائی۔۔۔!'' اچانک سوامی بیٹھک میں داخل ہوا'' وہ بھوری بھینس بہت الڈا رہی ہے۔ مانج پر آ گئی ہے لگتا۔ اُس کا انتظام کرنا ہی ہڑے گا۔۔۔!''

''بھوری بھینس۔۔۔!'' ابو دادا نے من ہی من میں دُہرایا۔ جانور بھی خوب ہوتے ہیں۔ اپنے کسی جذبے کے لیے اُنھیں کسی پردے کی ضرورت نہیں۔۔۔اظہار کے لیے کوئی تکلف نہیں۔۔۔ایک بھوری کا میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔۔۔مگر۔۔۔وہ چپ چاپ اُٹھا اور سوامی کے ساتھ ہو لیا۔ جھونپڑیوں کے باہر زندگی بہہ رہی تھی۔ کوئی چولھے کے سامنے تھا، کوئی کپڑے دھو رہا تھا، کوئی اناج چُن رہا تھا تو کوئی کپڑوں کے پردوں کی آڑ میں نہا رہا تھا۔ پالتو کُتّے اور بکریاں اِدھر اُدھر منہ مار رہے تھے۔ مرغ بے وقت اذانیں دے رہے تھے اور ابو دادا کی نظریں کنگال نواب کی دیوڑھی کے اُسی حصّے پر ٹِکی ہوئی تھیں۔ بستی کی کنواری لڑکیاں چور نظروں سے کبھی ابو دادا کی طرف اور کبھی طبیلے سے آتی ہوئی بھوری بھینس کے سوز میں ڈوبی ہوئی آوازوں کو سُن رہی تھیں۔

وہ دونوں طبیلے میں پہنچے۔ کشور جانور لانے چلا گیا تھا۔ سوامی نے بانسوں کے جنگلے میں بھوری بھینس کو پھنسا دیا تھا۔ اُس کے ڈکرانے کی آوازیں بدستور جاری تھیں۔ ابو دادا نے طبیلے کی ٹوٹی دیوار سے گردن اوپر کی تو اُس کی نتھنوں میں ماریا برونٹ کے پرفیوم کی مست کر دینے والی خوشبو مہکنے لگی۔ وہ گردن اونچی کیے اُسی طرف بہت دیر تک اُس خوشبو کو سونگھتا رہا۔ اُس کے پورے بدن میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا اور آنکھیں خمار سے بھاری ہونے لگیں۔ اُس نے پھر ایک بار بھوری بھینس کی طرف دیکھا تو اُسے وہ نظر آیا جو کسی اور کو نظر ہی نہیں آ سکتا تھا۔ وہ وہاں سے چپ چاپ اپنی بیٹھک کی طرف لوٹ آیا اور کرسی پر ڈھیر ہو گیا لیکن پرفیوم کی خوشبو اب بھی اُس کے نتھنوں میں مہک رہی تھی۔ اُس نے پھر ایک بار اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی تصوراتی وادیوں کی طرف نکل گیا

۔۔۔دور۔۔۔بہت دور۔۔۔بہت دور۔۔۔

اچانک اُس کے کانوں میں بھوری بھینس کے ڈکرانے کی آواز گونجی اور اُس نے فوراً اپنی آنکھیں

کھول دیں۔سامنے ماریا برونٹ کھڑی تھی۔اُس نے دروازہ بھی بند کرلیا تھا۔

’’ آپ۔۔۔آپ۔۔۔!‘‘وہ بُری طرح ہکلایا۔

ماریا برونٹ کے چہرے پرآج کچھ اور ہی تھا۔

بھوری بھینس پھر ایک بار ڈکرائی۔

ابو دادا کی ٹانگوں میں عجیب سی اکڑن بیدار ہونے لگی۔

’’ مین (MAN) ہم جانتا ہے۔آج جمعہ کا دن نہیں ہے۔امارا روپیہ نہیں آیا،اور اب کبھی آئے گا بھی نہیں۔۔۔!‘‘ اُس کی آواز بھرا گئی،’’ کیونکہ امارا ڈیڈی مر گیا اور ہم کو لندن واپس جانا مانگتا۔۔۔‘‘

منی اسکرٹ کے باہر اُس کی ننگی خوبصورت ٹانگیں مسلسل پہلو بدل رہی تھیں اور ابو دادا کا خون کسی سیلاب کی مانند بدن کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔

’’مین۔۔۔ہم انگریز کمیونٹی کبھی کسی کا احسان نہیں رکھتی۔امارے پاس جو کچھ تھا اُس سے ام سب کا پے منٹ (payment) کر دیا۔ابھی تمہارا پے منٹ کرنے امارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ام جانتا۔۔۔تم روپیہ کے بدلے ام سے کیا چیز لے گا۔ام وہ تم کو انٹریسٹ کے ساتھ دینے کو آیا ہے۔۔۔کم آن۔۔۔وصول کرلو۔۔۔!‘‘

اُس کے ہاتھ تیزی سے ٹاپ کے بٹنوں کی طرف اُٹھے اور وہ اُنھیں ایک ایک کر کے کھولنے لگی۔ابو دادا تیزی سے کرسی پر سے اُٹھا۔اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔وہ آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ماریا برونٹ نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ابو اس کے قریب پہنچا پھر اُس کے ہاتھ اُس کے ٹاپ کی طرف بڑھے۔

بھوری بھینس کا گلا رُندھ گیا تھا۔

اِبو دادا نے اُس کے کھلے بٹنوں کو ایک ایک کر کے بند کرنا شروع کیا۔وہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ابو کے چہرے پر اب بھی وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔پھر اُس نے آہستہ سے کہا،’’ماریا۔۔۔ہم بھی مسلمان ہیں۔۔۔کلمہ گو۔۔۔کس چیز کی کیا قیمت ہوتی ہے وہ ہم بھی جانتا ہے۔۔۔!‘‘ پھر اُس نے اُس کے ہاتھ کو آہستہ سے پکڑا۔دروازہ کھولا اور اُسے نہایت خلوص کے ساتھ باہر کر دیا۔

ماریا نے جاتے جاتے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا۔اُس کے چہرے پر آج کچھ اور ہی مسکراہٹ تھی۔اُس نے پھر ایک ادائے خاص سے ہاتھ ہلا کر ابو دادا کو خدا حافظ کہا اور اپنے قدموں کی رفتار بڑھا دی۔

ابو کی آنکھوں میں ماریا برونٹ کی مسکراہٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگئی۔۔۔

ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)

بانجھ

اور پھر شمیم کو لگا جیسے کوئی گولا سا اُٹھا اور سینے کے بیچ کہیں سے بہتا ہوا اُترا اور پیٹ کے نچلے حصے میں آ کر پھنس گیا ہے۔شمیم نے خوفزدہ آنکھوں سے اپنے بدن کے نچلے حصے کو لیٹے لیٹے دیکھا۔اُسے لگا جیسے کوئی مکھی اُس کی ناف پر بیٹھی ہوئی ہے۔شمیم نے بے چین ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے مکھی کو ہٹایا چاہا مگر پھر اُسے لگا جیسے وہ مکھی نہیں اُس کی اپنی ناف ہے جو بے ہنگم طریقے سے پیٹ سے باہر نکل رہی ہے۔نمکین پانی کا ایک بڑا سا ریلا نہ جانے کہاں سے اُس میں سے اُٹھا اور پھر اُس کی آنکھوں کے کناروں سے ڈھلک کر اُس کے دل میں اُترنے لگا۔شمیم نے ایک گہری سانس لینی چاہی مگر اُسے لگا جیسے اُس کی سانس آری بن کر اُس کے بدن کے نچلے حصے کو کاٹ رہی ہے اور اُس سے اُٹھنے والا درد انگارے بن کر اُس کے بدن کے رُوئے رُوئے میں دھک رہا ہے۔شمیم کو لگا جیسے اُس کا پیٹ کے اندر کا گولا نیچے اُترنے کے بجائے اُوپر ہی اوپر اُٹھتا جا رہا ہو اور اب اُس کی ناف پیٹ میں کہیں غائب ہو کر محض ایک دھندلا سا نشان بن کر رہ گئی ہے۔۔شمیم نے پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا اور پھر ڈر کے مارے آنکھیں بھینچ لی۔

کچھ ہی دیر میں شمیم کو یوں محسوس ہوا جیسے نسیم کے دونوں ہاتھ اُس کی بند آنکھوں سے پسل کر اُس کے گالوں کو چھو رہے ہیں اور اُس کی گرم سانسوں کی تپش سے اُس کے کانوں کی لویں جل رہی ہیں اور پھر ایک بھڑکتی ہوئی آگ آناً فاناً اُس کے ہونٹوں کو دہکانے لگی اور پھر اُس سے اُٹھنے والی چنگاریاں شمیم کے سارے بدن میں شرارے بن بن کر پھیلنے لگی۔شمیم نے ڈرتے ڈرتے دھیمے سے اپنی آنکھیں کھولی تو نسیم کی مردانہ بانہوں کو اپنی گردن کے گرد گلاب کے دہکتے رنگوں کی طرح پایا۔اچانک ایک نمکین سی مسکان اُس کے لبوں پر پھیلی اور خوف اُس کی بند مٹھیوں سے تتلیاں بن کر اُڑ گیا۔شمیم نے اپنی مٹھّیاں کھولی تو تتلیوں کے رنگوں سے اُس کی ہتھیلیاں ست رنگی ہو رہی تھی۔نسیم نے دونوں بانہوں میں شمیم کو پیار سے بھر لیا اور کھنکتی ہوئی آواز سے اُس سے سرگوشی کی۔۔’’تم کو پتہ ہے شمیم، ہتھیلی پر اُترے ان رنگوں میں تیرا رنگ کونسا ہے اور میرا کونسا؟‘‘شمیم نے نسیم کی بانہوں میں سمٹ کر اپنی ہتھیلی پر بکھرے ہوئے رنگوں کو کچھ اور گہرا کیا اور اُسکے پیار میں ڈوبتے ہوئے کہا ’’میری اور تیری ہتھیلی پر گلابی اور آسمانی رنگ الگ الگ نہیں ہیں‘‘۔۔تو محبت۔۔نسیم نے شمیم کی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں

پھنسا کر کہا ''محبت کا کیا رنگ ہے شمیم؟ وہی جو خدا کا ہے، جو مرد ہے نہ عورت۔۔'' شمیم نے یہ کہ کر اپنی آنکھیں دھیمے سے بند کر لی اور پھر نسیم کی محبت میں جذب ہوتا چلا گیا۔کچھ ہی دیر میں ان گنت ستاروں کی کہکشاں شمیم کی بند آنکھوں میں اُتر آئی۔گرم سانسوں کی ٹھنڈک دونوں کی روحوں میں پیار بن کر اُترنے لگی۔دہکتے ہونٹوں کی نرماہٹ لذت بن کر اُن کی محبت کی پیاس بجھانے لگی۔شمیم کو لگا جیسے اُس کی مٹھیوں سے اُڑنے والی خوف کی تتلیاں محض محبت بن کر رنگوں سے بے نیاز ہوگئی ہیں اور برہنہ ہو کر اُن کے دلوں کو پھولوں کی طرح بوسے دے کر شرما رہی ہیں۔۔اور پھر دونوں بدن کچھ ہی دیر میں محض محبت بنتے چلے گئے۔

شمیم نے ڈوبتے دل سے سے جو پھر پیٹ کو دیکھا تو اُسے لگا جیسے اُس کی ناف پر مکھی کی جگہ دومنہ کا سانپ بیٹھا ہوا ہے۔اُس کا پیٹ پہلے سے پھول کر اُس کے سینے سے بھی اونچا ہو گیا ہے۔اُسے لگا جیسے اُس کے پیٹ کے اندر بہت سارے کیڑے ایک ساتھ رینگ رہے ہیں اور ناف کو چھید چھید کر باہر آنا چاہ رہے ہیں اور جونہی کوئی کیڑا رینگتا ہوا پیٹ سے سے باہر نکلتا تو ناف پر بیٹھا ہوا دومنہ کا سانپ یک لخت اُس کو زندہ سالم ہی نگل جاتا ۔۔شمیم کو لگا جیسے اُس کی بند آنکھوں سے آنسو باہر آنے کے بجائے جلد کے مساموں سے چھلک چھلک کر نکل رہے ہیں اور اُس کا دل گہرے کھارے پانی کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے اور وہ آخری سانسیں لے کر خود کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

شمیم نے بے بسی سے تتلیوں کو اپنی دونوں مٹھیوں میں اس قدر زور سے بھینچا کہ اُن کے رنگ لہو کے رنگ سے بدل گئے۔۔خدایا۔۔اُس کے گھٹی گھٹی چیخیں ہونٹوں سے باہر آنے کے بجائے سینے میں جمع ہو کر پیٹ کو اند سے دبانے لگیں۔شمیم کو لگا جیسے پیٹ کے اندر کا گولا اُس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کو اپنے اندر نگل رہا ہے اور اُس کی پیٹ میں رینگتے ہوئے کیڑے ناف پر بیٹھے دومنہ کے سانپ کی پرواہ کیے بغیر جلد کے ہر ایک مسام سے آنسوؤں کے ساتھ بہہ بہہ کر باہر آرہے ہیں۔شمیم نے روتے ہوئے سرخ انگارہ آنکھوں سے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا اور پھر بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کر لی اور شمیم کو لگا جیسے اُس کے پیٹ سے اُٹھنے والا گولا پیٹ کے نچلے حصے سے سرک کر سینے کے بیچ کہیں آ کر پھنس گیا۔

کچھ دیر تک شمیم چُپ چاپ لیٹے لیٹے چھت کو تکتا رہا اور پھر کروٹ بدل کر اُس نے نسیم کو دیکھا جو خود کو شمیم کی بانہوں میں دے کر سارے جہاں کے دکھ وسکھ سے بے نیاز سکون سے سو رہا تھا مگر اُس کے ہونٹوں کی نمکین مسکراہٹ پلکوں کی کناروں پر کانپتے ہوئے آنسوؤں سے مل کر ایک عجیب منظر بنا رہی تھی۔۔اُس نے دھیمے سے اپنے پیٹ کو چھوا اُسے لگا جیسے اُس کے پسینے سے سارے بدن تر ہے۔اُس نے ڈرتے ڈرتے اپنی ناف پر انگلی پھیری جہاں پیٹ کے چند بال پسینے میں بھیگے ہوئے بے ترتیبی سے چپکے ہوئے تھے۔اُس نے دھیمے دھیمے نسیم کے سینوں کے بالوں میں انگلیاں پھیری اور پھر اُس کی انگلیاں پھسلتے ہوئے نسیم کے ناف تک جا پہنچی اچانک اُس کو لگا جیسے نسیم کے ناف پر کوئی مکھی بیٹھی ہوئی ہے۔شمیم نے خوفزدہ نظروں سے نسیم کے بدن کے نچلے حصے کو لیٹے لیٹے دیکھا اُسے لگا جیسے جیسے وہ مکھی نہیں نسیم کی اپنی ناف ہے جو بے ہنگم طریقے سے پیٹ سے باہر نکل رہی ہے۔۔۔

ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)

پھٹا ہوا دامن

بس ایک لمحے کی تو بات تھی اچانک کیٹ واک کے دوران نہ جانے کیسے زرینہ کا پاؤں اُس کی چار انچ لمبی سینڈل کی ہیل میں الجھا اور پھر وہ لاکھ چاہنے کے باوجود خود کو بیلنس نہ کر سکی اور قلابازیاں کھاتے ہوئے ریمپ سے سیدھا شائقین میں جا گری۔زرینہ کو کیا پتہ تھا کہ اچانک یہ ایک چھوٹا سا کڑا لمحہ صدیوں کی تاریخ خود میں سمیٹ کر اُسے زرینہ سے زلیخا میں بدل دے گا۔۔

ابھی کچھ ہی دیر پہلے کی تو بات تھی کیٹ واک پر جانے سے قبل زرینہ خود کو ڈریسنگ مرر میں کتنے پیار سے تک رہی تھی۔پہلے پہل تو اُس نے مسکرا کر اپنے خوبصورت شانوں کو تھوڑا سا پیچھے کیا تھا اور پھر دھیمے سے سانسوں کو ادھورا روک کر اپنے جواں سینے کو تھوڑا اور نمایاں کیا تھا اور پھر پیٹ کے مسلز (muscles) کو آہستہ سے اندر کھینچ کر نازک سی کمر کی کمان پر اپنے حسین بل کھاتے بدن کو کسی تیر کی طرح یوں تان لیا تھا کہ خود زرینہ کو پل بھر میں ایسے لگنے لگا تھا جیسے اُس کی اپنی نگاہیں اُس کے جسم کے قاتل زاویوں میں الجھ کر واپسی کے سارے راستے بھولتی جا رہی ہے اور پھر اپنے باڈی پاسچر (Body posture) سے مطمئن ہو کر زرینہ نے اپنے سراپے پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی۔اُس نے اپنے لوز کرل ہیراسٹائل (Loose Curl Hairstyle) کو چاروں سمتوں سے گھوم کر دیکھا تھا اور پھر مسکارے سے جڑی ہوئی لمبی لمبی پلکوں کے دریچوں کو اپنی نیلی نشہ ور آنکھوں پر کچھ اسطرح سے دھیمے سے کھولا تھا کہ آئی لڈز (Eye Lids) پر سجے ہوئے تمام تر آئی شیڈز (Eye shades) ستاروں کی طرح چمکنے لگے تھے اور پھر اپنے سرخی مائل تمتماتے گالوں میں بننے والے چھوٹے چھوٹے ڈمپل کے اردگرد بلوشن (blush on) اور لپ گلوز کا (Lip gloss) ایک اور کوڈ اپنے ہونٹوں پر پھیر کر اُنہیں پھر سے سجا لیا تھا۔

جب فیشن شو کے ڈور پر کھڑے ڈریس ڈیزائنر یوسف نے آنکھ کے خفیف اشارے سے تمام ماڈل گرلز کو ریمپ پر جانے کا اشارہ کیا تھا تو وہ بھی دھڑکتے دل کے ساتھ قطار میں شامل ہو گئی تھی۔مگر اس سے قبل کہ وہ کیٹ واک شروع کرتی، یوسف نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے لمحے بھر کے لیے روکا تھا اور اُس کو سر سے پاؤں تک اس طرح سے بغور دیکھا تھا جیسے کوئی زیرک سیلز مین اپنے مال کی دل چاہی قیمت لگا کر بازار میں خوب سجا سنوار کر امید بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔رنگ برنگی جھالروں میں بٹے ہوئے بلاؤز اور اسکرٹ کی وجہ سے زرینہ

کا جواں بدن ویسے ہی نیم برہنہ ہوکر قیامت ڈھا رہا تھا مگر شاید یوسف کی نظر میں اُس کے کپڑوں میں بہتری کی ابھی تھوڑی سی گنجائش باقی تھی۔اس آخری لمحے میں جب زرینہ ریمپ پر جانے کے لیے بے قرار ہورہی تھی کہ نہ جانے یوسف کے دل میں کیا خیال آیا کہ اُس نے زرینہ کے بلاؤز اور اسکرٹ سے کچھ جھالریں اور کم کر دیں اور پھر فیشن شو کا ڈور زرینہ کے لیے کھول دیا تھا۔

ریمپ پر آتے ہی زرینہ نے سرسری سی نگاہ فیشن شو کے شائقین پر ڈالی اور پھر جونہی اُس نے کیٹ واک شروع کی اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے کمانی دار جسم کے سرکش زہر آلود تیر ایک ایک کر کے شائقین کے دلوں کو زخمی کر رہے ہیں ۔اُن کے بے بس خون آلود دل سے کراہنے والی آرزوئیں، زرینہ کے دل کو ایک انجانے احساس سے روشناس کر رہی تھیں۔کیمروں کی فلش لائیٹ اور ریمپ کے چاروں طرف لگے رنگ برنگی بجلی کے قمقمے اُس کے ہوش ربا حُسن کے سامنے ماند پڑتے جا رہے تھے۔جوں جوں زرینہ واک کر کے ریمپ کے کارنر کی طرف بڑھنے لگی اُسے یقین ہوتا جا رہا تھا جیسے فیشن شو میں بیٹھے ہوئے شائقین کی نظریں اُس کے نیم برہنہ بدن پر لپٹی جھالروں سے ٹکرا کر واپس لوٹنے کے بجائے اُس کے بدن کے زاویوں میں الجھتی جا رہی ہے۔کچھ لمحوں کے لیے تو اُسے یہ بھی عجیب وغریب خیال بھی آیا جیسے ڈریس ڈیزائنر یوسف کی فیشن شو کے تمام شائقین کے ساتھ کچھ نہ کچھ ملی بھگت ہے اور اُس نے شائد جان بوجھ کر کیٹ واک سے قبل اُس کے بلاؤز اور اسکرٹ کی جھالریں کم کی تھی ۔اور پھر اچانک زرینہ کو یوں لگا تھا جیسے شائقین میں بیٹھے ہر ایک شخص کی شکل ڈریس ڈیزائنر یوسف کی جیسی ہوگئی ہے اور ریمپ پر چلنے والی ہر ایک ماڈل گرل زرینہ کے سراپے میں ڈھل گئی ہے جن کے لباس کے دامن اُس کی طرح چاک ہیں۔اُسے یوں بھی لگا جیسے یہ فیشن شو دراصل لباس کے ایڈورٹائزمنٹ کی جگہ انسانی جسموں کی نمائش کا بازار ہے،شاید صدیوں پہلے کا بازارِ مصر، جہاں کبھی یوسّف کو بیچا گیا تھا۔۔اس عجیب وغریب خیال کے آتے ہی زرینہ کو محسوس ہوا جیسے اُس کا دل تاریخ کے گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے مگر۔۔فیشن شو کے شائقین سمجھے جیسے زرینہ کا پاؤں اچانک اپنی سینڈل کی ہیل میں پھنس گیا ہے اور وہ لاکھ چاہتے ہوئے اپنا بیلنس قائم نہیں کر پا رہی ہے اور بالاخر ریمپ سے قلابازیاں کھاتے ہوئے اُن کے درمیاں گرتی چلی گئی۔

زرینہ کو کیا پتہ تھا کہ اچانک یہ ایک چھوٹا سا کڑا لمحہ صدیوں کی تاریخ خود میں سمیٹ کر اُسے زرینہ سے زلیخا میں بدل دے گا۔اُس چھوٹے سے لمحے میں جب زرینہ اوروں کے لیے بے ہوش ہو کر ریمپ سے شائقین میں گری تھی ،اُسی لمحے تو زرینہ، زلیخا میں بدل کر بازارِ مصر پہنچ گئی تھی اور یوسّف کا دامن پیچھے سے پکڑ کر چیخ رہی تھی کہ میں نے تمھارا دامن تو پیچھے سے پھاڑا تھا مگر تم تو نبی تھے نا! دیکھو تمھاری خود کی خاطر کی گئی جرح سے، میرا دامن ہمیشہ کے لیے پیچھے آگے دونوں ہی طرف سے پھٹ گیا ہے۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

مکافات

یوں بھی نہر جلال دینو چوڑی بھی عام نہروں سے بڑھ کر تھی اور گہری بھی بہت تھی ۔اس کا بہاؤ بھی بہت تیز تھا۔بہتی کیا تھی۔ بے لگام گھوڑی کی طرح اپنے دونوں کناروں سے مستی کرتی اور کٹاؤ ڈالتی، اچھلتی کودتی آگے بڑھتی رہتی اور اس وقت تک قرار نہیں کرتی جب تک سندھو دریا اسے اپنے آغوش میں لے کر بحیرہ عرب میں گُم نہیں ہو جاتا۔

اگر آپ کو یاد نہ ہو یا آپ نہیں جانتے ہوں تو میں بتا دوں کہ اس نہر کا نام پہلے اللہ دینو کینال تھا۔جس کو خلق نے بدل کر جلال دینو کر دیا تھا۔اب آپ سوال کریں گے کہ جلال دینو یا جلال دینا کون تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جلال دینا ولد کمال دینا، ساکن دیہہ ٹنڈو مستی ، گوٹھ مستان شاہ ضلع بدین، صوبہ سندھ، سٹی مجسٹریٹ، عدالت سیشن ، ہائی کورٹ سندھ، اپیلیٹ ٹریبونل اور عدالتِ عالیہ پاکستان کے ریکارڈ کے مطابق قتل عمد کا مجرم تھا جس نے باہوش وحواس بہیمانہ انداز میں جرائم کا ارتکاب کیا اور قتل کیئے اور سولی پر لٹکایا گیا۔

اس سے پہلے کہ آپ بیان کردہ صورت حال کو ناقابل قبول پا کر سوالات کا ایک سلسلہ شروع ممکنہ اختصار سے اپنی دستیاب معلومات پیش کرنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ آپ سوالات سے اور میں جوابات سے امان پاسکوں۔

جلال دینو ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ہیڈ پیون تھا۔دفتر کے باہر وہ بنچ یا کرسی پر وہ نیلی شیروانی یا واسکوٹ پہنے اور سر پر طرّہ لگائے بیٹھا کرتا تھا۔ایک دو کو چھوڑ کر ڈپٹی کمشنر کے دفتر حاضری دینے والا سب سے پہلے اس کو سلام کرتا۔دیہاتی لوگ تو اس کے آگے اپنا سر بھی جھکا دیا کرتے۔اس کی شخصیت بھی خاصی شاندار تھی۔دراز قد، چوڑا سینہ ، گول اور مضبوط شانے ، گندمی رنگ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی روشن آنکھیں، کالی مونچھوں کے زیرِ سایہ موٹے موٹے ہونٹ، مضبوط جبڑا، اور سخت ٹھوڑی پر خشخشی ڈاڑھی۔ وہ لوگوں کی بھیڑ میں بھی سب سے الگ، سب سے نمایاں نظر آتا۔اس کی آنکھوں کے آگے کسی کی آنکھیں ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ان آنکھوں نے اس کو معمولی سے غیر معمولی بنا رکھا تھا۔تھا تو وہ معاشرے کا اور اس دفتر کا کمتر فرد۔لیکن تھا کچھ ضرور۔یوں بھی اس میں کچھ تھا۔جب کوئی اسکے ہاتھ میں کاغذ کا کوئی نوٹ تھماتا۔جب کوئی اس کے ہاتھ میں کاغذ کا کوئی نوٹ تھماتا تو وہ بغیر کسی

اظہارِ تشکر لیتا۔اگر وہ ان روایتوں اور رواجوں کا پلا نہ ہوتا تو شاید لینے سے بھی انکار کر دیتا۔اس کی زندگی بغیر کسی قابلِ ذکر واقعے کے گزرتی جارہی تھی۔اور اس کو چالیس کے پیٹھے میں پہنچا چکی تھی۔اسکی گھریلو زندگی بھی پر سکون تھی۔وہ ڈپٹی کمشنر کے بنگلے میں آؤٹ ہاؤز میں قیام پذیر تھا اپنی بوڑھی ماں اور جوان بیوی کے ساتھ اس کے اپنی کوئی اولاد نہ تھی ۔کوارٹر میں ڈپٹی کمشنر کی ذاتی گاڑی کے ڈرائیور کی بیٹی جانیہ اس کے ساتھ کھیلتی کودتی رہتی تھی۔وہ اپنے گھر کے علاوہ جلالدینو کے گھر کی بھی رونق تھی۔یہ سب تو ٹھیک تھا لیکن آس پاس کے معاملات خاص طور پر گاؤں اور دیہاتوں کے پر سکون نہیں تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے سارا ماحول تیزی سے بدلا۔آدمیوں کے باہر بھی اور اندر بھی۔جلال دینو کی روشن آنکھیں ایسا کچھ دیکھنے لگیں،اس کے کان ایسا کچھ سننے لگے جس کا وہ عادی نہ تھا۔وہ ایک چھوٹا آدمی جو بڑے،بہت بڑے آدمیوں میں گھرا کھڑا تھا۔اس کا اندر کا آدمی اپنے باہر کے آدمی کو نکلتے ہوئے قد کے باوجود بوناتے ہوئے محسوس کر رہا تھا اس نے مسجد میں ادائیگی سجدے کے دوران خالقِ کائنات ماتھا ٹیکنے اور ناک رگڑنے کے ساتھ مدد کی درخواست کی تھی۔ادائیگی نماز کے بعد تو اس پر رقت طاری ہوگئی اور وہ چیخ چیخ کر رونے اور مدد مانگنے لگا۔اس نے شہر کے سب سے بڑے رئیس،تاجر،صنعت کار اور مِل مالک سیٹھ حشمت کو ڈپٹی کمشنر سے باتیں کرتے سنا اور جو کچھ اس کے کانوں نے اس تک پہنچایا اس سے وہ ایک دوسرا ہی آدمی بن گیا۔اس کے اندر کا چھوٹا آدمی ایک دم بڑا اور اہم ہوگیا۔ اس چھوٹے آدمی نے اس علاقے کے سب سے بڑے آدمی سے پہلی مرتبہ مقابل ہو کر بات کی۔اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں بہ یک وقت دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی التجا بھی تھی اور شعلہ بار دھمکی بھی۔

''اس علاقے میں تیرا اپنا کون ہے۔؟'' سیٹھ حشمت نے جلال دینو کو اس کی اوقات کے اندر لانے والے لہجے سے مخاطب کیا۔

''میرے تو سب اِدھر ہی ہیں۔کوئی بندہ میرا اُدھر نہیں ہے۔ جلال دینو کچھ مسکینی اور کچھ گستاخی کے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

''پھر تو بک بک بند کر اور اپنی اوقات میں رہ۔کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے یہ ڈپٹی کمشنر صاحب ہم سے بہتر جانتے ہیں۔''سیٹھ حشمت نے بات کا سلسلہ ختم کرنے کے انداز میں کہا۔اور ساتھ ہی چوکیدار زرک خان کو آواز دی کہ جلال دینو کو لے جائے۔

''یہ آپ لوگ بہت غلط کر رہے ہو جی۔۔۔۔۔نا انصافی کر رہے ہو جی۔۔۔۔۔قہرِ الٰہی سے ڈرو جی۔۔۔۔قہرِ الٰہی سے ڈرو۔۔۔۔''انتہائی مجبوری کے عالم میں ہاتھ ملتا ہوا کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ وہ جلدی میں تھا اس نے پڑوس کی کوٹھی کے چوکیدار سے سائیکل مستعار لی اور تیزی سے پیڈل مارتا ہوا ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچا۔سائیکل پٹخ کر ڈی سی صاحب کی بیرونی بیٹھک سے گزر کر صدر بیٹھک میں بغیر اجازت گھس پڑا۔ڈی سی صاحب ایک گوشے میں رکھی ہوئی میز کرسی پر کچھ کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔جلال دینو صاحب کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا۔اپنے قدموں پر گرے ہوئے جلال دینو کے سر کو ٹھوکر سے بچاتے ہوئے ڈی سی صاحب فوراً طور

پر کھڑے ہوئے،کاغذات اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر ،کوٹھی کے اندر کے حصّے میں جاتے ہوئے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ ''اللہ دینا! تو پاگل ہوگیا ہے۔۔۔جو ہونا ہے ہو چکا۔۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔'' اللہ دینا کچھ دیر اسی طرح پڑا رہا اور پھر باہر چلا گیا۔اس کا نکلتا ہوا قد کچھ اور نکل گیا تھا۔گردن اکڑ گئی تھی۔سر اوپر اٹھ آیا تھا۔اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

اس کے فوراً بعد قیامت سے پہلے ایک اور قیامتِ صغریٰ آ کھڑی ہوئی،صنعتی علاقے اور خاص طور پر سیٹھ حشمت کی ملوں اور فیکٹری کو بچانے کی خاطر،پاکستان کی معیشت کو ترجیح دیتے ہوئے اللہ دینو کینال پر چھوٹے ننواب کے نام پر تعمیر شدہ قدیمی بند علی مراد توڑا جا چکا تھا پلک جھپکتے میں شہر،بڑے گاؤں،بے شمار نام والے اور بے نام دیہات زیرِ آب آ چکے تھے۔خلقِ خدا،آدمی،مویشی ،کھیت،کھلیان،کچے کوٹھے پکے کوٹھے سب غرق ہوگئے۔ملک کے غریب عوام سے ایک مرتبہ پھر جانو مال کا جبری نذرانہ وصول کیا جا چکا تھا۔سب کچھ روایات،ریتی رِواج،اور معمول کے مطابق انجام پا چکا تھا۔ماسوا ایک معمول کے خلاف واقعے کے،جلال دینو نے پولس چوکی میں اپنی گرفتاری پیش کر دی تھی۔۔۔تھانہ منشی پولس تھانہ (غربی) ضلع بدین اکبر علی لاکھانی نے ملزم کا اقبالی بیان قلم بند کیا تھا جس کے مطابق اللہ دینا نے باہوش وحواس ڈپٹی کمشنر بدین (غربی) جناب کفایت اللہ ولد عنایت اللہ اور سیٹھ رئیس حشمت اللہ ولد رحمت اللہ کا خون کر دیا۔ملزم افسرِ مذکورہ بالا اور سیٹھ رئیس مندرجہ بالا کو ثانی الذکر کی جائیداد،فیکٹری،اور ملوں کو بچانے کے لئے بند کا انہدام کر کے لاتعداد بندگانِ خدا،اور مویشیوں کی موت اور عوام کے گھروں،کھیت کھلیان کی بربادی کا ذمّے دار گردانتا ہے۔اس کو اپنے اس اقدام اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے پر کوئی پچھتاوا نہیں۔

جس دن مجرم جلال دینا کو سولی پر لٹکایا گیا تو جیل کے اندر سولی گھاٹ پر،سٹی مجسٹریٹ، ڈاکٹر، جیلدار اور پولس کے چند سپاہیوں اور جلاد کے علاوہ کسی اور کو آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔لیکن پھانسی گھاٹ کے باہر علاقے کے عوام ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے ۔پولس کی بہت بڑی نفری کے علاوہ بندوق بردار نیم فوجی دستے بھی کسی ناگہانی کی روک تھام ک لئے موجود تھے۔

جلال دینو نے اپنے ملنے والوں کو پہلے ہی اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا تھا۔اور اس نے وہ ہی کیا۔۔۔۔جب اس کو پھانسی گھاٹ لایا گیا تو جیل کی بکتر بند گاڑی سے اترتے ہی اس نے تین بار نعرہ لگایا ''اللہ اکبر''۔

پھانسی گھاٹ کے درمیان پہنچ کر اس نے تین مرتبہ نعرہ لگایا۔۔۔''پاکستان زندہ باد۔'' اور جب اس کو سیاہ نقاب پہنانے لگے تو اس نے جلادوں کے ہاتھ روک دیئے اور بلند آواز میں تین مرتبہ کلمہ پڑھا ۔۔۔۔۔اور پھر کچھ دیر بعد اس کے تنِ بے جان کو نیچے اتار لیا گیا۔پھانسی گھاٹ کے اندر سب کی آنکھیں نم تھیں اور باہر ایک ہجومِ اشکبار تھا۔۔۔۔۔۔۔جو نعرے لگا رہا تھا۔

مبشر احمد میر (گجرات)

کفارہ

جانے کس کا پاپ میرے سر منڈھ دیا ہے۔ سب مجھے بدھو سمجھے ہیں؛ آگے سے بولتا جو نہیں؛ حالانکہ سب جانوں ہوں۔ میں چپ رہتا ہوں؛ بولوں تو ابا مارے ہے۔ اس روز بھی جب ابا چولھے کے پاس بیٹھا بھات کھا رہیا تھا اماں نے چولھے میں پھونکیں مار کر دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا،''رجو! پنچوں نے فیصلہ کیا ہے کہ چڑھتے چاند کی پہلی جمعرات کو تیری شادی ہوگی۔ نصیبو اچھی چھوری ہے؛ مجھے بھی کام کا سکھ ہو جاوے گا۔''

میں بولا،''کام خاک کرے گی۔ کل گلی کی نکڑ پے الٹیاں کر رہی تھی۔ اس کا تو پیٹ بھی پھولتا جاوے ہے۔''

ابا نے چولھے سے جلتی ہوئی لکڑی نکال مجھے دے ماری،''چپ! حرام جادے..........ایک لفظ اور منہ سے نکالا تو جبان کاٹ دوں گا۔'' میں اچھل کر جلتی لکڑی سے تو بچ گیا لیکن ابا کی انگارا آنکھوں نے مجھے اندر تک جلا دیا۔

میں سہم کر چپ ہو گیا؛ حالاں کہ سب جانوں ہوں۔ ساری برادری نے مل کر اس کا پاپ میرے سر منڈھ دیا ہے کہ 'چل رجو! حرام کا جنا پال۔' پر ابا تو مجھے بھی ہر بات پر حرام جادہ کہوے ہے۔ اماں نے بھی کبھی اسے پلٹ کر جواب نہیں دیا؛ شاید میں خود بھی کسی کے پاپ کی پیداوار ہوں اور اب کسی کا پاپ بھگتنے جا رہیا ہوں۔

اوپر والا بھی اماں کی طرح چپ چاپ میرا تماشا دیکھے ہے؛ پر اماں کم سے کم اس وقت تو مجھے ہلدی تیل لگا دیوے ہے جب ابا مجھے ڈنڈے سے دُھنتا ہے۔ اوپر والے سے تو اتنا بھی نہ ہو سکے؛ سارا اختیار پنچوں کو سونپ کر خود آسماناں میں چین سے بنسی بجاوے ہے۔

ان سالے پنچوں کا زور بھی کمزور پر چلے ہے۔ کیا بگاڑ لیا انھوں نے رشیدے کا جس نے بھری پنچایت کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا؛ حالاں کہ پہلے اسی نصیبو سے شادی کرنے واسطے ماسی رحمتے کی منتیں کرے تھا پر جب دیکھا کہ ملائی تو کوئی اور چٹ کر گیا تو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

آخر قابو مجھ حرام جادے کو ہی آنا تھا کہ لو بھگتو کسی کا پاپ۔ نہ جانے کس کا پاپ ہے؟.......... پاپ کی گٹھڑی گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی ہے..........بیٹھی رہے۔..........اپن تو دوسری طرف منہ کر کے سوتے ہیں۔

☆☆☆

یہ سالا رشیدا بھی خود کو بڑا چودھری سمجھے ہے۔ کیسے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بول رہیا تھا،''اپنے لونڈے کو سمجھا لے۔ اب میرے کھیتوں میں بکریاں لے کر آیا تو ٹانگاں توڑ دوں گا۔''

بے شک توڑ دے ٹانگاں!......اپنا کیا لینا دینا!......حالاں کہ سالا سب جانے ہے کہ ممدو میرا لونڈا نہ ہے؛ پھر بھی مجھے سنانے آ جاتا ہے۔..........شادی والے دن بھی کیسے گلے مل کر مبارک دے رہیا تھا؛ جیسے میں شادی سے بڑا خوش ہوں۔.......... پر اکیلا رشیدا کیا ساری برادری مجھے مبارکاں دے رہی تھی۔ حالاں کہ سب جانو تھے۔

ظالموں نے میری شادی کا پورا ناٹک رچایا۔ بوڑھیاں بلائیں لے رہئی تھیں۔ چھوریاں گھوڑی چڑھنے کے گیت گا رہئی تھیں، حالانکہ مو ہے تو صرف گھوڑی کی رسی پکڑائی جا رہی تھی کہ بکریوں کے ساتھ اسے بھی چھپر تلے باندھ لے۔ دوسرے دن بھاگ دوڑ میں ماسی رحمتے چادر دکھانا بھول گئی؛ باقی عورتاں میں بھی کسی کو چادر کا پوچھنا یاد نہ آیا۔

☆☆☆

کھانس کھانس کر برا حال ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ بلغم سے پہلے دم نکل جائے گا۔ ممدو کہنے لگا، ''بابا! وید کے دوا سے آرام نئیں آ رہیا۔ نصیرا کہہ رہیا تھا لکھیم پور میں ایک بڑا قابل حکیم ہے، اس کے تاؤ کا دمہ انھی کی دارو سے ٹھیک ہوا تھا۔ میں تمھیں کل لے چلوں گا۔'' میں کھانستے ہوئے بولا،''رہن دے! لکھیم پور تو بہت دور ہے۔ ویسے بھی میں نے ہور جی کر کیا کرنا ہے۔ میرے واسطے اپنا دیہاڑی غارت نہ کر۔''

ممدو اس وقت کچھ نہ بولا پر سویرے اٹھتے ہی گدھے کو تیار کر کے مجھے اس پر بٹھایا اور چل دیا لکھیم پور کی اور (طرف)۔ خشک رستے پر تو گدھا آرام سے چلتا رہیا پر ندی کنارے پہنچتے ہی اڑ گیا۔ ممدو نے لاکھ ڈنڈے مارے پر ٹس سے مس نہ ہوا۔ تنگ آ کر میں نے کہیا''رہن دے! واپس چلتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی اس نے اپنی چادر اڑسی......؛ مجھے گدھے سے گھسیٹ؛ اپنی پیٹھ پر لادا اور ندی میں گھس گیا۔ میں کھانستا ہی رہ گیا۔

میرا اپنا ہوتا تو شاید وہ بھی اتنی کھدمت نہ کرتا۔ اس رشیدے کے بیٹے نے بھری پنچایت میں اپنے باپ کو گالیاں دیں اور وہ خاموشی سے سنتا رہیا۔

خاموشی تو ہمارے گھر میں بھی ہمیشہ رہتی تھی۔ کبھی گاؤں والوں نے ہمیں لڑتے نہیں سنیا۔ لڑائی ہوتی بھی کیسے؟......ہمرے درمیان تو بات بھی نہ ہوتی تھی۔ خاموشی سے وہ سارے کام کر دیتی۔ اس میں اتنی ہمت ہی نئیں تھی کہ میرے ساتھ بات کرتی۔ اس سے بات کرنے کے تصور سے ہی میری رگیں پھٹنے لگتیں اور چھونے کی تو مجھ میں صلاحیت تھی ہی نہیں۔

ساری عمر کسی کا پاپ بھگتتی مر گئی۔

☆☆☆

شاہد جمیل احمد (گوجرانوالہ)

ہمزاد

ٹھک، ٹھک، ٹھک! کون ہے بھئی؟ میں ہُوں! میں کون؟ میں اِبنِ فلاں! اِبنِ فلاں کون؟ اِبنِ فلاں! اِبنِ فلاں کون؟ حد ہوگئی بھئی! یہ کنڈیالے چوہے جیسے بالوں والا بابا میری جان کو آ گیا ہے۔ یہ حیات کا مُنکر نکیرِ ممات سے پہلے ہی پُوچھ کر رہے گا کہ آخر میں کون ہوں۔ اگرچہ یہ دروازہ بھی میرے لئے نامانوس نہیں بلکہ میری اپنے جسم کا دروازہ ہے اور یہ بابا بھی کوئی غیر نہیں بلکہ میرا اپنا جسم ہی ہے مگر مجھے اس مورکھ کی لاٹھی کو ایک طرف کھسکانے کے لئے بتانا پڑیگا کہ میں کون ہوں ورنہ وہ مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیگا اور میں ناکامیاب جادوگر کے نوخیز بچے کی طرح مرا پڑا رہ جاؤں گا۔ یہ بابا دراصل میرے لئے دربان ہونے کے ساتھ زندگی کی اس اجنبی اذیت کا استعارہ ہے جو کسی بیگانے در پر دستک سے در آتی ہے۔

تو دیکھ اے زندگی میں تیرا ایلن پو بالٹی مور کی گلیوں سے چُنی اپنی ہڈیوں، مانگے تانگے ملگجے کوٹ اور دریدہ پتلون کو سانسوں کی ڈور سے باندھتے ہوئے ویرانے کی طرف جا رہا ہوں جہاں میری بلیاں اور کُتے کچرے سے نکالے ہوئے کھانے کا انتظا کر رہے ہیں۔ ابھی کچھ ہی دیر میں مَیں لمبی لمبی پیلی گھاس سے لپٹ کر ہمیشہ کے لئے سو جاؤں گا۔ مگر یہ کیا کہ میری مطلق اندھیروں سے آشنا ہوتی ہوئی آنکھوں کے سامنے کسی نے دُنیا کی مختصر ترین دراؤنی کہانی کا سکرپٹ لہرا دیا۔ "زمین پر آخری آدمی اپنے کمرے مں تنہا تھا۔" درست ہے بھئی! آج کے انسان کے لئے یہ کہانی ہارر تھنکنگ کا باعث ہوسکتی ہے کہ وہ لاکھوں سال بعد بھی خیر و شر کے فلسفیانہ یا مذہبی نُقطہء نظر میں بُری طرح جکڑا ہوا ہے۔ رواقیت پرستی (Stoicism) نے خیر و شر کے وجود سے انکار کر کے انسان کے دیرینہ مسئلے کو حل کرنے کی کوشش تو کی مگر پھر صلیب و ہلال نے میرے بھائی ولیم جیمز کی وہ دُرگت بنائی کہ خُدا پناہ! مر گیا بیچارا اپنی ہی آگ میں جل جل کر۔

جرمن سپاہیوں کی طرح جرمن فلاسفر بھی بڑا تیز نکلا! کیا مطلب؟ کونسا فلاسفر! ایک منٹ! کہیں کوئی نازی سپاہی میری جان لینے تو نہیں آ رہا! کیا بات کرتا ہے گھامڑ! یہ امریکہ ہے امریکہ! اچھا! ہاں! یہ سُسرے ولہلم لیبنز کی بات کر رہا ہوں۔ اپنے اچھے خاصے دماغ کو چلنے سے روک دیا اس نے۔ چڑھا دیا اپنی فکر کو عام زندگی کی بھینٹ۔ لے بیٹھا میرے اقبال کو بھی، کھپا دیا ماحول کے بیچ، بٹھا دیا اُسے بھی پوتر مسند پر، بنا دیا اُس کو بھی سٹیچو۔ فکر کو لاٹھی سے مارتا ہُوا لایا اور زبردستی تسلیم کروایا اس سے خُدا کے وجود کو۔ پھر وہی جرمنوں والی چالاکی کہ خُدا کے وجود کو تسلیم تو کیا مگر اُسکی قُدرت کو منطقی طور پر مُمکن کاموں تک محدود رکھا اور اس طرح ہماری دُنیا میں شر کی موجُودگی کو لازم قرار دے کر سُرخرو ہُوا۔ آہاہا! خُدا کو ڈھونڈنے نکلا تھا شیطان کی تلاش پر منتج ہُوا! آہاہا!

میرے نزدیک مذکُورہ بالا مختصر ترین کہانی ڈراؤنی نہیں بلکہ فکری اور نظریاتی ہے۔ اِس کی تہ تک جانے کیلئے ہمیں اپنی سوچ کے بنے بنائے سانچوں کو توڑ مروڑ کر ایک طرف پھینکنا ہے۔ دُشوار ہے مگر چند لمحے ملن، دو گھڑی گُفتگُو کے نشاط انگیز تصور میں یہ بھی کر دیکھو۔ فلسفہ و فکر کی مُوشگافیوں کو دِل و دماغ میں جگہ دینی ہو تو روایت کے مُردوں کو پاؤں تلے روندھتے گزرنا پڑتا ہے۔ یُوں بھی ہمارے روایتی ذہنی سانچوں کی حیثیت بھٹہ خشت پر اینٹیں پتھنے سے مماثل ہے۔ ایک جیسی رٹی رٹائی، پتھی پتھائی لال بھُوری اینٹیں۔ سر پھوڑنے کو دل کرتا ہے اِن اینٹوں سے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ مختصر ترین کہانی ہماری اس ظاہری دُنیا سے مُتعلق نہیں ہے بلکہ ہمزاد سے جُدائی اور تنہائی کا بیان ہے تو کیسا ہے۔ ایک منٹ یار! سانسیں کھینچ کھینچ کر میری پسلیوں کی رگیں چڑھ گئی ہیں۔ چند لمحے پیلی گھاس کے گداز سے لپٹ کر انہیں موزوں کر لُوں۔

ہاں تو میں ہمزاد کی بات کر رہا تھا۔ آہ! ہمزاد کی بات سے پہلے ہمزاد کا نوحہ! اُن لوگوں کا نوحہ جو فکری لحاظ سے ازل کے تنہا ہیں، جن کے محرم راز گورِیں جا سوئے ہیں، جن کی بات سُننے اور سمجھنے والا کوئی نہیں۔ بُہت پہلے کی بات ہے! بُہت پہلے کی نہیں بلکہ بہت بہت پہلے کی بات ہے۔ ساڑھے چار ارب سال یا پھر شاید پونے چودہ ارب سال سے بھی پہلے کی بات جب میں اور میرا ہمزاد کسی نامعلوم کہکشاں کے کسی بے نام سیارے پر یک جان کی طرح رہتے تھے۔ صدیوں کے ارتقائی سفر کے باعث ہماری حیات تصوراتی جنت کے موافق ہوگئی تھی۔ شر کی قوتوں کو ارواحِ مقررہ کے ذریعے کسی اور کہکشاں کے کسی اور سیارے کے پاتال میں قید کیا جا چُکا تھا۔ ہم لوگ اپنے ذہن کے ارتکاز سے اپنے ماحول میں موجود مقناطیسی میدان کو استعمال میں لاتے ہوئے اپنے اردگرد کی چیزوں کو فقط تصور کرنے پر حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اپنے ماحول میں موجود الیکٹرک پاور کو استعمال میں لا کر لاکھوں میل تک پیغام رسانی، گُفتگُو، عوامل اور اسراع پر قادر تھے۔ اگرچہ سب لوگ روحانی طور پر ایک جیسی طاقت کے متحمل نہ تھے تاہم ارتقائی عروج کے ثمرات سبھی لوگوں کو بڑی حد تک بہم تھے۔ ایک جرمن کہاوت "جس چیز کو آنکھ نہیں دیکھتی، اس کے لئے دل افسردہ نہیں ہوتا" کے مصداق ہماری دُنیا میں ان دیکھے خُدا کا تصور موجود نہیں تھا۔

اگرچہ بد روح TOIA اور شیطان OKEE جیسی مخلوقات کو پاتال بدر کر دیا گیا تھا مگر روحانی طاقت کے حصول اور استعمال سے متعلق ایک مقابلے اور مباہلے کی فضاء ہم لوگوں میں موجود تھی۔ نظریہء اضافیت کے مطابق ہم لوگ اپنے اجسام یعنی مادے کی کیفیت سے نکل کر لائٹ یعنی نور کی کیفیت میں رہ رہے تھے۔ تمام روحیں اُس وقت تک آزاد تھیں اور اپنی قوت کے مطابق مسحور اور شاداں بھی ہر روح کا اپنا دائرہ عمل اور الیکٹرک اور مقناطیسی فیلڈ مختلف تھی اسی طرح لاکھوں سال گزر گئے اب ایک دو قرنوں سے ایک واضع تبدیلی ہمارے جہاں میں دیکھی اور محسوس کی جا رہی تھی کبھی کبھی ایسا ہونے لگا کہ ہم روحوں کے مقناطیسی اور الیکٹرک فیلڈ ہماری مرضی کے مطابق کام کرنے سے قاصر رہتے کبھی کبھی تو اتنے زبردست جھٹکے لگتے کہ یوں محسوس ہوتا جیسے ہماری حالت (State) تبدیل کی جا رہی ہو اور یوں لگتا جیسے کچھ ہی دیر میں پھر ہم لوگ نور سے مادے کی کیفیت میں چلے جائیں گے مگر پھر کچھ وقت کے بعد ہماری پوزیشن درست ہو جاتی۔

پھر یوں ہوا کہ شاں کی تیز آواز آتی اور ہماری کروڑوں اربوں روحوں میں سے کچھ روحیں غائب ہو جاتیں

۔ پہلے تو ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ نور یا روح کی حالت میں آنے کے بعد ہم ہر قسم کے کنٹرول سے مبّرا ہو جائیں گے مگر اب ہمیں ایک سُپر نور کی موجودگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وقتاً فوقتاً ہماری طاقت کے فیلڈ میں خلل آنے لگا تھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ اپنے تئیں ہم لوگ اسے اپنی توجہ کے ارتکاز کی کمزوری یا خلل ہی قرار دیتے تھے پھر ہم نے دیکھا کہ ہمارا اک ہمزاد نہ تو فیلڈ ٹوٹنے کا شکار تھا اور نہ جھٹکوں سے پریشان۔
ہم میں سے کئی روحوں نے اس سے اپنی کیفیت کا اظہار کیا مگر وہ کچھ نہ بتاتا بلکہ صرف مسکراتا تھا۔ اب تو وہ ہمیں کبھی کبھی عجیب وغریب تماشے بھی دکھایا کرتا ہم لوگوں کو اتنے زور سے گھماتا کہ ہم لوگ مادے کی کیفت میں چلے جاتے پھر ہمیں اتنے زور سے دوڑاتا کہ ہم لوگ شاں کر کے واپس اپنی نوری حالت میں آ جاتے۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ ہم سب روحوں کے مقناطیسی میدان اور الیکٹرک فیلڈ بے اثر ہو گئے۔ ہم لوگ بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ہم لوگوں میں سے کچھ کی ریز روانرجی ختم ہونے لگی۔ اس موقع پر پھر ہمیں انرجی ٹرانسمشن کا احساس ہوا۔ نینوسیکنڈ سے بھی کئی ہزار درجہ کم وقت میں ہم لوگوں کو روشن یعنی زندہ رہنے کے لئے مائکروویو طاقت حاصل ہونے لگی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہماری ہی دنیا کی کوئی سُپر طاقت ہمیں زندہ رکھے ہوئے تھی۔ لازمی طور پر یہ طاقت وہی ہوسکتی تھی جس نے ہماری تمام طاقت ختم کر دی تھی یا پھر اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

لاکھوں سال اسی طرح گزر گئے اور ایک دن سُپر روح کا ظہور عمل میں آیا۔ یہ روح دراصل میرے ہمزاد ہی کی روح تھی مگر اب یہ بہت ہی پیچیدہ برقی راستوں اور مقناطیسی میدانوں سے مزین اور محفوظ ہو چکی تھی اُس کی موجودہ قوت اور قدرت کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ ہم ایسی اربوں کھربوں روحوں کی تمام قوت اُس کے اختیار اور استعمال میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اپنے ظہور کے بعد ہمزاد نے تمام روحوں کو مخصوص مقام پر محفوظ کر دیا اور اپنی مرضی سے ان کو انرجی ٹرانسمٹ کرنے لگا۔

مادے سے نور میں تبدیلی کے وقت ہم نے ساڑھے چونتیس ارب میل فی سیکنڈ سے زیادہ رفتار کے ساتھ سفر کیا تھا پھر اسی طرح کئی نُوری قرنوں اور کئی برقی رفتاروں کے مقامات آئے اور گزر گئے۔ ایک دن پتہ نہیں ہمزاد کو کیا سوجھی کہ اُس نے دو روحوں کو مانع اور مستعمل کے چکر میں ڈال کر ایک لمبے ہی چکر میں ڈال گیا۔ پھر یوں ہوا کہ مانع و مستعمل کی عدم تعمیل کے باعث ان روحوں کے درجے میں تنزلی کر کے ان کی حالتِ نور کو مادے کی کیفیت میں تبدیل کر دیا۔ لو بھئی یہ تھے ہم اور یہ تھی ہماری کہانی، جب ہم لوگ روح تھے تو ہمزاد کے قُرب میں تھے مگر اب باری باری مادے کی حالت میں پہنچے تو ہمارے بیچ کئی سیاروں اور کہکشاؤں کے دبیز پردے حائل ہو گئے۔
پھر کیا ہوا کہ ہم لوگوں نے ہمزاد سے دوری کے سبب رونا پٹنا شروع کیا مگر اب اتنے نوری سال کے فاصلے پر مقناطیسی اور برقی میدانوں کے بغیر ہماری رسائی اگر سو فیصد ناممکن نہیں تو محدود ترین ضرور ہو گئی۔ ناممکن اس لئے نہیں کہ ہمزاد اپنی مرضی سے کچھ مادی جانوں کو الیکٹرک فیلڈ کے ذریعے روحانی طور پر اپنی جھلک دکھا بھی دیتا تھا شائد اس لئے بھی کہ ان لوگوں کے ذریعے اس کا نام اور مقام مناسب حد تک قائم اور زندہ رہے۔ ہمزاد کی مرضی کے مطابق میں نے اپنی قید کے مقام جسے زمیں یا اس جیسا کوئی اور سیارہ تصور کر لیں پر اپنی کم درجہ یعنی اپنی مادے

کی حالت کے مطابق کم درجہ عوامل میں کئی صدیوں کے ارتقاء کے نتیجے میں ترقی بھی حاصل کی جو ہماری نارسا فکر اور ہمارے مختلف زمانوں کے لحاظ سے بڑی ارفع اور اعلیٰ بھی دکھائی پڑتی تھی۔ نظامِ شمسی ہی کے کسی دوسرے سیارے کی دریافت ہو کہ مادے کو ہوا میں جہاز کی رفتار سے اُڑانے کا معاملہ یا پھر بھاری بھر کم ٹھوس اجسام کا پانی پر تیرنے کا مسئلہ، یہ سب بھی مجھے تو حیرت زدہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ چونکہ میں نے ارفع سے ادنیٰ کی طرف سفر کیا ہے اس لئے میری سرشت میں روح کی محبت اور ہمزاد سے ملاپ کی تڑپ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اگرچہ ہمزاد نے میری نوری طاقت کو سلب کر لیا مگر مجھے فکری طور پر زندہ رکھنے کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی کچھ طاقت بحال بھی رکھی۔ اپنی اس مخفی قوت کے بَل بوتے پر میں نے اپنی روح کے کھوج اور ہمزاد کی تلاش کا سفر جاری کر رکھا۔ اُس وقت جب میرا نام حلاج ہوا کرتا تھا تو میں نے چیخ کر ہمزاد کے راز کو افشاں کرنا چاہا۔ چونکہ ہمزاد کا کوئی ھمراز نہیں ہوسکتا اس لئے اس نے ظاہری عوامل کو استعمال کر کے فوری طور پر میری مادے کی کیفیت کو نور میں تبدیل کر دیا تا کہ میں اپنے دیگر ہم نفسوں کے اذہان کھولنے اور انہیں حقائق سے آگاہ کرنے سے باز رہ سکوں۔ اور پھر میرے ہی ہم نفسوں نے ظاہر کے لباس پہن کر میری پھانسی کے حکم نامے پر مہر صدق لگا دی۔

دلچسپ بات ہے کہ تمام کائنات مادے سے ملکر بنی ہے اور دراصل مادہ اور نور ایک چیز کے دو پرتوں ہیں اور اُنکی مقدار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کائنات میں ایک جتنی یعنی یکساں ہے۔ ان کی صرف ہیت تبدیل ہوتی ہے یعنی مادے سے نور میں اور نور سے مادے میں مگر یہ ختم نہیں ہوتے۔ اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کی کیا روحوں نے زمین سے آسمان کا سفر کیا البتہ مادے اور لائٹ کے لئے دو الگ مقام مخصوص کئے۔

مجھے اپنی مادی کیفیت کی تبدیلی کا پتہ بھی تقریباً بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا جب میرا نام نیوٹن ہوا کرتا تھا اور میں نے حرکت اور ثقل کی قوتوں کو دریافت کیا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے کائنات کے سب سے بڑے راز کو معلوم کر لیا مگر جب میں نے آئن سٹائن کے روپ میں جنم لیا اور نیوٹن کے برعکس نظریہء اضافیت یعنی یہ نظریہ کہ فاصلہ اور وقت اضافی ہیں کی بنیاد رکھی اور اضافت کی سپیشل تھیوری کے تحت مادے کی نور میں تبدیلی کا پتہ لگایا۔ میں نے رومی کی نے بن کر بھی آواز لگائی جو کسی نے سُنی نہیں! تمام تر فاصلوں کے باوجود ہمزاد نے بھی مجھ سے محبت کا رشتہ قائم رکھا۔ مجھے علمِ شریعہ سے مستفیض کیا تا کہ میرا میلان نہ تو بھٹکے اور نہ ہی حد سے بڑھے۔ پھر کبھی کبھی طریقت کے رستے میرے مقناطیسی اور الیکٹرک فیلڈ میں کبھی کبھی ارتعاش بھی پیدا کر دیتا ہے مگر پتہ نہیں اُس نے مجھے مزید کتنی صدیوں تک نامراد و نارسا رکھنا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے فاصلے اور وقت کی اکائیوں کی طرح اپنا ہر فعل، اپنی ہر سوچ، ہر فکر، ہر احساس اور ہر پہنچ اضافی یعنی (Relative) لگتی ہے۔ سوچتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں کیونکہ اگر ایسا ہے تو پھر میرا ہر کام اور ہر عمل بے معنی و لایعنی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو میرا مقصد نوری کیفیت کی تلاش اور ہمزاد سے ملاپ کے لئے ہے اگرچہ ہمزاد کے مصمم وعدہ اور غیر متزلزل ارادہ کی نوید ہے مگر پتہ نہیں میری حالت میں تبدیلی اور ہمزاد سے ملاپ کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے میں کتنی صدیاں اور کتنے نوری قرن صرف ہو جائیں۔ یہ سب سوچ کر میرا دل ڈوب جاتا ہے اور میں پھر اپنے خول یعنی اپنے جسم میں پناہ ڈھونڈتا نظر آتا ہوں، اسی پناہ کے لئے ابھی ابھی میں نے اپنے جسم کے دروازے پر دستک دی تھی۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

ڈپریشن

شاخِ آشنائی کی
جب شجر سے کٹ جائے
شامِ دل ربائی کی روٹھ کر پلٹ جائے
قلب و جاں میں پت جھڑ رت
لوٹ سی مچا بیٹھے
یاس کھول کر بازو، روح کو دبا بیٹھے

آسمانِ دنیا میں، آگ کے پہاڑوں سے
موت جب برستی ہو
نیچے ارض کے اوپر زندگی ترستی ہو

ہر نئے کھنڈر میں جب
امن اور کلچر کے
بھوت رقص کرتے ہوں

بستیوں کی گلیوں میں
موڑ، موڑ، ملبہ ہو
غاصبوں کا غلبہ ہو

آس کی سبک ڈالی
ہاتھ سے پھسل جائے
جسم و جان کی خاطر
بھاگتے ہوئے انسان
آس کی چٹانوں سے
جا بجا لٹکتے ہوں
نیچے
منتظر جن کی
ظلم کی دراڑیں ہوں
جبر کی کچھاریں ہوں
نت نئی بلائیں ہوں

جو نظر نہیں آئیں
اور گرنے والے کا
اندرون کھا جائیں۔۔۔! !

عبداللہ جاوید

کیا دیا۔؟

مختصر سا ساتھ
اک لمبی جدائی
کیا دیا۔

آپ کو حاصل تھی گو
ساری خدائی
کیا دیا۔

یاد دی
یا، دل کے اندر نرم گوشے میں کہیں
جلتی بجھتی ایک چنگاری کوئی
بھسم کر دے روح کو
اور جب بجھے
ڈپریشن کے اندھے کنویں میں گرا دے
ذہن کو ۔
کیا دیا ۔

لفظ بخشا
لفظ مخفی اَن سنا
اَن کہا اور اَن لکھا
جو کسی منہ بند سیپی میں
سسکتا رہ گیا
سچے موتی کی طرح
گھپ اندھیرے میں کہیں
گہرے سمندر کے تلے
تنہا
دمکتا رہ گیا
کیا دیا

زندگی دی۔۔۔۔
ذمّے داری، معنویت سے تہی
تشکیک کے کہرے میں بند
سوچ
بے حد و حساب
از زمیں تا بہ فلک
از فلک تا بہ خلا
بے کراں، بے سمت اور بھٹکی ہوئی
کیا دیا ۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل (برمنگھم)

دوہے

اونچی تیری شان ہے مولا،اونچا راج سنگھاسن
ذات تری بے عیب ہے ربا،کیسے گنوں محاسن

سارے جگ کا رکھوالا تو ہم تیرے محتاج
حکم عدولی کرتے ہیں اور آتی نہیں ہے لاج

جس کے عشق میں ڈوب کے تو نے کہہ دیا کن فیکوں
اسی دوارے جا کر پائیں ہم بھی انت سکوں

آدم کو جنت سے نکالا کیسا تھا یہ ناٹک
حشر تلک اب اس جنت کا بند رہے گا پھاٹک

جنت میں جانے کی ہائے کیا کیا شرطیں رکھ دیں
اوپر سے ابلیس کی باگیں کتنی ڈھیلی کر دیں

پیدا کیا انسانوں کو فی احسنِ تقویم
تاجِ نیابت سر پر رکھا،ہم کو دی تکریم

ڈالی ڈالی اڑیں پکھیرو،تیرے ہی گن گائیں
تیرا نام ہی وردِ زباں ہے،کیسے تجھے بتائیں

تیری عبادت کریں فرشتے اور انہیں کیا کام
سارے کا تو ہم کو سونپے،پھر بھی ہم بدنام

آتما،تن کا ناطہ ایسا، بھید نہ کوئی پائے
جب تو چاہے تیرا فرشتہ آئے،روح لے جائے

قبر اندھیری ماٹی ماری،ہم کو ہے ڈر لاگے
اس کے شکنجے میں جو آئے پھر وہ کیسے بھاگے

جنت اور جہنم کی چِنتا ہے ہم کو گھیرے
بند کرو یہ ناٹک بابا ہم بندے ہیں تیرے

ابراہیمؑ کی آنکھ کا تارا،ماں کا راج دُلارا
اک بچے کی قربانی نے سب کا بخت سنوارا

صفا سے لے کے مروا تک پھرتی تھی ماری ماری
چاروں اور وہ کھوجے جل کو سمے بڑا تھا بھاری

کومل کومل ایڑیوں سے پھر پھوٹا ایسا چشمہ
چشمہ زم زم کا تھا گویا رب کا ایک کرشمہ

حکم ہوا ساری امت کو اس سے پیاس بجھاؤ
کرو طوافِ کعبہ من سے،رب کے درشن پاؤ

تیرے دوارے آنے والے خوش قسمت کہلائیں
گائے ہوئے لبیک ترانہ ہم بھی مکے جائیں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل (برمنگھم)

دوہے

عرفہ کا دن ہم کو ملا اور ہو گیا جنم دوبارا
رشک سے ہم کو دیکھیں فرشتے خوش ہے رب پیارا

تین سو تیرہ تیرے مجاہد،کھڑی کفار کی فوج
ہار کہاں سکتے ہیں ربا کریں جو حق کی کھوج

مندر جاؤ،مسجد جاؤ،رب تو ایک ہے بھائی
وہ ہی احد،وہ ہی واحد دوئی کاہے بنائی

عشق کا کومل بوٹا جس نے خونِ جگر سے سینچا
اک نعرہ مستانہ لگا کے دار پہ اس کو کھینچا

نرگ سورگ کا چکر کیا ہے ہم کچھ ناہیں جانیں
اوپر والا رب رحیم ہے ہم بس یہ ہی مانیں

ہم کو بلاؤ کعبے میں اور بھید نہ کوئی کھولو
موسیٰ جب بھی طور پہ آئے،بڑے رسان سے بولو

حق کی راہ میں مرنے والے جنت کے حق دار
حوریں ان کی جیون ساتھی بنیں ہزاروں بار

غم نے اس کے من کے اندر ایسی مچائی ہلچل
امت ہی کے دھیان میں گزرا جیون کا ہر اک پل

کفر و شرک کی کالی آندھی،سنے نہ کوئی بات
ٹھان لی جی میں لیکن اس نے دے کے رہیں گے مات

درِ یتیم بنایا اس کو بھید بڑا تھا گہرا
دکھ اس کی جاگیر بنائے،اس پر غم کا پہرا

گونج اٹھی مکے کی وادی ایسا دیا پیغام
سن کے جنہوں نے بات نہ مانی برا ہوا انجام

عشق ترے نے من کے اندر ایسی جوت جگائی
تیرے بنا کچھ نظر نہ آئے،حاضر کل خدائی

کتنا سوہنا،کتنا سندر اپنا نبی پیارا
گوپیاں بھول کے کشن کنہیا ڈھونڈے ترا سہارا

گمراہی کا ایک سمندر جس کے کنارے ناگ
زہر بھری پچکاری مارے،منہ سے اگلے آگ

عشق کی مے ہم پی بیٹھے ہیں یار نظر نہ آئے
مرتے دَم تک اس کو کھوجیں،چاہے جہاں چھپ جائے

جیم جدائی کی گھڑیاں اب بیتیں نہیں اکیلے
آن ملو اب تم بھی ساجن کس کارن کے میلے

کاوش عباسی (سعودی عرب)

اُن کے لیے پہلی نظم

غم سے اندھا، اندھیرا رشتہ بنا ہے
جن کی جدائی ہے
جن کو دل نے اپنا رونا لکھا ہے
اپنی سلگتی محبت، جلتی تڑپ بتاتی ہے
وہ، کسی فاصلے
کسی شہر میں، کسی ملک میں، کسی فون پر
کہیں نہیں ہیں
زمیں پر کہیں نہیں ہیں
زمین کے نیچے ہیں
دل بار بار اُن سے ملنے کو
اُن کے ساتھ زمین کے نیچے جانے کو للکارتا ہے
لیکن دل کے لیے ابھی وہاں پہ
زمین کھودتا کوئی نہیں ہے

کاوش عباسی

اُن کے لیے دوسری نظم

دیکھو کتنا آوارہ ہو گیا ہوں میں
ایک نظر بھی میری کسی پر پڑتی تھی
تو تمہاری جان وہ کھاتی تھی
اب آؤ، دیکھو
دونوں آنکھیں، ساری نظریں سارا جلتا بکھرتا ذہن
لیے میں کہاں کہاں نہیں ڈول رہا ہوں
ڈول رہا ہوں
لیکن پھر بھی دیکھنا
تم سب کی سب مجھ میں
سب میں تمہاری شبیہ ڈھونڈتا
(اور ایک بھی جھلک نہ پاتا)
واپس تم میں چھپ کے
تمہارے عدم میں بس کے
تمہاری پرچھائیں کے ساتھ ہی رہتا ہوں مَیں
تمہارے عکس کے ساتھ ہی جیتا ہوں میں!

نوٹ: یہ دونوں نظمیں میری بیوی کی بے وقت، خونخوار موت ۱۲ رجون ۲۰۱۱ء کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ (**کاوش عباسی**)

انوار احمد (مرحوم) کی دو نایاب نظمیں

۲۳ویں سالگرہ پر

میں اُس مقدس درخت کے نیچے دو راتیں سویا ہوں
جس کے پتے مٹی اور ہوا کی زد سے باہر ہیں
لوگ انہیں محفوظ جگہوں پر رکھ لیتے ہیں
میں تمہارے گھر کی طرف جانے والی
سڑک کے کنارے
میونسپلٹی کا وہ درخت ہوں جس کی چھال اُدھیڑ کر
۲۳ نمبر لکھا گیا ہے
آج ایسے بیکار موسم میں سو کر اُٹھا ہوں تو اُٹھتے ہی
جو لفظ لکھا ہے، وہ ''مرگ'' ہے
میرے پتوں پر گزرے ہوئے شہر کا نقشہ
اور لوگوں سے لمبی جدائی کا نوحہ ہے
میں موسمِ خزاں میں دوستوں کو خطوط لکھتا ہوں
اگر یہ گرتے پڑتے
تمہاری دہلیز تک آ پہنچیں تو انہیں اپنے پرانے
صندوق میں جگہ دینا۔

انوار احمد

۲۵

آج میں جو پچیس برس اور نو ماہ کا ہو گیا ہوں
مِری انگلیوں سے مِری بات پوچھو
دھندلکا زیادہ عجب ہے، جس قدر ہم سمجھتے ہیں اس سے
مِری بات بھی اب نہ جانے کہاں ہے
کہیں تو کسی اُور باقی ہے
سنو تو! یہ لفظوں کے انجان نقشے کہاں مجھ کو معلوم ہیں
مِری دھیمی رفتار
اور کالے جوتے سڑک سے چمٹ ہی گئے ہیں
کہ جیون مِرے جیسے عام آدمی کا تو ایسا ہی ہوگا
سبز آوازیں اس دھند کو چیر سکتی ہیں لیکن
مِری عمر میں تو گلِ غم فقط اک بار مہکا
میں جب دکھ کے بدکار ہاتھوں سے پٹرول
اپنے بدن پر چھڑک کر آنسو گراؤں
کسی نہر کے ایک بنجر کنارے پہ سرسبز بستر بچھاؤں
اور دھیمی صدا میں فقط ایک بار ہی چلاؤں
زمین کی طرف جھک گیا ہوں، مِرا آسمانوں سے رشتہ
نہ ہونے کا ہے
مجھے جیسا لوگوں نے چاہا، میں ویسا بنا ہوں
میں سچ بولتا ہوں مگر جھوٹ ہوں
ترے ساتھ اب کی ملاقات سب پچھلی باتوں میں گم
سرد موسم میں نمناک آنسو
مِری عمر کے سارے سالوں میں گم۔

حفیظ طاہر (لاہور)

دائرہ

وہی ہوگا جو لکھا ہے مری چاہت کے منظر میں
وہی ہوگا
یقیناً پھر وہی ہوگا
وہی اک دائرہ اور دائرے میں دائرہ ہوگا
اور اس اک دائرے کے دائرے میں
چشم آہو کی طرح اک شخص کی چاہت رہے گی اور
کوئی جادوگری کی قید میں
اس شخص کی سب آرزوؤں کو ہوا کا کانچ کر دے گا
وہی اک شخص ہوگا سب پرانی چاہتوں کے دائروں کا
مرکزی نقطہ
یقیناً پھر وہی ہوگا
اسی نقطے میں میرا دل کہیں
اک حجر اسود کی طرح
اس کے حسیں بوسوں کا مرکز بن کے چمکے گا
چمک جس کی اسی کی آنکھ کے منظر میں میرے
ہجر کے لمحات کے اشکوں کے رنگوں سے
دھنک کا اک سراب پرگماں سا پینٹ کر دے گی
سراب پرگماں کی رنگتوں میں
آنے والے ان سبھی سالوں کی قسمت درج ہوگی
جن کے پہلو میں
نہ میں ہوں گا نہ وہ ہوگا
وہی ہوگا جو لکھا ہے مری چاہت کے منظر میں
یقیناً پھر وہی ہوگا
وہی کچھ لمس ہوں گے جو شبوں کا رزق ہو کر
آنے والے سب برس میں کچھ نئے
لوگوں کی چاہت کے لئے
قطبی ستارہ بن کے مہکیں گے
وہی اک بات ہوگی
ان کہی بے ربط سی جو ہر ہوا کے دوش پر محوِ سفر ہو کر
کسی صحرا کے آنگن میں گلاب خشک کو
زندہ کرے گی پھر
کسی چائے کے کپ پہ اک نشاں ہوگا
کسی کے زرد ہونٹوں کا
ہوا پھر پاس سے گزرے گی ہنس کر اور رو کر
کسی کی روح میں میرے لبوں کی یاد بو کر
وہی بے عکس سا اک آئینہ ہوگا
مرے چاہت کے منظر میں
یقیناً پھر وہی ہوگا

احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)

GUILTY LOVE

دُعا کو ہاتھ اُٹھاؤں تو دل لرزتا ہے
رگوں میں دوڑتی وحشت بھی کانپ اُٹھتی ہے
یہ مرحلہ جو محبت میں ہے مجھے دَرپیش
اِک ابتلا ہے جو مجھ ناتواں پہ اتری ہے
کوئی رفیق! کوئی رازداں!! کوئی ہمدرد!!!
مگر یہ خلقِ خدا کس کے کام آئی ہے
بَس اِک خُدا ہی مرا چارہ ساز ہے لیکن
خُدا سے کیسے کہوں ، بات ہی کچھ ایسی ہے

وُہ حُسن جس کے تقدس سے شرمسار تھا عشق
اَب اُس کی آنچ مرے دِل کو گُد گُداتی ہے
بدن سے آتی ہے بوئے گناہِ نا کردہ
اِک آگ سی مرے سینے میں لہلہاتی ہے
مجھے خُود اپنے خیالوں سے خوف آتا ہے
خُود اپنے ڈَر سے مری سانس پھول جاتی ہے
بَس ایک بار دَھڑکتا ہے بے طرح مرا دِل
اور اُس کے بعد مری نبض ڈوب جاتی ہے

گناہ کر نہیں سکتا، گناہ سوچتا ہُوں
میں کیا کروں مری اوقات ہی کچھ ایسی ہے
دُعا کو ہاتھ اُٹھاؤں تو دِل لرزتا ہے
خُدا سے کیسے کہوں بات ہی کچھ ایسی ہے

پروین شیر (کینیڈا)

مگر...........

ابتدا
زندگی
سلسلے، راستے

نرم پھولوں سے ننھے قدم
جب اٹھے
لڑکھڑائے، تو اس کی طرف
بڑھ گئیں
مہرباں انگلیاں!
تیز تر اور توانا ہوئے یہ قدم
دوڑتے ہی گئے
پربتوں کو بھی سر کر گئے
رفتہ رفتہ تھکے
لغزشیں آ گئیں
لڑکھڑائے.........مگر
مہرباں انگلیاں اب کہاں...!
سخت اور سرد بیسا کھیاں ساتھ ہیں
ایک واماندگی میں گھرے ہیں قدم
اب تو اٹھتے نہیں
ابتدا تھی جہاں
انتہا بھی وہیں ہے
مگر...............!

ناصر نظامی (ہالینڈ)

مجرم؟

یہاں ملزم پکڑے جاتے ہیں
یہاں مجرم کب ہاتھ آتے ہیں
یہاں ظالم کے حصے کی سزا
مظلوم ہمیشہ پاتے ہیں
مانا کہ جبر کے موسم میں
دن اور کڑے ہو جاتے ہیں
مسموم ہوا کے مرغولے
ماحول میں زہر ملاتے ہیں
آزاد فضا کے پنچھی مگر
کب اُڑنے سے گھبراتے ہیں
لڑنے پہ مولے تل جائیں
تو بازوں سے ٹکراتے ہیں
یہ ذرے بظاہر دیکھنے میں
معمولی نظر ہمیں آتے ہیں
یہ ذرے اگر پھٹ جائیں تو
پھر ایٹم بم بن جاتے ہیں

طارق حبیب (سرگودھا)

بس تجھے اتنا ہی بتانا تھا

میرا گھر
ہاں وہ مجھ غریب کا گھر!
جس میں تُو چند روز ٹھہرا تھا
گھر کا نقشہ تو یاد ہے نا تجھے

اپنے ہاتھوں سے بیسیوں گملے
تُو نے رہ داریوں میں رکھے تھے
کتنی قسموں کے خوش نما پودے
تُو نے گملوں میں خود سجائے تھے
یہ سلیقہ تو یاد ہے نا تجھے

بس تجھے اتنا ہی بتانا تھا
تیرے پودوں پہ پھول آئے ہیں

طارق حبیب

بادلو! آ بھی چُکو

بادلو! آ بھی چُکو
اب کے برس کھل کر برسو
آگ برساتی فضا راکھ نہ کر دے ہم کو
دھوپ بالوں کی جڑوں تک میں اُتر آئی ہے
اتنا بے مہر ہوا مہر کہ ٹلتا ہی نہیں
روز و شب سر پہ کھڑا تکتا ہے دائیں بائیں
ہم ہی منہ پھیر لیا کرتے ہیں، اب رات ہوئی

بادلو!
رَخشِ صبا تم کو میسر ہے، تو پھر دیر کی علّت کیا ہے
پاؤں کے نیچے سلگتے ہوئے صحرا کی قسم
اِس سے پہلے کہ پگھل جائے بدن کا سونا
اِس سے پہلے کہ لُہو چاٹ کے لے جائے ہوا
اِس سے پہلے کہ چٹخ جائے وجود
بادلو! آ بھی چُکو
اب کے برس کھل کر برسو

افضل چوہان (مظفرگڑھ)

مجھے وہ یاد ہے اب تک

مجھے وہ یاد ہے اب تک
بہاروں کی طرح اس نے
مرے ویران آنگن میں
خوشی کے پھول مہکائے
وفا کے رنگ لہرائے
وہ ساون کی رتوں جیسا
برستے بادلوں جیسا
سنہری تتلیوں جیسا
مرے آنگن میں اترا تھا
وہ جیسے چاندنی اترے
وہ جیسے رات کو دور آسماں سے روشنی اترے
وہ جیسے دور سے خوشبو بتائے
ہاں میں خوشبو ہوں
وہ جیسے شاخ سے پہلی پہلی کونپلیں پھوٹیں
وہ جیسے پہلی بارش پہلے ساون
پہلی خواہش کیلئے دور آسمانوں سے
فقط اک بوند اترے اور زمیں شاداب ہو جائے
مجھے وہ یاد ہے اب بھی

افضل چوہان

لیکن مجھ کو یاد ہے سب کچھ

کیا تجھ کو کچھ یاد نہیں
وہ لمحے جو آج بھی زندہ ہیں
وہ خواب
جو تو نے مجھ کو عطا کئے تھے
وہ باتیں امرت جیسی باتیں
میرے کانوں میں رس گھولتی ہیں
وہ شبنم سا پاکیزہ تبسم
جسے دیکھ کے کلیاں کھل جائیں
وہ خوشبو تیرے لہجے کی
وہ مہک ترے ان لفظوں کی
جس نے مری ساعت کو مہکا رکھا ہے
وہ سرخی مائل تیری آنکھیں
دیکھ رہی ہوں جیسے مجھ کو
آج بھی یوں لگتا ہے جیسے
میری آنکھوں میں رہتی ہو
میرے ہی دل میں بستی ہو
تم کو تو کچھ یاد نہیں ہے
لیکن مجھ کو یاد ہے سب کچھ!

ارشد خالد (اسلام آباد)

سرکتی شام

سرکتی ڈوبتی سی اک سنہری شام
کی دہلیز پر وہ
سر بزانو اک حسیں لڑکی
ہجومِ ہم نشیناں سے الگ
اک سوچ میں ڈوبی ہوئی
یہ سوچتی ہے
کہ آج اس نے کتنے دلکش، اور حسیں لمحوں کو
کیسے کھو دیا ہے، کیوں؟
خود کو زندہ بو دیا ہے۔۔کیوں؟

ارشد خالد

دعائیہ نظم

میرے مالک میرے مولا
مجھ پہ تُو اک کرم کما دے
اِس منظر سے اُس منظر تک
جتنے لمحے جاگ رہے ہوں
جتنے لمحے سوئے ہوئے ہوں
ان کو دیکھوں
دیکھ کے رولوں
رونے والی آنکھ میں مولا
حرفِ صداقت، صبر و رضا کی
ایک تمنا روشن کر دے
میرے مالک میرے مولا
اِس منظر سے اُس منظر تک
دیکھنے والی آنکھ تُو دے دے۔۔۔

حیدر قریشی (جرمنی)

اجنتا کے غار کی ایک تصویر

(یہ نظم میراجی کی نظم ''اجنتا کے غار'' سے متاثر ہو کر اور ایک تصویر کر دیکھ کر لکھی گئی)

ابھی کی بات ہے شاید یا کل کی، ایسے لگتا ہے
مگر یہ بات تو صدیوں پرانی ہے
ہم اپنے پیار میں کھوئے ہوئے
اک دوسرے میں خود کو جیسے ڈھونڈتے تھے
ہمارا کھیل ابھی جاری تھا
جب تاریخ کے صفحات پر آندھی چلی
خانہ بدوشوں کے مقدس حملہ آور
جب مرے جغرافیہ کو روندتے بڑھتے چلے آئے
تب اس آندھی کے پہلے زور ہی میں
میں جنم چکر کے گھیرے میں چلا آیا
وہ اصحافِ کہف کا حال کچھ کچھ جانتی تھی
اس لیے آندھی سے بچنے کے لیے
اک غار میں وہ جا چھپی
جنم چکر میں لہراتا ہوا کتنے ہی جنموں تک
اسے میں ڈھونڈتا پھرتا رہا
میں ساری بستیوں، صحراؤں سے ہوتا
بیابانوں تلک پہنچا
اُسے ڈھونڈا صدائیں دیں
پہاڑوں اور دریاؤں سے گزرا
اور غاروں تک بھی جا پہنچا
تبھی اک غار میں تصویر کا پیکر بنی آخر وہ مجھ کو مل گئی
میں اس مُورت کو کتنی دیر تک حیرت سے بس تکتا رہا
تکتا رہا۔۔۔ تکتے ہوئے
اس وقت خود حیرت سے مورت بن گیا
تصویر میں جب یک بیک جنبش ہوئی
انگڑائی سی لے کر وہ گہری نیند سے جاگی
اندھیرے غار کی دیوار سے نیچے اتر کر مسکرائی
میرے پاس آئی
مجھے بانہوں میں بھر کے بھینچ کے سینے سے لپٹایا
تو دو مجبور روحوں کا ملن جسموں کے رستے سے
ازل سے تا ابد پھیلے ہوئے لمحے میں
جیسے نقش سے بھرنے لگا

دو مجبوروں کے وصلِ جاوداں کی یہ کہانی
خواب کو تعبیر دیتی ہے
اک ابدی کیف سے سرشار لمحے کی گواہی
آج بھی اُس غار کی تصویر دیتی ہے!

ایوب خاور (لاہور)

پہلی نظم

چاند تھکن سے چُور تھا
آنکھیں زرد تھیں اُس کی
آسمان کے نیلے گنبد کی ڈھلوان پہ رک کر اس نے جب
دیکھا
دور کہیں سورج کی پہلی پہلی کرنوں کے کچھ بوسے
نیند میں ڈوبے دن کی، ٹھنڈی اوس نہائی ریت کو پہلی
پہلی جنبش بانٹ رہے تھے
کمرے کی سب دیواروں پر
رات پلستر کی چادر میں ریزہ ریزہ جڑی ہوئی تھی
فرشِ ذات کے مرمر پر، تم
عکسِ ذات کو آنچل کر کے
میرے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھی تھیں
کچھ لمحوں کا وقفہ......
اور پھر
جلتے بجھتے لہجے میں
تم نے اپنی داستان کا آخری منظر چھیڑا
تم نے کہا
''میں بے سمت ہَوا کا کم سِن جھونکا تھی
وہ اک سایہ دار شجر تھا
اُس نے مجھ کو گھیر لیا تھا
کٹی پتنگ کی صورت آخر
میں بھی اس کی بانہوں کی شاخوں میں آ کر
اٹک گئی تھی
ایک برس کی نیند سے میں جب چونکی تو
مجھ کو تب یہ پتا چلا
وقت کی برف مری آنکھوں پر جمی ہوئی ہے
پلکوں پر سے برف ہٹا کر
میں نے کوشش کر کے آخر خود کو دیکھا
میرے تن کا ریشہ ریشہ
کٹی پتنگ کے کاغذ جیسا
گیلی دھند میں لرز رہا تھا
اور کاغذ کی گیلی کھال میں
اُس کے اندر کا گرگٹ
خواہش کی نیلی پیلی اور کالی میخیں گاڑ رہا تھا
دور کہیں اک بھوک کا مارا کتّا بھونک رہا تھا
میں سچ کہتی ہوں
وہ جو سایہ دار شجر تھا
اپنی ہی شاخوں پر بیٹھا گرگٹ نکلا
جس کے لمس کی دیمک میری روح کے
اندر رینگ رہی تھی''
[وقفہ]
گز بھر لمبی خاموشی کے بعد بالآخر تم نے پوچھا
''خاور تم کیا سوچ رہے ہو؟''
میں نے کہا
''میں اس اندھی داستان کے آخری منظر میں گم ہوں''

تم نے کہا
''میں نے آخر اُس گرگٹ کو چھوڑ دیا
اپنے بچپن کو ایڑی کے نیچے رکھ کر توڑ دیا''
یہ کہہ کر سگریٹ سلگایا
اور پھر چپ کا کورا لٹھا اوڑھ لیا
اک بے اندازہ خاموشی
کافی دیر تلک دروازوں، درزوں، دلوں میں اور
ہونٹوں پر جمی رہی
سورج کی اک کرن نے دستک دے کر
آخر اس خاموشی کے پتھر کو توڑا
میں دیوار سے لگا ہوا تھا
فرشِ ذات کے مرمر پر، تم
عکسِ ذات کو آنچل کر کے
میرے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھی تھیں
اور ہمارے بیچ وہ گرگٹ
کٹی پتنگ کے گیلے لمس کو بھینچ کے اپنی مٹھی میں
جانے کب آ دھمکا تھا
میں نے دیکھا
اس کی ہر ہر پور میں دیمک رینگ رہی تھی
چشمے کے پیچھے سے اس کی مردہ آنکھیں
ہم دونوں کو گھور رہی تھیں
اور ہم دونوں
چپ کا کورا لٹھا اوڑھے سوچ رہے تھے
اُس کی لاش اٹھائیں کیسے!!!
ہم دونوں سے اُس کی لاش نہیں اُٹھ سکتی
ایدھی ٹرسٹ کے دفتر میں بھی
فون کی گھنٹی بجتے بجتے
اپنی چپ میں کھو جاتی ہے
[وقفہ]
دن کی دھڑ دھڑ لپٹوں میں
سڑکیں، چوراہے اور گلیاں، جل تھل ہیں
دھوپ کے ٹکڑے
دروازے اور کھڑکی سے
رینگ کے اندر آ بیٹھے ہیں
مجھ کو
تم کو
دیکھ رہے ہیں
اور ہمارے بیچ وہ گرگٹ
جس کی ہر اک پور میں دیمک رینگ رہی ہے
چشمے کے پیچھے سے اُس کی مُردہ آنکھیں
ہم دونوں کو گھور رہی ہیں
دھوپ کے ٹکڑے
ہم دونوں کو سینک رہے ہیں
[وقفہ]
گرگٹ کی مردہ آنکھوں سے
دیمک، رینگتے رینگتے آخر
ہم دونوں تک آ پہنچی ہے
اس دیمک سے ہم نے اپنی نیند اور خواب بچانے ہیں
لیکن کب تک!!!
گرگٹ اپنی لاش کے اندر پھیل رہا ہے
اس کی آنکھیں، سر اور ٹانگیں، لمبی ہوتی جاتی ہیں
میں تو اب یہ سوچ رہا ہوں

ایدھی ٹرسٹ کی گاڑی جب تک آئے گی
اگلی رات آ جائے گی
رات بھی رات اماوس والی
اندھی، بہری، کالی رات
چپ کی ٹُنگل مار کے کیسے کاٹیں گے ہم ساری رات
آج اگر ہم بچ بھی گئے تو......
کھا جائے گی اور اِک آنے والی سالی، دیمک زادی
بھوکی، پیاسی رات

دوسری نظم

بے وفائی کا گلہ
عکسِ وفا بن کے تری آنکھوں میں روشن دیکھا
ایک اُداسی
وقت کے ہاتھ سے چھوٹے ہوئے بچپن کی اُداسی
دیکھی
رُوکھے گالوں کے مساموں سے کہیں
کم سِنی
تیز دوپہروں کی طرح جُھلسی ہوئی
شام کے سُرمئی آنچل میں سمٹنے کے لیے
حجلۂ ذات سے اس طرح اُترتے دیکھی
جس طرح......چاند سمندر میں اُترنے کے لیے
زینۂ شب سے اُتر کر
تہہِ موج آتا ہے

ایوب خاور

تیسری نظم

مرے کمرے کی کھڑکی سے اُتر کر آنے والی روشنی
باہر سے کیسی لگتی ہے! میں نے کبھی دیکھا نہ تھا
اُس نے کہا......خاوؔر......
اِدھر دیکھو
اِدھر دیکھو مری آنکھوں میں گہرے زرد سورج کے
شکستہ عکس میں
جو ڈوبنے کا دکھ ہے، اُس کو دیکھو، پھر
کمرے میں جھانکو اور بتاؤ! میز کے اوپر
پڑے کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھی نظموں کی
سطروں اور اَدھوری خواہشوں پر کس طرف
سے آنے والی روشنی لپٹی ہوئی ہے!!
میں نے دیکھا
اُس کی آنکھوں میں کئی صدیوں کا گہرا زرد سورج تھا
کہ جس کا
عکسِ وارفتہ مری نظموں کی سطروں اور ادھوری
خواہشوں کی شام سے لپٹا پڑا تھا اور کمرا دونوں
سمتوں سے مقفّل تھا

ایوب خاور

چوتھی نظم

ایک انجانی سی خوشبو کا سخن
فون کی ریڑھ کی ہڈّی میں کہیں سے اُترا
اور وہ کانپ اٹھا
میں نے دیکھا کہ مرے فون کے مانیٹر پر
ایک میسج تھا کہ جس کا ہر لفظ
ادھ کھلے، سرخ گلابوں کی طرح دہکا ہوا
آتی جاتی ہوئی سانسوں کی طرح مہکا ہوا
ایک سرگوشی کا گل دستہ تھا
پتّی پتّی میں کسی عکسِ تمنّا کی جھلک
ہر رگِ جاں میں سلگتی ہوئی صد نوکِ پلک
اس کی آواز میں آواز ملانے سے لگا
جیسے اِک خواب سرا
جگ مگا اُٹھی ہو حرفوں کے دیوں سے یک بار
میں نے چاہا تو نہیں تھا لیکن......
لیکن اک ہفت دھنک، عکسِ قفس
جزوِ نفس!!

ایوب خاور

پانچویں نظم

ہَوا میں شام کی ملگج
دلِ صد وہم میں خاموش ہلچل
اور شجر شاخوں میں سورج کا پیالہ
اپنی کرنیں سبز پتّوں کے لبوں میں قطرہ در قطرہ
انڈیلے جا رہا تھا
اِدھر اک کار کے شیشوں سے چپکی گہری چپ تھی
اور سماعت میں تسلسل سے ترنم اور تحت اللّفظ کا
آمیزہ، رس بن کر ٹپکتا جا رہا تھا
ساز اور آواز کا اِک عکسِ زرّیں تھا
جو سر سے پاؤں تک اور دل سے دل تک، ہر رگِ جاں
میں اُترتا جا رہا تھا
اِسی عالم میں صدیوں کی مسافت
گردشوں کی شال میں لپٹی کہیں اوندھی پڑی تھی
ایک مدہوشی مرے پہلو میں دھک دھک کر رہی تھی
ایک مہتابی پیالے میں
کوئی شے تھی جو مجھ میں بھر رہی تھی
راستہ لیٹا ہوا تھا
جس کے سینے پر محبت چل رہی تھی

ایوب خاور

چھٹی نظم

سہ پہر سے شامِ سُرمگیں تک
اک فرشِ سکوت مِرمریں تھا
پوروں کی خفیف لرزشوں میں
ہونٹوں کی عمیق جنبشوں میں
اِک رنگِ جمال رُوبرو تھا
جو تجھ سے زیادہ خوبرو تھا
میں اُس کے مدار میں کھڑا تھا
اور آئینہ عکسِ آئینہ تھا
سہ پہر تو کب کی ڈھل چکی تھی
دروازے پہ شام آ ڈُھکی تھی
سانسوں میں روانی آتے آتے
مہ تاب میں جان آ گئی تھی

ایوب خاور

ساتویں نظم

دیوار، دریچے، آئینہ، سب
آنکھوں پہ گرا کے بھاری پلکیں
روکے ہوئے سانس، چپ کھڑے تھے
کمرے کی فضا کا نیم اندھیرا
صندل کی مہک سے جاں بہ لب تھا
صندل بھی سنہری رنگ صندل
ترشا ہوا سر سے نوکِ پا تک
نقطوں، کشوں، دائروں کے بل پر
اِک دودھیا آنچ کی تپش میں
دہکا ہوا سانس لے رہا تھا
پوروں کی سخن ادا خموشی
صندل کے گداز سے اَٹی تھی
اِک موجِ نشاطِ لمحہ لمحہ
ساون کی طرح برس رہی تھی

ناصر علی سید (پشاور)

بات کر کے دیکھتے ہیں

(غلام محمد قاصر کی غزل کے اشعار بزبان ستیہ پال آنند)

یادش بخیر، کوہاٹ سے تعلق رکھنے والے ایک بہت ہی اچھا شعر کہنے والے شاعر تواتر سے مشاعروں میں ایک شعر پڑھا کرتے تھے۔ اور بہت سی داد سمیٹنے کے بعد وہ اپنی غزلیں پیش کرتے تھے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ۔۔ بھائی یہ شعر تو مبارک شاہ کا ہے (نہ جانے کون دعاؤں میں یاد۔۔۔) تو کہتے جی ہاں مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ کہا گیا کہ اچھا لگتا ہے تو شاعر کا نام بتا دیا کرو۔۔ جواب دیتے ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کوہاٹ کے یہ شاعر خود بے حد عمدہ شعر کہتے ہیں، بہت پرگو ہیں اور کئی شعری مجموعوں کے خالق ہیں۔ اب اگر کوئی متشاعر یہ حرکت کرے تو اس کی وجہ بھی سمجھ آتی ہے مگر موصوف اتنے اچھے اور اتنے بہت سے شعر کہہ چکے ہیں کہ ان کا معیارِ کلام اور مقدارِ کلام بہت سوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر سکتا ہے۔ مگر بایں ہمہ وہ مشاعرہ میں (شاید) اعتماد حاصل کرنے اور اپنے طرفدار پیدا کرنے کے لئے پہلے مبارک شاہ کا شعر پڑھنے کی عادت بد میں گرفتار ہیں۔ ایک اچھے شاعر کی یہ بری حرکت (یا واردات) کی یاد مجھے یوں آئی کہ مجھے ایک ہی دن دو احباب کی طرف سے ایسی ہی ایک واردات کی خبر ملی۔ سب سے پہلے تو عزیز دوست حیدر قریشی نے جرمنی سے ای میل کے ذریعے اطلاع دی جسے میں نے فوراً عماد قاصر کو فارورڈ کر دیا۔ اور پھر وی آنا (آسٹریا) سے خوبصورت لہجے کے شاعر پروفیسر آفتاب حسین نے فون کر کے بتایا۔ مجھے یہاں ایک بار پھر یہ خوشی احباب سے شیئر کرتے ہوئے اچھا لگ رہا ہے کہ ''ادب سرائے'' بیرون ملک رہنے والے پاکستانی شعراء و ادباء میں بے حد مقبول ہے۔ اور ہر بار ٹیلی فون اور ای میلز کے ذریعے وہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ حیدر قریشی نے لکھا ''واشنگٹن امریکہ میں ہونے والے ایک کوی سیمیلن (مشاعرہ) میں افسانہ نگار اور نظم نگار ستیہ پال آنند نے شرکت کی اور اپنا کلام پیش کیا۔ یہ ویڈیو اس لنک پر دیکھی جا سکتی ہے۔ http://www.youtube.com/watch?v=bVXI0WWcv6g

بالکل شروع میں ستیہ پال آنند نے غزل کے دو شعر سنائے۔

بغیر اس کے اب آرام بھی نہیں آتا   وہ شخص جس کا مجھے نام بھی نہیں آتا
کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام   مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

اور ظاہر ہے یہ دونوں اشعار غلام محمد قاصر مرحوم کی مشہور اور مقبول غزل کے ہیں'' کم و بیش یہی بات پروفیسر آفتاب نے بھی فون پر شیئر کی۔ میں نے عماد قاصر کو حیدر قریشی کی ای میل اور لنک بھیج دیا۔ جس کے جواب میں عماد قاصر

نے لکھا:

''ناصر انکل، ستیہ پال آنند جی کو والد صاحب کے اشعار پڑھتا دیکھ کر حیرت ہوئی، والد گرامی سے ان کی ملاقاتیں بھی ہیں اور خط و کتابت بھی رہی۔ یہ ان کا نام لے کر پڑھتے تو خوشی ہوتی کہ انہوں نے اپنے دوست کو یاد رکھا ہوا ہے۔ یہ اشعار ۱۹۹۷ میں شائع ہونے والے ان کے مجموعے کے فلیپ پر موجود ہیں جب کہ اگست ۱۹۹۶ کے پی ٹی وی کے مشاعرے کا لنک میں بھیج رہا ہوں۔ جس میں ان کی اپنی آواز میں یہ غزل سنی جا سکتی ہے۔''

خیر اس کے لئے تو عماد جی کسی گواہ کی ضرورت نہیں کہ یہ شعر خود ہی غلام محمد قاصر کا نام لیتے محسوس ہو رہے ہیں۔ اب اس ستم ظریفی کو دیکھئے اس کوی سیمیلن میں غزل کے شعر وہ سنا رہا ہے جس کی وجہ شہرت ہی غزل دشمنی ہے۔ دیکھئے حیدر قریشی کو اس مشاعرے کی مکمل وڈیو کب ہاتھ لگتی ہے۔ یہ خوش گمانی تو ہے کہ کیا خبر انہوں نے قاصر مرحوم کا نام لیا ہو اور اس لنک میں نہ ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ اشعار سناتے ہوئے ستیہ پال آنند کے چہرے کے جو تاثرات ہیں۔ جو پھیکی پھیکی سی ہنسی ہے۔ شعر ایک جھجک کے ساتھ پڑھنے کا انداز ہے اور پھر پہلا مصرعہ غلط پڑھنا ہے۔ (بغیر اس کے تو آرام بھی نہیں آتا) اور داد کے جواب میں سست سا ردعمل ہے۔ یہ سب تو کچھ اور کہانی سناتا ہے۔۔ پھر بھی حیدر قریشی کی تحقیق کا انتظار کرتے ہیں اور اس امید کے ساتھ کہ عمران شاہد بھنڈر کو بیچ ادبی چوراہا کے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی تکلیف میں مبتلا کرنے کے بعد وہ اس محاذ پر بھی کامیاب و کامران ہوں گے۔

(مطبوعہ ادبی ایڈیشن **ادب سرائے** روزنامہ **آج** پشاور۔ ۳۰ ستمبر ۲۰۱۱ء)

احمد فراز اور دوسرے پاپولر شعراء پر ستیہ پال آنند ہمیشہ یہ اعتراض کرتے رہے کہ وہ ادب سے بالکل بے بہرہ خواتین کے جمگھٹے میں گھرے رہنے کو اپنی ادبی مقبولیت شمار کرتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ کہیں انہیں احمد فراز جیسے انداز کی سوفی صد نہ سہی پانچ سات فی صد بھی ایسی سہولت میسر آئی تو آپ بھی ویسے ہی اسے ادب کی ترویج اور اپنی ادبی مقبولیت شمار کرنے لگے۔ اور آپ کا لکھا ہوا سارا حق، سچ دھرے کا دھرا رہ گیا۔۔۔ بالکل بے وزن شاعرات کی غزلوں پر نہ صرف اصلاح دی جاتی ہے بلکہ کتاب کی اشاعت کے بغیر کتاب کی جعلی تقریب رونمائی جان بوجھ کر کرتے ہیں۔۔۔۔ ادبی دنیا میں اصولوں کے نام پر کہنا کچھ اور کرنا کچھ۔۔۔ ان کی انسانی کمزوریاں ہیں۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ وہ مشاعرہ بازی، تقریباتی رنگ بازی اور ادب میں (متشاعر ٹائپ) خواتین کے کردار کے حوالے سے اپنی بیان کردہ جن باتوں کو چھوڑ گئے ہیں، میں آج بھی اُن پر قائم ہوں۔ اور ان کے مضمون کے ذریعے ان کا سکھایا ہوا سبق آج خود انہیں یاد دلا رہا ہوں! لیکن ڈاکٹر ستیہ پال آنند اپنی لکھی باتیں بھُولے نہیں ہیں، جنہیں سب کچھ یاد ہو انہیں یاد دلانے کا فائدہ؟۔۔۔ یاد دلانے کا کوئی فائدہ نہیں تو کچھ احساس ہی دلا دیا جائے۔ یہ مضمون احساس دلانے کی ایک کاوش ہے۔ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے تری بات!

(اقتباس از ''**ستیہ پال آنند سے لاگ اور لگاؤ**'' از **حیدر قریشی** مطبوعہ روزنامہ **ہمارا مقصد** دہلی شمارہ: ۶ ستمبر ۲۰۱۰ء)

ہاجرہ بانو (اورنگ آباد)

دائرہ دھنک

دائرہ! کائنات کی تخلیق اور دائرہ شاید ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ان ناچیز عقل کا یہ گمان ہے کہ شاید اس کائنات کو بناتے وقت اس ذات واحد کے ذہن میں بھی دائرہ رہا ہوگا اس لیے اس نے کائنات کی ساری اہم اشیاء کی شکل دائرہ رکھی ہے۔ ذرا دیکھئے زمین دائرہ، سورج دائرہ، چاند دائرہ، مشتری دائرہ، مریخ دائرہ، زہرہ دائرہ، زحل دائرہ (اس کا دوہرا گھیرا بھی دائرہ یعنی ڈبل دائرہ) یورینس، پلوٹو، نیپچون غرض نظام شمسی کے تمام سیارے وستارے دائرے کی شکل رکھتے ہیں۔

حال ہی میں ۷ا فروری ۲۰۰۴ء کی نیوز کے مطابق دکھایا جانے والا نیا بلیک ہول (Black Hole) بھی ایک وسیع وعمیق تاریک دائرہ ہی ہے جس میں کئی ستارے ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ آسمان کے تمام ستاروں اور سیاروں کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ ان سب کی شکل گول یعنی دائرہ نما ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ سب بحکم خداوندی دائرہ نما گردش بھی کرتے ہیں۔ ناسا (NASA) کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ تمام سیاروں پر طوفانوں کے وقتاً فوقتاً دائرے نظر آتے ہیں۔ خلاء میں گھومنے والے تحقیقاتی مصنوعی سیاروں کو بھی دائروں ہی میں گھومنا پڑتا ہے۔

آیئے سیاروں کی دنیا سے زمین کی دنیا پر آتے ہیں۔ گول زمین کے اطراف اوزون کا غلاف بھی دائرے کی شکل رکھتا ہے۔ انسانی ذہن کی تخریب کاریوں کی وجہ سے اس میں ہونے والا شگاف بھی دائرہ نما ہے جس سے خدا کی اس خوبصورت دائرہ نما زمین پر کئی نئی بیماریوں نے اپنے دائرہ نما جراثیم کے ساتھ جنم لیا جس کا شکار انسان اور حیوان یکساں ہوتے ہیں، یہاں تک کہ نباتات پر بھی اس کا اثر ہوا۔ اوزون کی پرت میں پڑنے والا یہ شگاف ہماری زمین کے نقشے میں موجود براعظم آسٹریلیا کے عین اوپر واقع ہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ خیر چلئے زمین کے کرۂ ہوا کے بارے میں تو بات ہوگئی۔ اب باقی بچے ہوئے دو کروں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

کرۂ آب اور کرۂ حجر۔ کرہ آب دائرہ نما زمین کا ۲/۳ فیصد حصہ گھیرے ہوئے ہیں جس میں چار بڑے بحر شامل ہیں۔ آسمان کی اونچائیوں سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی دائرہ نما شکل رکھتے ہیں۔ حالات کے تھپیڑوں کے دائروں میں سمٹ کر کوئی بڑے تو کوئی چھوٹے ہوگئے۔ کسی نے بیضوی شکل اختیار کرلی تو کوئی ہواؤں کے دائروں

میں گھوم کر کٹے پھٹے رہ گئے۔ زمین کا قشر ارض جو چٹانوں سے بنا ہے زندگی کے تلخ راستوں کی طرح پتھریلا ہے جس کی سطح کہیں بلند ہے تو کہیں پست، جیسے ہماری زندگی کے نشیب وفراز ہوں۔ اس قشر ارض کا ۱/۳ حصہ بھی دائرہ نما ہے۔

خدا کی اس دائرہ نما زمین پر اپنی آسانی کے لیے انسان نے کچھ دائرے کھینچ دیئے ہیں۔ جنہیں عرض البلد اور طول البلد کہتے ہیں۔ جن کی مدد سے ممالک کے نقشے آسانی سے بنا لیے گئے اور ان ممالک کے اپنے اپنے جائز و ناجائز اختیارات کا استعمال کرنا شروع ہوگیا۔ دوسروں کی زمینوں پر قبضہ جمانے کے لیے لڑائیاں لڑی گئیں، انسانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم اس کی مثالیں ہیں۔ اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے یہ جنگیں شروع ہی سے جاری ہیں اور شاید قیامت تک جاری رہیں گی۔ زمین کا اندرونی دائرہ پگھلے ہوئے گرم سیال مادے سے بھرا ہوا ہے۔ زمین کے اندرونی خول میں ایک اور دائرہ پنہاں ہے جو زمین کی ساری مقناطیسیت کو قائم رکھتا ہے۔

ہر کوئی ہوا کی اہمیت جانتا ہے کیونکہ اس کے بغیر زندگی محال ہے۔ سائنسی زبان میں ہر گیس کو فارمولوں کے دائروں میں قید کیا گیا۔ ہوا کو بھی نہیں بخشا گیا اور شاید گیس سے زیادہ اس کی اہمیت کو سمجھا گیا اس لیے آکسیجن کے لیے "O" کا استعمال بطور فارمولا کیا جاتا ہے۔ یہ ''او'' خود دائرہ نما شکل ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دائرہ یعنی آکسیجن زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے۔

علم ہندسہ کے عمل میں دائرے کی اہمیت سے کون واقف نہیں ہے۔ ریاضی میں صفر کے دائرے کے وجود کے وزن سے کون انکار کرسکتا ہے۔ بینک کے معاملات میں روپے پیسے کے لین دین میں اگر ایک صفر زائد ہوجائے یا کم ہوجائے تو مصیبت آجاتی ہے۔ جغرافیائی دائرے یعنی نظام شمسی اور زمین کے دائرے تو آپ جان ہی چکے ہیں۔ تاریخ اپنے اچھے برے ادوار دہرا کر اپنے دائرے پورے کرتی ہے۔ لٹریچر دائروں سے گھرا ہے۔ ہر دائرے سے ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے اور ہر کہانی کوئی ایک کردار کے دائرے کے اطراف گھومتی ہے۔ اس کے ساتھ کئی ضمنی ادارے کریکٹر ایکٹر کی شکل میں چلتے ہیں۔ سیاح اپنے آپ میں خود ایک دائرہ ہوتا ہے۔ اپنے سفر کے دائروں سے وہ قارئین تک دوسرے ممالک کے حالات پہنچاتا ہے۔ مصور اپنے برش اور رنگوں کے دائروں میں قدرت کے رنگ سمونے کی کوشش کرتا ہے۔ رقاص اپنے قدموں کے تھرکتے دائروں سے حاضرین کے جذبات کے دائروں کو جھنجھوڑتا ہے۔ بناؤ سنگھار کرکے خوبصورت وحسین صنف نازک دیکھنے والوں کو اپنے حسن کے دائرے میں قید کرلیتی ہے اور اسے دیکھنے والا اس کے زیورات کے دائرے میں کھو جاتا ہے جیسے اس کی بندیا، بالوں کا جوڑا، اس پر سجا ہوا پھولوں کا مہکتا گجرا، چوڑیاں، کنگن، گلے کا ہار، گلوبند، کانوں کی بالیاں، پازیب، انگوٹھیاں، بچھوے، کمر بند، بازوبند وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام زیورات دائروی شکل رکھتے ہیں۔ علم نجوم تمام گول سیاروں کے اطراف گھومتا ہے۔ ماہر عملیات شیاطین کو مقید کرنے کے لیے زمین پر دائرہ بنا کر اس کی حصار بندی کرتے

ہیں۔ بچہ جب اپنی زندگی کے حسین دور یعنی بچپن میں ہوتا ہے تو زندگی کے تلخ دائروں سے بہت دور ہوتا ہے۔ وہ صرف پانی میں کنکریاں مار کر دائرے بنانے، پانی میں کاغذ کی ناؤ چلانے، تختی پر دائرے بنا کر اس میں آنکھ، کان، منہ بنانے، گول جھولوں میں جھولتے ہوئے دائرے بنانے، غذا کے گول بنا کر کھانے، شکر کی گول گول گولیاں کھانے، بتاشے کھانے، تاشے بجانے اور گاڑی کا گول پہیہ چلانے میں مصروف ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے ذہن کے دائرے بھی وسیع ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے رشتوں کے دائرے اسے اپنے شکنجوں میں کسنا شروع کرتے ہیں پھر اس کی زندگی کا دائرہ بڑا ہونا شروع ہوتا ہے اور وہ رشتوں کے دائروں کی اہمیت جان کر اور خود کو کولہو کا بیل سمجھ کر ذریعۂ معاش کے لیے دائرے بنا بنا کر دائرے والے سکے کمانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پھر اسے زندگی میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری صرف دولت کا دائرہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس وقت اسے دائرہ نما چندا ماما کی کہانیوں اور نغموں میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ اب وہ صرف چاند کی طرح نظر آنے والے روپہلی سکوں کی خواہش میں مگن رہتا ہے۔ انہیں تکالیف کے دائروں میں سے گزر کر اسے دائرہ والی گول روٹی نصیب ہوتی ہے۔ جسے کھا کر وہ اپنی بھوک مٹاتا ہے تب وہ اچھی طرح جان لیتا ہے کہ زندگی صرف دائروں کا چکر ہے اور انسان کو پیدائش سے لے کر مرنے تک دائروں میں ہی مقید رہنا ہے۔ کیونکہ خدا نے اس کا وجود ایک نقطے سے شروع کر کے اجل کا دائرہ بھی اس کے اطراف پھیلا دیا ہے۔ لقمہ اجل بننے کے بعد اس کی روح دوبارہ خلاء کی تاریکیوں کے دائرے میں قید ہو جاتی ہے اور یہ خدا کی عظیم الشان قدرت کا لامتناہی دائرہ ازل تا قیامت جاری رہے گا۔ ان دائروں کی نہ کوئی سرحد ہے اور نہ اس کا کوئی خاتمہ۔ بظاہر معمولی نظر آنے والا یہ دائرہ جو اپنے اندر ساری کائنات سمیٹے ہوئے ہے، دکھاتا ہے کہ جو بھی خدا کے احکامات کے دائرے میں رہ کر اس کی پیروی کرے گا اس کی زندگی کا دائرہ اور آخرت کا دائرہ بھی معطر ہوگا اور جو اس کی نشانیوں کو جھٹلائے گا اس کی طاقت سے انکار کرے گا، خود کو خدا سمجھنے کی بھول کرے گا تو خدا کے قہر و غضب کا دائرہ اس کے اطراف تنگ ہو کر اسے نیست و نابود کر دے گا۔ اس لیے اس ناچیز انسان کو چاہیے کہ غرور و تکبر کے دائرے کو خود سے دور رکھے اور اپنے اطراف نیک اعمال کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرے اور خود کو پاتال کی گہرائیوں کے داروؤں میں گرنے سے بچائے۔

دائرہ! اپنے اندر قدرت کا گہرا مفہوم لیے
دائرہ! اپنے اندر ایک بے پناہ طاقت چھپائے ہوئے
دائرہ! اپنے اندر حق و باطل کی کہانیاں دہراتے ہوئے
دائرہ! خانہ کعبہ کا طواف
دائرہ! ایک روٹی
دائرہ! ایک رکابی

دائرہ! ایک چمکتا سکہ
دائرہ! پیاس بجھانے کا پانی کا گھڑا
دائرہ! دور دراز سے گفتگو کرنے کے آلہ کا وائر
دائرہ! آمد و رفت کے وسائل کے پہیے
دائرہ! قومی پرچم میں اشوک کے چکر
دائرہ! کوہساروں میں آواز کی گونج کا ہالہ
دائرہ! آسمانوں میں سات رنگوں کی دھنک

یہ سب کچھ دائرے ہی تو ہیں اور انسان ان دائروں میں الجھا ہوا ایک اور دائرہ۔

غرض اس موضوع پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ اس چھوٹے سے لفظ کی گہرائی دیکھنے کے لیے ہر بشر کی آنکھوں کے دائرے چھوٹے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ہاجرہ بانو

آبِ حیات

سکندرِ اعظم کو پوری دنیا فتح کرنے کا جنون تھا۔ عمر لمبی نہ ہو تو یہ کام جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ مگر قدرت کا کرنا یہ کہ جہاں ایک کم سن کے چھوٹے سے دل میں اتنی بڑی خواہش کو جنم دیا وہیں اس کی عمر کے کالم میں کوتاہی سے کام لیا۔ اس کی کیا وجہ تھی یہ وہی جانے۔ ہم اس کی قدرت کو تھوڑا ہی سمجھ سکتے ہیں۔ سنا بلکہ پڑھا بھی ہے کہ سکندر نے اپنی عمر میں اضافہ کرنے کے لیے آبِ حیات کا دریا بھی تلاش کر لیا تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر رک گیا کہ اس سے پہلے جن لوگوں نے آبِ حیات پی رکھا تھا وہ موت کی آرزو کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے ہاتھوں میں لیا ہوا آبِ حیات پھینک دیا۔ ویسے لوگ اپنی عمر میں اضافہ کرنے کے لیے ہزاروں جتن کرتے ہیں۔ ورزش کرتے ہیں مخصوص یوگاسن کرتے ہیں۔ مختلف قسم کی ادویات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ ایسی چیزوں کا پرہیز کرتے ہیں جن سے عمر کے ایام میں کمی ہو مثلاً ڈرگس، سگریٹ، تمباکو پان وغیرہ۔ ویسے ان چیزوں سے احتیاط کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن جو اپنی عمر جتنی لکھا کر لاتا ہے وہ ہر حالت میں اسے پورا کرتا ہے چاہے دنیا والے اس سے بیزار ہو جائیں یا وہ دنیا والوں سے بےزار ہو جائے۔

بہت ساری کمپنیوں کے اشتہارات میں اپنے مال کی فروختگی کے لیے عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ پائیداری کے ساتھ ہم قدم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ انسان کی زندگی کی کوئی گیارنٹی نہیں ہے۔ وہ عمر بھر چلنے والے پائیدار مال کو لے کر کیا کرے گا؟ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ سب سے سستی چیز اگر کوئی ہے تو وہ ہے انسانی خون جو پانی کی طرح اور پانی کے لیے بہایا جاتا ہے۔ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ قاتل اگر کسی کے خون کا ارادہ بھی رکھتے ہوں اگر وہ انجام سے باخبر ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ کھیتوں کے قریب یہ کام انجام دیں تاکہ کھیتوں میں کھاد کی فراہمی بھی آسانی سے ہو سکے۔ آج کل کاشتکار پانی کی قلت اور کھاد کی مہنگائی سے بہت پریشان ہیں۔ بیچاروں کا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

ایک اشتہار کچھ دن پہلے نظروں سے گزرا۔ زندگی بھر کے لیے ''پائیدار'' ہم سفر۔ اگر ''پائیدار'' شریک حیات کی تلاش ہو تو ہمارے یہاں آیئے۔ پتہ............۔ ہماری طبیعت میں موجود تجسس کے کیڑے حرکت میں آ گئے، سوچا چلو چل کر ذرا دیکھ تو لیں۔ اب تک تو سنا تھا اور پڑھا تھا کہ نیک، خوبصورت، خوب صورت، صوم وصلاۃ کی پابند وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ سے اشتہارات مزین ہوتے تھے۔ یہ ''پائیدار'' شریک حیات آخر کیا بلا ہے؟ اگر سکندر یہ اشتہار پڑھ لیتا تو ہمارا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلا پیام اس کا ہی پہنچتا۔ خیر جب ہم اس آفس کے منیجر کے ہاں گئے تو اس نے خلاف توقع چائے وبسکٹ سے تواضع کرنے کے بعد ہماری ناقص معلومات میں اضافہ کیا:

''اگر بیوی نیک ہو، خوبصورت ہو، صوم وصلاۃ کی پابند بھی ہو یا پھر اگر پڑھی لکھی یا جاہل ہو لیکن اگر (لیکن اگر کے الفاظ پر انہوں نے اتنا زور دیا تھا کہ ان کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں) اس میں ''پائیداری'' نہ ہو تو وہ کس کام کی؟''

پائیداری کے لفظ کو انہوں نے اتنی زور سے چبا کر کہا کہ ان کے منہ میں موجود پان کی سپاری چورا چورا ہو گئی۔ لیکن پھر بھی ان کی بات ہمارے سر پر سے یوں گزر گئی جیسے رن وے پر سے ہوائی جہاز۔ ہم نے ذرا اطمینان اور تفصیل سے وضاحت طلب کی۔ منیجر صاحب نے اپنی دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے ایک فلسفیانہ مسکراہٹ کے ساتھ وضاحت کی اور کہا ''ہمارے معاشرے میں شوہر سے علیحدگی ایک عام بات ہے۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شادی کے بعد عمر بھر آپ کی بیوی آپ کا ساتھ دے گی۔ ہمارا ادارہ ایک اسپیشل ادارہ جو ایسی ''پائیدار'' خواتین فراہم کرتا ہے جو اپنی پائیداری کے وعدے کو سات جنموں تک نبھاتی ہیں۔''

ان کی بات ہماری سمجھ میں اچھی طرح سے آ گئی اور ہم نے گرہ میں باندھ لی کہ اگر کسی کے لیے رشتہ ازدواج کی ضرورت پڑے تو ان ہی موصوف کو تکلیف دیں گے۔ جب ہم آفس سے باہر نکلے تو چپراسی نے وداعی سلام کرتے ہوئے کہا کہ اگر پائیدار بیوی مل بھی گئی لیکن خود آپ کی زندگی ناپائیدار ہو تو.....؟

یہ سن کر ہم لاجواب ہو گئے۔ ☆☆☆☆☆

نذیرؔ فتح پوری۔ اجمالی تعارف

نام	:	نذیرؔ احمد خان جوڑ
والدین	:	حاجی ابراہیم خان جوڑ۔ جنن سائرہ بی مرحومہ
وطن	:	فتح پور شیخاواٹی، ضلع سیکر راجستھان
سن پیدائش	:	یکم دسمبر ۱۹۴۶ء، بمقام محلّہ زمینداروان، خانجی کی حویلی، فتح پور شیخاواٹی۔ راجستھان
تعلیم	:	درجۂ پنجم۔ اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور شیخاواٹی
تلمذ	:	عتیقؔ احمد عتیقؔ، کالی داس گپتا رضاؔ۔

انعامات واعزازات

☆ ۱۹۹۲ء میں راجستھان اردو اکیڈمی کا ایوارڈ۔

☆ ۱۹۹۳ء میں آل انڈیا میر اکیڈمی یوپی کی جانب سے شعری مجموعہ 'تیسرا سفر' پر 'میر تقی میر' ایوارڈ۔

☆ ۱۹۹۵ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی جانب سے 'لفظوں کے سائے تلے' پر انعام۔

☆ ۱۹۹۹ء میں پونے میونسپل کارپوریشن کی جانب سے پونے کے میئر کے ہاتھوں اعزاز اور مومنٹو۔

☆ ۲۰۰۰ء میں راجستھان اردو کیڈمی کی جانب سے 'جگن ناتھ آزاد۔ ایک مستقل ادارہ' پر انعام۔

☆ ۲۰۰۰ء میں بہار ساہتیہ سند سمستی پور کی جانب سے 'جگن ناتھ آزاد۔ ایک مستقل ادارہ' پر ''خواجہ احمد عباس ایوارڈ''۔

☆ ۲۰۰۱ میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو کیڈمی کی جانب سے 'نیا دن پھوٹ کر نکلا' پر انعام۔

☆ یکم جون ۲۰۰۰ کو اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور کی جانب سے عوامی جلسے میں ایس ڈی ایم جناب اے ڈی۔ مہرڈا کے ہاتھوں سپاس نامہ اور شال دے کر اعزاز کیا گیا۔

☆ ۲۰۰۷ء یوپی اردو اکادمی کی جانب سے 'کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر' پر انعام

☆ ۲۰۰۹ء علامہ شبلی ایوارڈ، حمد نعت اکیڈمی دہلی کی طرف سے

اور متعدد دیگر ایوارڈز

خصوصی اشاعت

☆ سہ ماہی 'توازن' مالیگاؤں گوشہ روز نامہ 'مفسر' اورنگ آباد گوشہ

☆ سہ ماہی 'سفیر اردو' لیوٹن برطانیہ گوشہ سہ ماہی تکمیل۔ممبئ گوشہ

ریسرچ

☆ مقالہ برائے ایم فل بعنوان 'نذیر فتح پوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ' ازمحمد عارف بھاٹی۔
نگراں ڈاکٹر روشن اختر کاظمی۔راجستھان یونیورسٹی جے پور

☆ مقالہ برائے Ph.D بعنوان نذیر فتح پوری۔حیات اور خدماتِ ادب' ازمحمد ناصر اللہ انصاری
نگراں۔: ڈاکٹر حامد اشرف۔سوامی وویکا نند یونیورسٹی ناندیڑ،مہاراشٹر

درسی کتب

☆ NDAپونہ کے نصاب اردو برائے فوج میں نظم۔

☆ راجستھان کے نصاب اردو برائے چہارم میں نظم 'ہم پر وطن کو ناز ہے' شامل ہے۔

☆ راجستھان کے نصاب اردو برائے درجہ ششم میں نظم 'نیا عہد نامہ' شامل ہے۔

☆ راجستھان کے نصاب اردو برائے دہم میں ایک نظم 'خاکِ وطن' شامل ہے۔

☆ ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی کتاب 'اردو ادب میں بچوں کی اینتھولوجی، میں ''بچوں کی غزل'' شامل ہے۔
(مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

ادارت

اٹھائیس سال سے سہ ماہی ادبی رسالہ 'اسباق' شائع کر رہے ہیں۔

کتابوں کی اشاعت

'اسباق پبلی کیشنز' پونہ کے زیر اہتمام غیر تجارتی طور پر احباب کی ۶۶ کتابیں شائع کر چکے ہیں۔

رابطہ :

Nazeer Fatehpuri
'Saira Manzil',230/B/102, Viman Darshan , Sanjay Park,
Lohgaon Road, Pune 411 032. M.S.
M : 0091-9822516338
E-Mail: nazir_fatehpuri2000@yahoo.com

نذیر فتح پوری کی تصانیف......

ناول

۱) چٹانوں کے بیچ۔۱۹۷۵ء
۲) زخم اور آہیں ۱۹۷۷ء

شاعری

۳) بچو! آؤ گیت سنائیں۔۱۹۸۳ء
۴) لمحوں کا سفر (غزلیں)۔۱۹۸۵ء
۵) غزل اندر غزل (آزاد غزلیں)۔۱۹۸۸ء
۶) سفر تا سفر (غزلیں)۔۱۹۹۱ء
۷) تیسرا سفر (غزلیں)۔۱۹۹۳ء
۸) ریگِ رواں (ماہیے)۔۱۹۹۷ء
۹) اکرام (نعت)۔ ۱۹۹۸ء
۱۰) نیا دن پھوٹ کر نکلا (شاعری)۔۲۰۰۰ء
۱۱) مٹھی بھر ماہیے (ماہیے)۔ ۲۰۰۱ء
۱۲) یہ زمین میری ہے (ہندی)۔۲۰۰۳ء
۱۳) مرے گیت اکیلے رہ گئے۔۲۰۰۴ء
۱۴) سفر مدام سفر ۲۰۰۸ء
۱۵) ثنائے جلیل ۲۰۰۸ء

نثر

۱۶) لفظوں کے سائے تلے (مضامین)۔۱۹۹۵ء
۱۷) جگن ناتھ آزاد۔ایک مستقل ادارہ۔۱۹۹۸ء
۱۸) اردو افسانے کی مقبول ترین آواز۔۱۹۹۹ء
۱۹) جہانِ گیتا رضا۔۱۹۹۹ء
۲۰) غالبؔ، گیتا رضؔا اور سنجے گوڈبولے۔۲۰۰۰ء
۲۱) ریزہ ریزہ دل (منی افسانے)۔۲۰۰۵ء

تاریخ و تذکرہ

۲۲) تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی۔۲۰۰۳ء
۲۳) شعرائے پونہ۔ایک تحقیق۔ ۲۰۰۵ء

نذیر فتح پوری کی نثر کی مزید تین کتابیں اور دس مرتب کردہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔نظم و نثر کی ۳۴ کتابیں زیرِ ترتیب ہیں۔ان کے فکر و فن پر مختلف ادیبوں نے اب تک دس کتابیں مرتب کر کے شائع کی ہیں۔

تاثرات

☆ **ڈاکٹر وزیر آغا**...............لاہور ۸؍دسمبر ۲۰۰۲ء

بے حد ممنون ہوں کے آپ نے مجھے ''مٹھی بھر ماہیے'' کے متعدد نسخے ارسال کیے۔ میں نے ان میں سے ڈاکٹر انور سدید کو ان کا نسخہ پہنچا دیا ہے اور باقی نسخے احباب میں تقسیم کر دیے ہیں۔ احباب نے آپ کی اس کاوش کو بے حد سراہا ہے اور آپ کو اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے، مبارکباد!

میرے لیے آپ کی یہ کتاب ایک محبت بھرا تحفہ ہے۔ کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔ خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے ٹوٹ کر پیار کرنے والے دوست حاصل ہیں ورنہ نفسا نفسی کے اس عالم میں ہر شخص کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ آپ نے یہ کتاب لکھ کر جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا ہے اس کی میں دل و جان سے قدر کرتا ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

....

☆ **شمس الرحمن فاروقی** ....۔الہ آباد

محفلِ عشرت سے تو اٹھوا دیا   دشتِ غربت سے بھی اٹھوا دے مجھے
آنکھ کی پہنائی میں جھانک   پھر جو چاہے منظر دے
آسمانی عذابوں کو موت آ گئی   جب سروں سے دوپٹے ہٹائے گئے

سبحان اللہ! بس ذرا انتخاب میں تھوڑی سی سختی اور کر ڈالتے تو کیا خوب ہوتا۔ اوپر کے تین شعروں جیسے شعر زیادہ ہونا تھے۔ ہیں تو بہت سے لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ ناجنس بھی ہیں۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ مجموعہ بہت کامیاب رہا۔

....

☆ **رضا نقوی واہیؔ** پٹنہ

یہ حقیقت ہے کہ آپ چند فنکاروں نے نئی شاعری کو جو آب و تاب بخشی ہے اس سے اردو کے وزن و وقار میں بلندی آئی ہے۔ ورنہ اس صدی کی چھٹی دہائی میں بے راہ روی، زبان کی شکست و ریخت اور ابلاغ و ترسیل کی بے معنویت نے کم از کم مجھ جیسے ۷۴؍برس کے بوڑھے کو تو حواس باختہ کر دیا تھا۔ جدید شاعروں کے ساتھ ساتھ جدید نقاد بھی لنگوٹ باندھے میدان میں اتر آئے تھے جو جدید شاعری کو اپنی تحریروں کے لمبے لمبے بانسوں کے ذریعے آسمان پر چڑھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ جدیدیوں کے لشکر میں آپ

جیسے فنکار بھی خال خال موجود تھے، جنھوں نے ساتویں دہائی تک آتے آتے شعری افق کی گھٹا ٹوپ تاریکی کو آہستہ آہستہ اجالے میں تبدیل کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کا شاعر، عصری مسائل کا آئینہ دار بن گیا ہے۔

آپ کا کلام پڑھنے کے بعد مجھے اطمینان سا ہو گیا ہے کہ اب ''برج بانو'' کی آبرو آپ جیسے ہوشمند حضرات کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گی۔

....

☆ **بشیر بدر**...................بھوپال

آپ کی غزلوں کا مجموعہ ''تیسرا سفر'' ملا۔ کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار دو چار اور نئے اور انوکھے شعر مل جاتے ہیں۔ آپ کی غزل میں وہ اکثر خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے غزل اپنے عہد میں اپنے بعد کے زمانے میں بھی زندہ رہتی ہے۔ آپ نے یہ مجموعہ بھیج کر کرم کیا ہے۔ امید ہے آپ خیریت سے ہونگے۔

....

☆ **مجروح سلطان پوری**....................بمبئی

کتاب کا تحفہ کسی تحفۂ سعادت سے کم نہیں، شکریہ۔ آپ کی شاعری نئے استعاروں کی تلاش ہے۔ اور آپ ابھی اسی میں منہمک ہیں اور ٹھیک بھی ہے۔ جب قلم اور لفظ پر گرفت مکمل ہو جائے تو معانی اور اس کے نئے نئے زاویوں کا مشاہدہ اور اس مشاہدے کے ذریعے ہَوا کے تازہ جھونکے کی طرح تعمیر کردار انسانی کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی نشاط پسندی تخریب میں بھی تعمیر کے آب و رنگ ڈھونڈ نکالنے کی کوشش ایک مبارک عمل ہے۔ اللھم زد فزد۔ آپ جس کی جستجو میں ہیں منزل صاف نظر آ رہی ہے۔ اب رسائی زود یا بدیر آپ کی سعی رفتار پر منحصر ہے۔ آپ اپنے سفر کا خاصا حصہ طے کر چکے ہیں۔ دیکھ لینا ایک دن میں مسکراؤں گا بہت۔
پہلے مصرعے کو یہاں کالعدم سمجھ رہا ہوں۔

....

☆ **ڈاکٹر اُمے سرن ارمانؔ** بلہاری مراد آباد

آپ کے دونوں ناول مجھے خیریت کے ساتھ مل گئے۔ اس وقت تک میں نے قریب قریب دونوں ناول پڑھ لیے ہیں۔ ''چٹانوں کے بیچ'' جو آپ کا سب سے پہلا ناول ہے تھیم کے لحاظ سے بہت ہی اچھا ناول ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی لکھا ہے نہایت کامیابی کے ساتھ لکھا ہے۔ شاعر نثار کم ہوتے ہیں اور اچھے شاعر اچھے نثار ہوں یہ بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ربّ العالمین نے آپ کو یہ دونوں صفات عطا فرمائی ہیں۔ مجھے تو دونوں ناول بے حد پسند آئے ہیں۔ ایسے معیاری اور اصلاحی ناول کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایسے ناولوں پر فلمیں بنیں اور سرکار انعام سے نوازے تو دیش کی کایا پلٹ ہو جائے مگر افسوس ہمارے ملک میں قدرداں ہی نہیں ہیں جو کچھ ہو رہا

ہے وہ سب سیاست کی ساحری سے متاثر ہو کر ہو رہا ہے۔

....

☆ **پروفیسر عنوان چشتی** دہلی

نذیرؔ فتح پوری اردو کے ان جیالے شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے زندگی کو برتا ہے اور اپنے وجود کا تجربہ کیا ہے۔انھوں نے اپنے داخلی کوائف اور جذبات کو خارجی علامتوں، پیکروں اور لفظیات کے ذریعے مجسم کیا ہے۔اس عمل میں انھوں نے روایت سے روشنی اور تجربے سے تازگی حاصل کی ہے۔یہی خصوصیت نذیرؔ کو ان کے ہم عصروں میں اہم جگہ دیتی ہے۔

....

☆ **بلراج کومل** دہلی

آپ کا کلام میں رسائل میں دیکھتا رہتا ہوں۔ایک ساتھ بہت سی چیزیں پڑھیں تو طبیعت سرشار ہوگئی۔آپ کے کلام میں ایک آزاد اور کھلی فضا کی کیفیات ہیں۔آپ منجمد اور مصنوعی سلاسل سے آزاد ہیں۔ خدا کرے آپ کا تخلیقی سفر آپ کے لیے ہمیشہ جمالیاتی مسرتوں کا سرچشمہ بنا رہے۔میری دلی مبارکباد۔

وہ کہکشاں بدست مرے گھر جو آ گیا　　گھر کی ہر ایک چیز اجالوں سے بھر گئی

آپ کے فکری تجسس، عصری احساس اور زیرزمیں منکسر مزاجی نے آپ کے کلام کو حسن و وقار کی دولت عطا کی ہے۔خدا آپ کو خوش رکھے۔

....

☆ **فضا ابن فیضی** مونا تھ بھنجن

برادرم عزیز ومکرم۔۔۔۔۔دعائیں

آپ کے شعری مجموعے کا دلکش تحفہ ''لمحوں کا سفر'' ملا۔دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔مبارک ہو۔سرورق کا یہ شعر دل کو چھو گیا۔

مجھ کو حیرت ہے کہ اک اُمّی لقب　　لفظ و معنی کا پیمبر بن گیا

بلاشبہ تہذیبی تسلسل کے کہکشاں زار سے جگنوؤں کے شبستاں تک، نیم روشن دائروں کا ایک حسین سلسلہ ہے۔جس سے ''لمحوں کا سفر'' عبارت ہے۔اس طرح شوق اور توجہ سے کہتے رہیے۔مشق ومزاولت کی گرمی سے اس رنگ میں اور چمک دمک پیدا ہوگی اور اسلوب نکھرتا جائے گا۔آپ میرے محبّ مخلص جناب عتیق احمد عتیق کے شاگرد رشید ہیں۔اس تعلق سے بھی آپ میرے دل سے قریب ہیں۔مجھے توقع ہے کہ اردو کے ذہین قارئین آپ کے فنی اکتسابات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

....

ریاض بجنوری (پونہ)

نذیرؔ فتح پوری۔ایک مینارہ آدمی

نذیر صاحب کی پیدائش فتح پور شیخاواٹی ضلع سیکر راجستھان کے ایک مسلم راجپوت گھرانے میں یکم دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہوئی تھی۔محنت اور جفاکشی ان کے خون میں شامل ہے۔زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی ان کا کردار ان کے خون کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے وہ سخت محنت کرتے ہیں جس کے عوض بہت سی کامیابی بھی ان کے حصے میں آئی ہے۔لیکن اپنے آپ کو وہ زبان وادب کا ایک ادنیٰ خادم اور طالب علم ہی تصور کرتے ہیں حالانکہ انڈو پاک کے ممتاز ومعتبر اہل قلم نے ہزاروں صفحات ان کی شاعری اور دیگر اصناف پر لکھ کر ان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔دوسری طرف اعجاز واکرام کی ہلکی بونده باندی بھی ان پر ہوتی رہتی ہے۔اس میدان میں ابھی تک وہ موسلا دھار برسات کا لطف نہیں اٹھا پائے ہیں یعنی کوئی بڑا انعام ابھی تک ان کو نہیں ملا ہے۔ویسے بھی ہمارے ملک میں بڑے لوگ بہت ہیں اور بڑے انعامات کی تعداد کم ہے۔نذیرؔ صاحب انعام خریدنے کے گر سے واقف نہیں ہیں، نہ ہی وہ اس قسم کا حوصلہ یا ہمت رکھتے ہیں۔اس لیے جو بھی ملتا ہے اسے خنداں پیشانی سے قبول کر لیتے ہیں۔

اردو ادب میں نذیرؔ صاحب کی جڑیں اندر تک پیوست ہیں۔ان کا وجود شہر میں ایک سایہ دار درخت کی مانند ہے جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر رہ روانِ شعروادب محضوظ ہوتے ہیں۔شاعری میں غزل، نظم، نثری نظم، آزاد غزل، ماہیا، گیت، دوہا، کہہ مکرنی، تضمین، حمد اور نعت، سلام اور منقبت، نثر میں ناول، ڈرامے، افسانے، سفر نامے، طنز ومزاح، تنقید، تحقیق اور تبصرے اور بچوں کا ادب، ہر صنف، کو انھوں نے اپنے گلے کا ہار اور دل کا آزار بنا رکھا ہے۔اس کے علاوہ ''اسباق'' جیسے خالص ادبی رسالے کی ادارت اور ایروڈا مسجد کی متولی شپ، دو متضاد منصب لیکن دونوں میدانوں میں سرخروئی ان کی ہم قدم نظر آتی ہے۔'اسباق' کی ادارت وہ چوبیس برس (اب تیس برس) سے کر رہے ہیں تو مسجد کی خدمت دس برسوں تک کی ہے۔چہرے، مہرے، حلیے، بشرے، سے وہ اسلامی شعار کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتے ہیں۔وہ خود کہتے ہیں۔۔

عمل کی بات نہیں صرف شکل وصورت سے　　نذیرؔ مردِ مسلماں دکھائی دیتا ہے

پونہ ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے جس خطے میں بھی اردو زبان کی خوشبو موجود ہے، وہاں نذیرؔ فتح پوری کے نام کی گونج ہے۔ ہر جگہ ان کے دوست موجود ہیں، ان کے مخالفین موجود ہیں۔اس بات کا احساس و عرفان نذیرؔ صاحب کو بخوبی ہے جو ایک شعر کے حوالے سے وہ بیان بھی کر چکے ہیں۔

پہنچی جہاں جہاں ہے مرے پیار کی مہک ۔۔۔ مجھ کو وہاں وہاں سے صدا دے رہے ہیں لوگ

پونہ میں رہتے ہوئے بھی نذیرؔ صاحب اتنے مشہور و معروف اس لیے ہیں کہ دوسرے لوگ مشہور و معروف ہونا ہی نہیں چاہتے۔ ہمارے پاس دس بیس کتابوں کا موادنہ سہی لیکن اتنا کچھ تو موجود ہے کہ ایک آدھ مجموعہ ہم بھی منظرِ عام پر لا سکتے ہیں۔احباب کی نذر کر سکتے ہیں، اردو کے مخلص قارئین میں اعزازی تقسیم کر سکتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسائل کو ارسال کر کے سیر حاصل تبصرے بھی شائع کرا سکتے ہیں، لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے ، کیونکہ ہم مجموعے نہیں چھاپ سکتے، کتاب کی اشاعت کا خیال ذہن میں کروٹ لیتے ہی ہمارا اعتماد لرزنے لگتا ہے۔معلوم نہیں ہمارے ذہن میں یہ بات کیسے گھر کر گئی کہ کتاب شائع کرنا اور دشمن کے ہاتھ میں تلوار دے کر اسے اپنے قتل کے لیے آمادہ کرنا دونوں ایک ہی جیسی باتیں ہیں لیکن نذیرؔ صاحب خائف نہیں ہیں کیونکہ وہ مقابل کے ہر وار سے بچنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔

یوں معرکہ ہوا تھا کہ میداں سمٹ گئے ۔۔۔ دشمن کے سارے وار اسی پر الٹ گئے

ایسے موقعوں پر وہ خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

نذیرؔ بازی گرانِ سخن کی بستی میں ۔۔۔ اکیلے رہیے مگر ہاتھ میں عصا رکھیے

بظاہر وہ ایک خاموش طبع انسان ہیں، نرم لہجے میں بولنا، زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ ملنا، کسی بھی معاملے میں اپنی فوقیت جتانے سے گریز کرنا، ترش روئی اور تلخ کلامی سے پرہیز کرنا، چھوٹے بڑے سبھی کو تسلیم کرنا، مشاعروں میں اچھے برے شعروں پر داد دینا، ہم جیسوں کے لکھے کی نوک پلک سنوارنا، املا درست کرنے، تلفظ کی درست ادائیگی پر توجہ دلانا، لوگوں پر مضامین لکھنا، مہمان شعراء و ادباء کی دعوتیں کرنا، ان کو اپنی پرانی لونا پر بٹھا کر مقامی شعراء سے ملوانا، مسجد کے متوالی کی حیثیت سے جماعت کے جھگڑے چکانا، لوگوں میں صلح کرانا، مسجد کے حسان کتاب کے لیے خازن سے بار بار الجھتے رہنا، مسجد کی جائیداد کے تحفظ کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانا، چیریٹی کمشنر کے دفتر کے چکر لگانا، وکیلوں سے ملنا یہ اور ایسے بہت سے کام ہیں جو ان کی عملی زندگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ یہاں ان کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

جلائے پھرتی ہے دن رات میری ہستی کو ۔۔۔ جو آگ برسرِ پیکار ہے مرے اندر

واقعی بظاہر شانت اور سکوت کا پیکر دکھائی دینے والی نذیرؔ صاحب کی ہستی اندر سے ایک شعلے کی مانند ہے، جو انھیں زندگی کے ہر شعبے میں سرگرداں رکھتی ہے ورنہ لوگ آج روٹی روزی کی حصولی میں اس قدر الجھے

ہوئے ہیں کہ دوسرے کاموں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں کر سکتے۔

ہم جس شعلے کا ذکر اوپر کر چکے ہیں وہ شعلہ کبھی کبھی بھڑک اٹھتا ہے۔جی ہاں ! خلافِ طبع جب کوئی بات ہو جاتی ہے تو نذیرؔ صاحب غصے سے لال پیلے ہو جاتے ہیں لیکن اپنے ظرف کو چھلکنے نہیں دیتے۔ان کی گرمی ان کی گفتار تک ہی محدود رہتی ہے۔وہ مرنے مارنے پر کبھی اتارو نہیں ہوتے۔خود کہتے ہیں۔

کچھ لوگ پہنچ جاتے ہیں تلوار کی حد تک ۔۔۔ گرمی ہے نذیرؔ اپنی تو گفتار کی حد تک

وہ بیڑی اور سگریٹ جیسی مضرت رساں چیزوں سے کوسوں دور رہتے ہیں بلکہ ایسی چیزوں کے دھوئیں سے بھی ان کو الرجی ہے۔شاید اسی لیے یہ مطلع انھوں نے کہا ہے۔

ہم اہلِ درد، کبھی رائیگاں نہیں ہوتے ۔۔۔ سلگتے رہتے ہیں لیکن دھواں نہیں ہوتے

اسی لیے ’’یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے‘‘ کا سوالیہ نشان ان کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتا۔اگر آپ محبت سے نذیرؔ صاحب کو پان کھلانا چاہیں تو کھلا سکتے ہیں لیکن پان سادہ ہو اور خوشبو والا بھی۔ پان ان کے ہونٹوں پر رچ بس کر سرخرو ہو جاتا ہے۔دراصل رنگوں سے نذیرؔ صاحب کو ایک فطری لگاؤ ہے۔جس طرح عادل فتح پوری نے انھیں تتلی پکڑنے والا شاعر لکھا ہے ہم انھیں ’’رنگ رنگ کا شاعر‘‘ بھی کہہ سکتے ہیں۔

نذیرؔ صاحب کٹر مذہبی آدمی نہیں ہیں۔لیکن صحیح العقیدہ مسلمان ضرور ہیں۔وقتاً فوقتاً وہ قرآن و حدیث کی باتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔کبھی کبھی حدیث اس دلجمعی اور ایمان افروز جذبے کے تحت سناتے ہیں کہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی ان کی بات دل و دماغ کو متاثر کر دیتی ہے۔مشاعروں میں ان کی موجودگی قابلِ دید نہ بھی ہو تو مسجد میں ان کی حاضری قابلِ تقلید ضرور ہوتی ہے۔جب وہ مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے دنیا و جہان کا ستایا ہوا کوئی قلندر رحمت کی پناہوں میں آ گیا ہو۔وضو کرتے وقت فرشتوں کی سی معصومیت ان کے چہرے پر نمودار ہو جاتی ہے۔نذیرؔ صاحب لحنِ داؤدی کی نعمت سے محروم ضرور ہیں ورنہ مشاعروں میں ترنم سے ضرور پڑھتے لیکن کبھی کبھی وہ اذان پڑھنے کی نیت ضرور کر لیتے ہیں۔ایسے وقت وہ مؤذن کو اشارہ کرتے ہیں وہ مائک کا بٹن آن کر دیتا ہے اور پھر فضاؤں میں اللہ اکبر کا نعرۂ مستانہ اتنی بلند آواز سے گونجتا ہے کہ لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔جو نماز نہیں پڑھتے ان کا دل بھی نماز پڑھنے کو چاہتا ہے۔اقامت کا فریضہ نذیرؔ صاحب بڑے سلیقے سے ادا کرتے ہیں جیسے کہہ رہے ہو’’نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔اگر بیٹھے رہے تو روزِ محشر بھی بیٹھے ہی رہ جاؤ گے اور میں امام صاحب کے ساتھ جنت میں چلا جاؤں گا۔‘‘

....

اسلم حنیف (بدایوں)

نذیرؔ فتح پوری کے یہاں تتلی کا شعری پیکر

اضطراری اور ہیجانی کیفیت سے ہذیانی حالت سے گلوخلاصی کے نتیجے میں جب فنکار خوداعتمادی کے حدود میں داخل ہوتا ہے تو اس کے فن وفکر کو وقیع، دلکش اور متنوع انداز عطا کرنے میں پیکر تراشی کا عمل نمایاں رول ادا کرتا ہے۔

عقلی یا حسّی پیکر ابلاغ کا دراصل ایسا معمول (Medium) کہے جاسکتے ہیں جن سے اظہارات تہہ در تہہ معنویت کے حامل بن کر تفہیم کے مختلف راستوں کو ہموار کرتے ہیں۔ شعری پیکروں کی تخلیق پر بحث کرتے ہوئے یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہر فنی شخصیت اپنے فن و ذات کی نمود کے لیے قدیم اور نہایت مانوس پیکروں کو برت کر نئے مفاہیم ومطالب کا قالب عطا کرتی ہے یا پھر ان سے ہٹ کر نئے پیکروں کو اختراع کرتی ہے۔ فنی سطح پر اس اجتہاد سے ہر حرکی ادب میں نئے امکانات کے ردوقبول کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ گوناگوں تجربات کے اضافے مزاجِ ادب میں ایسی لچک باقی رکھتے ہیں کہ آئندہ نسلوں کو استفادہ واجتہاد کے بھرپور مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ صالح اور تعمیری نظریات سے جو خوشگوار فضا بنتی ہے اس میں اصنافِ ادب کو پھلنے پھولنے میں مدد ملتی ہے لیکن لسانیات کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ایسے تجربے جو ادب کے مزاج اور زبان و بیان کے منافی ہوتے ہیں وہ وقتی شہرت کے باوجود استقامت کے عناصر کو اپنے ہیولیٰ میں پیوست نہیں کر سکتے۔ شعری اصناف میں غزل اپنے کٹر اور انفرادی اصولوں کی بناء پر ہیئت کے غیر عروضی اور غیر روایتی تجربوں کو آج تک قبول نہیں کرسکتی۔ اسی لیے آزاد غزل کا وہ تصور جو آج چھوٹے بڑے مصرعوں کی ترتیب سے پنپتا ہے خام کار ذہنوں کی سعی ناتمام کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پیکروں کی تراش خراش کا تعلق کیونکہ غزل کی داخلی کائنات سے ہے اس لیے یہاں ہیئتِ غزل کے مسائل کی چھیڑ چھاڑ بیکار نظر آتی ہے۔

بظاہر اشیاء کے مابین کوئی تعلق نظر نہیں آتا سی لیے نامطابقت کے پیشِ نگاہ فلسفہ ایک طویل مدت تک مغالطہ کا شکار بنا رہا۔ مگر آج اشیاء کے درمیان مطابقت اور پیوستگی کا نظریہ نہایت ٹھوس صورت اختیار کر چکا ہے۔ (اس نظریے سے اشیاء کی انفرادی خصوصیات متاثر نہیں ہوتیں۔) جس کے تحت بہت سی ادبی صنعتوں پر سائنٹفک انداز سے سوچنے میں مدد ملی ہے۔ خاص طور پر تشبیہ واستعارہ کی اہمیت واضح ہوچکی ہے۔ متضاد مدرکات ذہنی میں

مطابقت اور مماثلت کی سعی صرف تخئیلی کارنامہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے سائنس کی مذکورہ حقیقت کا راز مضمر ہے۔ استعارہ فنی اعتبار سے جس قدر بلند اہمیت کا حامل ہے اتنا ہی زیادہ اس کا استعمال نازک بھی ہے۔ اس لیے ہر فنی شخصیت اسے اس کے مقام پر برتنے میں کامیاب نہیں ہوتی اور جو لوگ اس فن کے رمز آشنا ہوتے ہیں ان کی شعری تخلیقات آفاقی عناصر کی متحمل ہو جاتی ہیں۔

پیکروں کی تخلیق کا حواسِ انسانی سے بہت گہرا تعلق ہونے کے سبب ان کی تقسیم بھی انہی کے تحت کردی گئی ہے چنانچہ بصری (Visual)، شامی (Olpactory)، لمسی (Tachtile) اور سماعی (Aural) پیکروں کا وجود فنکار کی نفسیاتی الجھنوں کی تفہیم ہی میں معاون ثابت نہیں ہوتا بلکہ ذات سے کائنات اور تصورِ فن کے سلسلے میں بھی پیکر تراشی کے پس پردہ بہت سے نامعلوم نقوش کی تلاش کی جاسکتی ہے۔

جدید اردو شعراء کی بھیڑ میں نذیرؔ فتح پوری کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ نذیرؔ فتح پوری صاحب نے غزل کے حوالے سے پرانے اور گھسے پٹے پیکروں کی نئے انداز سے پینٹنگ بھی کی ہے اور فنی و ذاتی تشخص کے لیے نئے پیکر بھی تراشے ہیں۔ نئے پیکروں کی فرہنگ میں ''تتلی'' ان کا محبوب ترین پیکر کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ان کے دیوان 'لمحوں کا سفر' میں یہ پیکر چند ہی شعروں میں بازگشت کرتا نظر آتا ہے۔ مگر غزلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لاشعوری صورت میں ذہن جس پیکر کے تجسّس وتدوین میں مصروف تھا اس کے متعلقات بہت پہلے سے جلا پا چکے تھے۔ حرکت ورنگ کے تنظیمی نقوش پر شاعر کی گرفت اسی کا نتیجہ کہی جاسکتی ہے۔

بگولوں جیسا یہ کس نے اڑا دیا مجھ کو رہا غزالِ رمیدہ سا دشت امکاں میں
رنگ جذبات کا کچھ اور سنہرا ہوگا درد کی دھوپ جو پھیلے گی تو ایسا ہوگا

اور آہستہ آہستہ ''تتلی'' شعوری سطح پر نمودار ہو کر مکمل آگہی کا سبب بن جاتی ہے۔

میں رنگ رنگ اسے گھولتا ہوں لفظوں میں وہ شعر شعر مرے ذہن پر اترتی ہے
میں نے رنگوں کے حوالے سے جو کیں باتیں تو وہ مسکرا کر تتلیوں کا ایک لشکر دے گیا

تتلی کا پیکر نذیرؔ فتح پوری کے متحرک درمیانی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ اس کے وسیلے سے شاعر کے ذوقِ جمالیات کو بخوبی پرکھا جاسکتا ہے۔ نذیرؔ صاحب کی ایک غزل ''تتلیوں کے نام'' کے یہ اشعار پرتاثیر لہجے کی ضمانت ہیں۔

اپنے زخموں میں بھیگی ہوئیں تتلیاں کیا ہوئیں وہ لہو بانٹتیں تتلیاں
حسن گلشن نکھرتا گیا دم بہ دم رنگ ایسا جما کر گئیں تتلیاں
گشت کرتی رہیں رات بھر شہر میں منچلی، خوش لبادہ حسیں تتلیاں
کاغذی ناؤ کی طرح بہتی ہوئیں ڈوبتی اور ابھرتی رہیں تتلیاں
بادِ وباراں کے طوفان تھے راہ میں دو قدم بھی نہ ساتھ آ سکیں تتلیاں
خیر مانگو کہ شہرِ ہوس میں نذیر مثلِ یوسف بہت بک چکیں تتلیاں

محولہ غزل کے کئی شعروں میں تتلی، اپنے لغوی معنوں سے ہٹ کر خالص استعاراتی انداز کے ساتھ ابھرتی ہے۔ کسی بھی لفظ یا ترکیب و بندش کو استعارہ کا قالب عطا کر دینا شاعر کے زبردست وجدانی اور حسیاتی ردِ عمل کا نقیب ہوتا ہے۔ فنکار استعارے کے وسیلے سے اپنے تجربے کو قاری کے ذہن میں جس سرعت کے ساتھ منتقل کرتا ہے اس کی گرفت کے لیے قاری کو خود بھی چوکنا اور بیدار رہنے کی ضرورت کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نذؔیر فتح پوری کے یہاں تتلی کا استعارہ حال کے استیصال اور ماضی کی پر فریب دلکش حیات کو اجاگر کرتا ہے۔

اب کے جانا ہوا تو پکڑ لائیں گے　　　چھوڑ آئے ہیں جو تتلیاں گاؤں میں
اپنی عمر کے رنگ کہاں تک ماند پڑے　　　بچہ تتلی پکڑے گا تو دیکھیں گے

موجودہ صنعتی اور تکنیکی دور کے پر پیچ مسائل نے زندگی کو کشمکش کا شکار بنا دیا ہے۔ ماضی و حال کے تصادم سے پیدا ہونے والے ذہنی تذبذب کا عکس نہایت کربناک انداز میں اس طرح عود کر آتا ہے کہ نذؔیر صاحب کو کہنا پڑتا ہے۔

ہاتھ بچپن نے بڑھائے تھے مگر　　　اڑ گئیں سب تتلیاں احساس کی
بچپنا تو حادثوں کی نذر ہو ہی جائے گا　　　تتلیوں کے قافلے سڑکوں پہ آ جائیں گے کیا؟

شاعر کے یہاں تتلی کے ساتھ بچپن کا ذکر ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

جب کہانی سنو گے بچپن کی　　　تذکرہ تتلیوں کا آئے گا

لیکن تتلی کے ساتھ گاؤں کا وہ تصور بھی جڑا ہوا ہے جہاں بچپن کے شادابوں پُر کیف لمحات آج کے منہمک شہری ماحول کے دھندلکوں میں جا پڑے ہیں۔

کھیت کی پگڈنڈیاں دہرائیں گی ماضی کا گیت　　　تتلیوں کو دیکھ کر پھر بچپنا یاد آئے گا
اب کے جانا ہوا تو پکڑ لائیں گے　　　چھوڑ آئے ہیں جو تتلیاں گاؤں میں

اپنے اس حسی تجربے کے سیاق وسباق میں شاعر نے عصری حیات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

رنگ پینے کی ہَوس جب بھی ستاتی ہے اسے　　　ایک تتلی کئی پھولوں سے گزر جاتی ہے
نیند کی تتلیوں کے پَر روشن　　　یا ہیں بیداریوں کے گھر روشن
تب پائی فن کی تتلی　　　کتنا پیچھے دوڑا ہوں
بچپن کے خواب پلکوں پہ لہرا گئے نذؔیر　　　رنگوں کا درد بانٹ کے تتلی گزر گئی

تتلی کے حوالے سے شاعر نے زندگی کے جن مختلف تجربوں کو سمیٹنے کی جسارت پیش کی ہے اس کے پیش نگاہ کہا جا سکتا ہے کہ متذکرہ پیکر میں استعارہ بننے کی مکمل قوت موجود ہے۔ اگر یہ قوت مزید مستحکم انداز فکر کے ساتھ آگے بڑھتی رہی تو ایک دن اس میں علامت بننے کی صلاحیت بھی رونما ہوگی اور اس کے سہارے شاعر ادب کے اس افق پر درخشاں ہوگا جہاں پہنچ کر نیچے اترنا ناممکن ہوتا ہے۔

....

بیکل اُتساہی (بلرام پور۔ یوپی)

نئے گیتوں کا مسافر

اُردو گیتوں کا سفر صدیوں سے چلا آ رہا ہے مگر آج تک اسے اپنی منزل نہ مل سکی۔ غزلوں اور نظموں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی مٹی سے جس قدر گیت قریب ہے کوئی دوسری صنفِ سخن نہیں، یہ گیت کہیں دھرم کے اُپدیشوں کے رنگ میں رنگے ہوئے، کہیں میدانِ کارزار میں بہادری کی عکّاسی کرتے ہوئے، کہیں عوام کی سیدھی سادی زندگی کو لفظوں کے پیکر میں ڈھالتے ہوئے اور کہیں برہ کی آنچ میں سلگتے ہوئے ملیں گے۔

گیت ہندوستانی زندگی کے سچے آئینہ دار ہیں۔ ایک ایسی صنفِ سخن جو انسانی زندگی کی ہو بہو عکاسی کرے، کیا نظر انداز کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، مگر اس کے باوجود ایسا ہوا ہے۔ البتہ ادھر چند برسوں سے اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ مرحوم جناب ظ. انصارؔی اور اسی صف کے دو ایک ناقدوں نے گیتوں کی وکالت کی ہے مگر آواز دبی دبی سی ہے۔ ان میں خانوادۂ رئیس المتغزلین حضرت جگؔر مرادآبادی کے چشم و چراغ نیاز احمد سحؔر نے بہت کھل کر لکھا ہے۔

''حیرت کی بات ہے کہ گیت جو یہاں کی قدیم ترین صنفِ سخن ہے اُس پر کسی کی توجہ نہیں جبکہ ہندوستانی ادب کا اصل خزانہ گیت ہی ہیں، ہندوستان کے تخلیق کاروں نے کبھی بھی علم و فن کے ساتھ تعصّب نہیں برتا، انھوں نے غزل، رباعی، مرثیہ، قصیدہ اور دوسری اصنافِ سخن کو بلا تامل قبول کیا، یہاں تک کہ اُن بحروں کو جو خالصتاً عربی و فارسی تھیں برتنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی انھیں اسی طرح اپنایا گویا وہ یہیں کی پیداوار تھیں۔ اگر ایک طرف انھوں نے بیرونی اصنافِ سخن کو سینے سے لگایا تو دوسری طرف خود کو گیتوں سے بھی جوڑے رکھا۔

ہر عہد میں دو چار ایسے باکمال ضرور ملیں گے جو اس صنف کو اپنا خونِ جگر دیتے رہے آج گیتوں کا ایک ایسا ذخیرہ موجود ہے جسے ہم بلاشبہ عالمی ادب کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم گیت کی طرف متوجہ ہوں اور اُسے اُس کا صحیح مقام دلائیں جس کا وہ حقدار ہے۔'' **(گیتوں کی ادبی حیثیت مطبوعہ قومی آواز، لکھنو)**

ہر حال میں یہ بات طے ہے کہ ایک دن گیتوں کو اپنی منزل مل ہی جائے گی۔

لیجیے گیتوں کے سرمایے میں ایک اور مجموعہ کا اضافہ ہوا ہے، وہ ہے جناب نذیرؔ فتح پوری کے گیتوں کا مجموعہ نفیس ''مرے گیت اکیلے رہ گئے'' نذیرؔ فتح پوری کے گیتوں کا یہ مجموعہ اُنکی محنت و کاوش کی عکاسی کرتا ہے۔لیکن یہ اُن کی منزل نہیں، انھیں ابھی اور آگے جانا ہے حالانکہ نذیرؔ صاحب بڑے پُرگو اور کثیر الاشاعت شاعر ہیں ہر صنفِ شاعری اور افسانہ نگاری، ڈرامہ وغیرہ کے ممتاز قلمکار ہیں۔اب گیتوں میں اُن کا قلم رواں دواں ہے۔اُن کے گیتوں میں ملن کی خوشیاں، بدمستی، سرشاری کے جذبات کو فروغ دینے کا وسیلہ ہے۔نذیرؔ صاحب نے گیتوں میں تصنّع آمیزی سے کام نہیں لیا بلکہ اس سلسلے میں اُن کا برتاؤ قطعی فطری اور حقیقت پسندانہ رہا ہے اُن کا مشاہدہ سچا اور اُن کا جذبہ صداقتوں کی عکاسی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔انہوں نے بلا ہچک اپنے گیتوں کے ذریعہ معاشرتی، سیاسی، معاشی حالات کو پیش کرنے کا جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔

میرے مکالمہ میں اُن کے گیتوں کے بیشتر انترے ایسے ہیں جو پڑھنے والوں کے دل میں اُتر جائیں گے۔مثلاً

پل دو پل کے ساتھی سب ہے
پل دو پل یارانہ ہے
اس کے بعد تو ہر پنچھی کو
شاخوں سے اُڑ جانا ہے
ایسے میں تو ڈال ڈال پر جھولوں کو مت ڈال
دنیا اک چوپال رے بابا
دنیا اک چوپال

....

یا جیسے یہ انترا کتنا خوبصورت اور موثر ہے

ساجن کا یہ خط ہے شاید
بسے ہیں جو پردیس
پڑھ کر اتنا تو سمجھا دے
کیا ہے یہ سندیش
تا کہ سُن کر میرے دل کو
مل جائے آرام
خط ہے کس کے نام

بتا دے خط ہے کس کے نام

....

اس گیت کے انترہ میں گیتوں کے موزوں علائم کے ساتھ بڑی جرات کی تاکید ہے ملاحظہ کریں:

قدم قدم شعلوں کی برکھا قدم قدم پر آگ
مسافر قدم قدم پر آگ
جیون کی مایا ہے جب تک انگاروں سے کھیل

....

نذیرؔ فتح پوری کے گیتوں میں عروضی رکھ رکھاؤ کے بجائے (ردِم) لحن اور غنائیت کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے، جس سے موسیقیت میں ''نیا پن'' پیدا ہوتا ہے۔گیت کے علاوہ نذیرؔ صاحب نے کہہ مکرنیاں اور ماہیے بھی کہے ہیں۔کہہ مکرنیاں ایک مردہ صنف ہو چکی ہے اور لیکن انھوں نے اب اس میں ایک نئی روح ڈالنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً

سب کو اس کا ہونا بھائے
خود چمکے اور جگ چمکائے
اس کے آگے سب کچھ ماند
اے سکھی جگنو؟
نا سکھی چاند!!

....

ہونٹوں پر جب یہ بس جائیں
اور بھی حسن کی شان بڑھائے
رنگ بھری اس کی مسکان
اے سکھی لالی؟
نا سکھی پان!!

....

اب دو ایک ماہیے بھی ملاحظہ کریں۔جن میں فنی لوازمات اور ہیتی شناخت اجاگر ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ عصری حسیّت کا اہتمام بھی ہے۔

امواج کے دھاروں تک
اپنی کہانی ہے

طوفاں سے کناروں تک

....

احساس بھگو لیتا
یاد ستائے تو
کچھ دیر کو رو لینا

....

بارود پہ بیٹھی ہے
میرے زمانے کی
یہ فاختہ کیسی ہے

نذیرؔ فتح پوری سیدھی سادی شاعری کے قائل ہیں ان کے یہاں نہ لفظوں کا گورکھ دھندا ہے اور نہ علامتوں کا مبہم جال، وہ براہ راست اپنی بات کہنے میں زیادہ یقین رکھتے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے اُن کے یہاں تکلّف و تصنّع نہیں پائے جاتے، یہ بہت بڑا وصف ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی سابقہ کتابیں لمحوں کا سفر، سفر تا سفر، تیسرا سفر، ریگِ رواں، غزل اندر غزل بچّو آؤ گیت سنائیں وغیرہ کی طرح ''مرے گیت اکیلے رہ گئے'' کو بھی عوام وخواص میں مقبولیت نصیب ہوگی۔

....

سفر مدام سفر ہے سفر سے کیا ڈرنا، چلتے رہنا زندگی کی علامت ہے۔ سوتے بہتے رہنے سے پانی شفاف رہتا ہے۔ جماؤ پانی کو بدبودار بنا دیتا ہے۔ میں خوشبوؤں کا دیوانہ ہوں، پھول میری پہلی پسند ہے۔ تتلی میرے حواس پر چھائی رہتی ہے، رنگوں کے جھکولے مجھے جھلائے پھرتے ہیں، میں منظروں کو چھوُ کر ان کی خوبصورتی کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔ میں منظروں کو تصویر بنانے کا ہنر جانتا ہوں جن کی عکّاسی میرے گیتوں میں موجود ہے۔ پھر بھی ''مرے گیت اکیلے'' ہیں۔ جی ہاں! چاند اور سورج کی طرح مرے گیت بھی اکیلے ہیں۔ ان گیتوں کو کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔ کسی ایسے ساتھی کی جو اپنی پُرسوز آواز میں ڈھال کر مرے گیتوں کو امر کردے۔

نذیرؔ فتح پوری

نوٹ: بعض گیتوں میں عروض سے چھیڑ چھاڑ بھی ہوئی ہے میں نے یہاں تخلیق کو اوّلیت دی ہے۔ اور جوں کے توں گیتوں کو شامل کرلیا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو یہ گراں گزرے۔ اس کے لیے معذرت۔

(''میرے گیت'' از نذیر فتح پوری سے اقتباس)

رفیق شاہین

نذیرؔ فتح پوری کا تحقیقی کارنامہ

''شعرائے پونہ ایک تحقیق''

نذیر فتح پوری جن کا وطن مالوف فتح پور شیخاواٹی ہے ایک عرصے سے پونہ (مہاراشٹر) میں اقامت پذیر ہیں۔ آفاق ادب میں آج آپ کا نام خورشید عالمتاب کی طرح تاباں و درخشاں ہے۔ آپ بہ یک وقت عالم، محقق نقاد شاعر ناول نگار افسانہ نگار ترتیب کار انتخاب کار اور صحافی سبھی کچھ ہیں۔ آپ کا سہ ماہی جریدہ ''اسباق'' جس کا افتتاحی اجرا ۱۹۸۱ء میں کیا گیا آج ایک مایہ ناز معیاری اور معتبر رسالے کی حیثیت سے دنیا بھر میں دلعزیز ہے اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

نذیر فتح پوری ادب کے ایک بے لوث اور سچے خادم ہیں جنہوں نے اپنی قیمتی زندگی کا لمحہ لمحہ قلم و قرطاس کے ساتھ گذارا ہے اور ان کی کامیابیوں کامرانیوں معرکوں ''ظفریابیوں اور فتحمندیوں کی فہرست خاصی طول طویل ہے۔ ان کے شعری و افسانوی مجموعوں ناول اور تحقیق اور تنقید کی تصنیفات و تالیفات کی کل تعداد اٹھائیس ہے۔ ان کی یہ سبھی کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوکر داد وستائش سے ہمکنار بھی ہوئی ہیں۔

موصوف نے فراخ دلی سے کام لے کر قدیم وجدید اور ملکی وغیر ملکی سبھی اصناف سخن میں جم کر مشق وممارست کی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے حیدر قریشی کی عالمی ماہیا تحریک کو اپنے طوفانی تخلیقی عمل سے استقرار و استحکام بھی عطا کیا ہے اور آج ماہیا کو عروج پر پہنچانے والے جاں نثاروں میں ان کا نام بھی عزت سے لیا جاتا ہے۔ موصوف کی شخصیت کی دل کشی اور فنی لیاقت واستعداد کے اعتراف میں ان پر اب تک سولہ کتابیں ترتیب دی جاچکی ہیں اور ان کا اجراء بھی ہوا ہے۔ ان کی قوت تخلیق اور رفتار قلم کی داد دینی پڑتی ہے کہ مختلف النوع موضوعات پر جو نظم ونثر پہ مشتمل ہیں ابھی ان کی ترتیب شدہ چھتیس کتابیں اور بھی ہیں جو منظرِ عام پر آنے کی منتظر ہیں۔

نذیر فتح پوری کی اٹھائیسویں تصنیف ''شعرائے پونہ۔ ایک تحقیق'' جو منور پیر بھائی چیرمن حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ کے مالی تعاون سے طبع کرا کے تقسیم کرائی گئی ہے تحقیق کی ایک دھماکہ خیز تہلکہ انگیز اور بلند پایہ تصنیف ہے جو تاریخی اور ادبی دستاویز بن گئی ہے۔ ساتھ ہی کتاب کے مصنف کا نام بھی تاریخ ادب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا ہے۔ چار سو سات صفحات پر مشتمل ست رنگی سرورق سے آراستہ نفیس کاغذ اور روشن کتابت وطباعت سے مزین تحقیق کی یہ ضخیم مجلّد کتاب نذیر فتح پوری کی ادبی زندگی کا ایک حیرت انگیز اور زبردست کارنامہ

ہے۔ حیرت ہونی بھی چاہئے کہ ایسا جہازی اور قاموسی نوعیت کا پیچیدہ اور اُلجھا ہوا کام جسے انجام دینا اداروں اور ٹیموں کا کام ہوتا ہے اسے انہوں نے تن تنہا انجام دیکر دکھایا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔ ناول اور افسانے تو گھر یا دفتر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر بھی تخلیق کئے جاسکتے ہیں لیکن تحقیقی امور کا معاملہ دیگر ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے اوبڑ کھابڑ راستوں سنگلاف زمینوں تپتے ہوئے صحراؤں خارزاروں اور دلدلوں کو عبور کرنا پڑتا ہے گھر سے دور رہ کر در در خاک چھاننی پڑتی ہے۔ یہ انہیں کا حوصلہ ہے کہ حصول مقصد کی خاطر انہوں نے ہر طرح کے مصائب و مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا اور ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی تو اس کام کا انہیں مشورہ دے کر اپنے گھر بیٹھ گئے لیکن اس چنگاری سے بھڑک اٹھی آگ میں سر تاپا شعلہ بسر نذیر فتح پوری اپنی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن کئے اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے دس سالہ بنواس پر نکل گئے اور در در کی خاک چھانتے پھرے۔ اس دوران انہوں نے نجانے کتنے دروازوں پر دستک دی اور نہ جانے کن کن لوگوں سے بالمشافہ ملاقاتیں کیں انہوں نے معاملے کو آگے بڑھانے کی دھن میں میلاد خواں گلوکاروں اور قوالوں تک کو نہ بخشا۔ وقت اور پیسے کے صرفے سے بانیاز کام کا مواد ملنے کی امید میں انہیں لوگوں سے بار بار ملاقاتیں کرنی پڑیں۔ معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں انہیں مسلسل مراسلہ نگاری بھی کرنی پڑی۔

آخرش ان کی کد و کاوش اور سعی جمیلہ کرشمہ ساز ہوئی۔ انہوں نے صدیوں کے تاریک غاروں میں نہاں گمنام شعرا و ادباء کا نہ صرف پتہ چلایا بلکہ ان کے مقبروں پر پہنچ کر اُن پر فاتحہ بھی پڑھ آئے۔ اور مرحومین کے ورثا سے ان کے کلام اور ان کی تصاویر حاصل کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔

نذیر فتح پوری جو نہ ڈاکٹر ہیں اور نہ ہی کسی یونیورسٹی کے پروفیسر۔ دانش ادب اور ماہر غالبیات کالیداس گپتا رضا کی صحبتیں اور ان کا آستانہ ہی ان کی یونیورسٹی رہا ہے وہیں رہ کر انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور اس تمنا نے کہ وہ بھی ادب میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینگے ان کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں سہ ماہی ''اسباق'' کا اجراء اور پھر کچھ ہی عرصے میں اس کی دنیا بھر میں مقبولیت بذاتِ خود کسی کارنامے سے کم نہ تھی۔ اسباق اپنی دسویں سالگرہ منا چکا تھا کہ وہ پھر سے دنیائے ادب دھماکہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور دن کا چین اور راتوں کی نیندیں اپنے مقصد پر قربان کر دیں۔ آخرش ان کی جوان مردی جاکاہی مستعدی تندہی اور اٹوٹ لگن ''شعرائے پونہ ایک تحقیق'' کی شکل میں ثمریاب و کامیاب ہوئی۔ نذیر فتح پوری کو اپنے وطن ثانی پونہ سے زبردست عقیدت اور محبت ہے اور اس تصنیف کی محرک بھی ان کی پونہ سے عقیدت ہی ہے۔ ان کا ''اسباق'' بھی پونہ کو دنیا بھر میں شہرت دلانے کا سبب بنا ہے۔ کتاب میں شامل ان کی نظم پونہ بھی ان کی پونہ سے محبت پر دال ہے۔

نذیر فتح پوری نے اپنی کتاب ''شعرائے پونہ ایک تحقیق'' کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے شعرا کی تصویروں کے علاوہ کچھ مخصوص تصویریں بھی شامل کی ہیں جو معروف مہمان شعرا کی ہیں جنھوں نے پونہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ ان تصویروں میں ادب کی بڑی ممتاز ہستیوں

کو دیکھا جاسکتا ہے جیسے علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، شکیل بدایوتی مجروح سلطانپوری، قتیل شفائی، امجد اسلام امجد حسن کمال، بشیر بدر، ظفر گورکھپوری، ناظر خیامی، غلام ربانی تاباں، بیکل اتساہی، وسیم بریلوی، ابراہیم اشک، قاضی مشتاق احمد، ڈاکٹر محبوب راہی، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر عصمت جاوید، عبدالستار دلوی، پروفیسر منشاالرحمان منشا، سحر جلگانوی، دلدار ہاشمی بیگم ممتاز مرزا، امینِ حزیں اور منور پیر بھائی وغیرہ دوسری صاحب دیوان شاعرہ مہلکا چندا کی قلمی تصویر بھی شائع کی گئی ہے اور ڈیکن کالج کی تصویر بھی جہاں سے ۱۹۲۲ء میں ولی دکنی کا دیوان شائع کیا گیا ہے۔ ایک تصویر ایروڈا جیل کی بھی ہے جہاں حسرت موہانی نے قید و بند کے دن گذارے تھے۔

کتاب کا پہلا باب جو پونہ سے متعلق ہے اس لئے اہم ہے کہ یہ پونہ آکر بستے والوں کے علاوہ یہاں کے جغرافیائی سیاسی تاریخی تہذیبی اور ادبی حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔

دوسرا باب اتنا ہم اور خاص الخاص ہے کہ کتاب کی جان معلوم ہوتا ہے اس باب کے ذیل میں جو ستائیس (۲۷) تذکرے شامل کئے گئے ہیں وہ ان ممتاز و معروف شعراء اور ادبا کے ہیں جو یا تو پونہ میں رہائش پذیر ہوئے یا پھر بطور مہمان یہاں تشریف لا کر اپنے کلامِ بلاغت نظام سے حاضرین و سامعین کو محفوظ و مسحور کرتے رہے۔ ان مہمان فنکاروں میں جوش جگر ساغؔر جعفرؔی، کیفؔی، مجروؔح، اختر الایمان، عدؔم، حسرؔت، قتؔیل، کرشن چندر، عالم فتحپوری، عتیق احمد عتیق، ڈاکٹر محبوب راہی اور مہلکا چندا تک کا ذکر شامل ہے جو ایک رقاصہ ہونے کے علاوہ دوسری صاحب دیوان شاعرہ بھی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس باب میں شکیل بدایونی کا ذکر شامل ہونے سے رہ گیا ہے۔ نذیر فتح پوری نے ان نامور ہستیوں کے ذکر میں مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہوئے حقائق کو صاف اور سادہ زبان میں کیفایتِ لفظی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی سادگی بھی متانتوں اور بلاغت سے معمور نظر آتی ہے۔ آگرچہ قلم کو حرکت دیتے وقت ان کی تمام تر توجہ فنکار کی شخصیت اور اس کے فن پر مرتکز رہی ہے لیکن جہاں کوئی بات انہیں کھٹکی ہے وہاں انہوں نے سوالیہ نشان بھی کھڑا کر دیا ہے مثال کے طور پر نورالحسن نقوی اور قاضی مشتاق احمد کے اس رویے پر کہ انہوں نے اپنی ادبی تاریخ کی کتب میں کیفی اعظمی کے ذکر کو صرفِ نظر کر دیا ہے انہوں نے حیرت اور افسوس کا برملا اظہار کیا ہے۔، یہ تو ممکن ہی نہیں کہ پہاڑ سی شخصیت نظروں سے اوجھل ہو جائے شاعر کی آنکھ مندتے ہی اس کی ساری زندگی کے کام پر پانی پھیرنے اُسے بھلا دینے اور مٹا دینے کی باالقصد کوشش یقیناً بہت بری بات ہے۔ بہر کیف کتاب کا یہ سنہری باب اپنے آپ میں اس قدر کشش انگیز دلاویز اور دلچسپ ہے کہ قاری اگر کوئی ایک تذکرہ پڑھ لے تو اس کی پیاس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور وہ اُس باب کے سبھی تذکرے پڑھ کر ہی دم لیتا ہے۔ ممتاز و معتبر اور جانے مانے شعرا کی زندگی کے حالات عجیب و غریب واقعات اور نئے انکشافا طلسم خانہ حیرت سے قاری کا بچ نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان تذکروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوش ساغر نظامی اور کرشن چندر شالیمار پکچرس پونہ سے وابستہ رہے تھے اور اسی فلم کمپنی کے بینر تلے فلم ''من کی جیت'' (جس کے ہیرو اور ہیروئین غالباً سریا اور دیو آنند تھے) کے مکالمے کرشن چندر نے اور گیت جوش ملیح آبادی نے لکھے تھے۔ تذکرے یہ بھی بتاتے ہیں کہ حسرت موہانی نے ایروڈا پونہ کی جیل میں کئی ماہ قید و بند کی حالت میں

گذارے تھے اور وہاں غزلیں اور نظمیں بھی تخلیق کی تھیں جوش کی مے نوشی کے حوالے سے یہ بات بھی علم میں آتی ہے کہ ایک محفل میں حد سے زیادہ چڑھا لینے کا ان پر یہ اثر ہوا کہ جوتے ہاتھ میں لے کر وہ محفل سے کھسک لئے اور پھر باہر آ کر جو انہوں نے ''ننگے پیر دوڑنا'' شروع کیا تو طویل شاہراہ پر دوڑتے ہی چلے گئے۔ نذیر فتح پوری کو جو باتیں جس سے بھی معلوم ہوئیں انہوں نے ان کو انہیں کے نام سے منسوب کر کے پیش کیا ہے۔ کتاب کے مطالعے کے دوران ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی پر قاتلانہ حملے کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور بلوائیوں نے پونہ میں ساغر نظامی کے مکان پر دھاوا بول دیا تھا۔ جیسے تیسے وہ بچ نکلنے میں کامیاب تو ہو گئے مگر ان کا ساز وسامان سے بھرا پُرا گھر جلا کر خاک کر دیا گیا اور بے سروسامانی کے عالم میں انہیں ریفیوجی کیمپ میں بطور پناہ گزیں کئی ماہ گذارنے پڑے تھے نذیر فتح پوری کو یہ تمام باتیں ساغر نظامی کی بیوہ محترمہ ذکیہ سلطانہ سے مسلسل خط وکتابت کے نتیجے میں معلوم ہوئیں جو تذکرے کی زینت بنیں۔ نذیر فتح پوری کی تحقیق بتاتی ہے کہ اختر الایمان کے فلمی کیریر کا آغاز بھی پونہ ہی سے ہوا تھا۔ اور فلم ''وقت'' کی شاندار کامیابی کے بعد ان کی مارکیٹ میں مونوپولی قائم ہو گئی تھی۔ انہوں نے سو سے بھی زائد فلموں میں مکالمے لکھے تھے۔ مصنف نے شعراء وادباء کی شخصیت اور ان کے فن پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ان کے مقبول عام اور مخصوص کلام کو بھی تذکروں سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ بہت سے اشعار ہمارے حافظے میں محفوظ ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا خالق کون ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار راقم الحروف کو یاد تو تھے مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ کس کے ہیں مگر عبدالحمید عدمؔ کا تذکرہ پڑھ کر معلوم ہوا کہ ان اشعار کے وہی خالق ہیں۔

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ   محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

دل ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں   دوستوں کی مہربانی چاہئے

میکدہ تھا چاندنی تھی میں نہ تھا   اک مجسم بے خودی تھی میں نہ تھا

تیسرا باب جس میں چھیاسٹھ (۶۶) شعرا کے تذکرے شامل ہیں تحقیق وتدقیق کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ اس باب کا مواد حاصل کرنے میں انہیں بڑے بڑے پاپڑ بیلے پڑے ہیں۔ در در کی خاک چھاننی پڑی ہے مگر اس پُر صعوبت سفر سے وہ بڑے بڑے گوہر آبدار لے کر ہی واپس لوٹے ہیں۔ ان کا ہر تذکرہ اپنی جگہ اہم ہے جو ہمیں شاعر کے پس منظر اس کے خاندانی معاشی تہذیبی اور ادبی حالات سے واقف کراتا ہے۔ اس کی شخصیت اور اس کے فن سے آشنا ہونے کے علاوہ ہمیں اُس کے کلام سے استفادہ کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

یہ تحقیق ان مرحوم شعرا سے تعلق رکھتی ہے جن پر گمنامی کی دھند کا پردہ پڑا ہوا تھا ان کو کھوج کر روشنی میں لانے سے اس کام کی تاریخی اور ادبی اہمیت وافادیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی اس کامیابی سے ریسرچ اسکالرس کا کام کافی آسان ہو گیا ہے اور مزید تحقیق کے لئے راہیں ہموار ہو گئی ہیں۔ مصنف کے تحقیق عمل اور ماضی کی بازیافت سے جہاں بہت سی نئی نئی باتیں ہمارے علم میں آتی ہیں وہاں ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پونہ کا پہلا شاعر یاسین پیراں شاہ قادری تھا۔ اس باب میں شامل بہت سے تذکروں میں پیش کی گئی تفصیلی معلومات اور نئے

نئے انکشافات حیرت انگیز اور لائق تحسین وآفرین ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ ایسی ایسی اہم اور چونکا دینے والی باتیں انہوں نے کس طرح دریافت کر لیں کہ انھیں داد دیتے ہی بنتی ہے۔ تحقیق وتدقیق کے اس طویل سفر میں انہوں نے خود کو چند دہائیوں تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ حصول مقصد کی خاطر وہ گذشتہ صدیوں کے تاریک صحراؤں اور ویران و سنسان وادیوں میں خوب بھٹکے ہیں اور موسموں کے سرد وگرم کو خندہ پیشانی سے جھیلا بھی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی یہ محنت شاقہ اکارت نہیں گئی۔ وہ ماضی کے دفینوں سے بڑے بڑے لعل وگوہر ساتھ لے کر واپس لوٹے ہیں۔ شاد پونوی، سلیم پونوی اور خاک پونوی کو کھوجنے اور ادب میں روشناس کرانے کا فریضہ بھی انہوں نے ہی انجام دیا ہے۔

کتاب کا چوتھا باب شعرا کے انسٹھ (۵۹) تذکروں سے آراستہ ہے۔ یہ سبھی شعرا بقید حیات ہیں اور مختلف طبقات اور مدارج سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اساتذہ بھی شامل ہیں اور نوواردان بھی۔ وہ بھی ہیں جن کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اور وہ بھی ہیں جن کا کلام متعدد رسائل میں شائع ہو کر ہماری نگاہوں سے گذرتا رہتا ہے۔ ان تذکروں میں مشاعرے کے مشاعرہ باز شعرا کا بھی خیر مقدم کیا گیا ہے اور کم درجے کے گمنام شعرا جن کا نہ رسائل سے تعلق ہے اور نہ مشاعرے سے ان کی عزت وتوقیر میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی ہے۔ ان تذکروں میں مصنف نے شعرا کی تصاویر اور ان کا کلام بھی شامل کر دیا ہے تا کہ قارئین متذکرہ شعرا کے اور بھی قریب آ سکے۔

کتاب کے پانچویں اور آخری باب میں اردو سے قریب تر ہندی مراٹھی اور انگریزی کے بائیس (۲۲) شاعر وشاعرات کے ذکر کے ساتھ ان کی تصاویر اور نمونہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان فنکار اور فنکاراؤں میں گھنشیام دھینڈرے، ادھو مہاجن بسمل، سنجے گوڈ بولے، اندرا شبنم، پربھا ماتھر اور سنگیتا جوشی جیسے مشہور نام بھی اپنے جلوے لٹاتے نظر آتے ہیں۔

آمد برسرِ مطلب ''شعرائے پونہ ایک تحقیق'' نذیر فتح پوری کے ابتک کے ادبی کارناموں میں سب سے بڑا تہلکہ خیز کارنامہ ہے جس نے تاریخ ادب میں ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر کر دیا ہے۔ اور وہ اب پونہ کی پہچان بن گئے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو ان کا کام ہی ایسا ہے کہ تلاش وجستجو کے دوران وہ پاتال میں اتر گئے ہیں اور انہوں نے ماضی میں جا کر تین صدیاں کھنگال ڈالی ہیں+ تبھی ان کی رسائی بیش قیمتی معلومات کے دفینوں تک ممکن ہو سکی ہے۔ بہر کیف تقریباً دو سو پچاس حیات ومرحوم اور معروف وگمنام ادبا شعرا اور شاعرات کے تذکرے لکھ کر اُنہیں شعرائے پونہ ایک تحقیق میں جگہ دے کر انہوں نے حق ادا کر دیا ہے۔ اس معرکتہ الآرا تصنیف کے اجرا پر نذیر فتح پوری کی تعریف وتحسین میں جناب منور پیر بھائی چیرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ بھی برابر کے حصے دار اور حق دار ہیں کہ انہیں کے مالی تعاون سے کتاب کی طباعت واشاعت اور اس کی تقسیم ممکن ہو سکی ہے۔

☆ڈاکٹر قمر جہاں ☆ڈاکٹر حسن آراء

پیش لفظ

نذیرؔ فتح پوری۔خواتین اہلِ قلم کی نظر میں

راجستھان میں اردو زبان وادب کی روایت بہت پرانی ہے۔کسی زمانے میں دلی اور یو پی سے شعراء اور ادبا راجستھان کے شہروں میں آ کر آباد ہوئے اور عزت و وقار کی زندگی گذاری۔میر تقی میر،مرزا غالب اور داغؔ کے شاگردوں کی بھی یہاں اپنے اپنے زمانوں میں شہرت رہی۔جے پور،اجمیر،ٹونک،الور،کوٹا ،جودھپور،بھرت پور اور ادے پور جیسے شہروں میں ادب کا چراغ جلتا رہا اور مقامی اہل سخن کے ساتھ ہی باہر سے آنے والے اہلِ سخن کی بھی یہاں راج درباروں میں اور ادبی محفلوں میں پذیرائی ہوئی اور ان کی سخن پروری اور علمی بصیرتوں کی خوشبوؤں سے دماغ معطر ہوئے۔

دوسری طرف راجستھان سے تلاش معاش کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں اقامت پذیر ہونے والے اہلِ سخن کی تخلیقی کارگزرایوں اور علمی بصیرتوں کا اندازہ لگایا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ جس جس شہر میں رہے اپنے اپنے کارناموں سے خود بھی عزت پائی اور راجستھان کا نام بھی روشن کیا۔

آزادی سے پہلے حافظ محمود شیرانی،پھران کے فرزند اختر شیرانی نے لاہور میں رہ کر میدانِ شعر وادب میں جو سر بلندی اور ناموری حاصل کی اس کی مثال نہیں ملتی۔دونوں باپ بیٹوں کے ساتھ ٹونک اور راجستھان کی نسبت ایسی مربوط رہی کہ ان کی حیاتِ ادب کا حصّہ بنی رہی۔راجستھان سے ہجرت کر کے جانے والے اہلِ قلم کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جسے PHD کا موضوع بنا کر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔

نذیر فتح پوری کا تعلق بھی راجستھان کے شیخاواٹی علاقے کے فتح پور شہر سے ہے۔یہ وہ فتح پور شہر ہے جو آج سے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال پہلے نواب فتح خان چوہان نے بسایا تھا۔اسی فتح پور نے ہندی ادب کو سنت داس،جان کوی نعمت خان اور تاج کاوتیری جیسے فطرت شناس شاعر اور شاعرات عطا کیے۔اردو میں آفتاب شیخاواٹی،خواجہ نجم الدین چشتی پروانہ اور غلام سرور فتح پوری جیسے بصیرت افروز شاعر عطا کئے۔جان کوی نعمت خان نے اپنی ۷۵ سالہ زندگی میں ۷۶ کتابیں مختلف موضوعات پر سپرد قلم کیں جس میں قائم راصا کو بہت اہم تسلیم کیا گیا۔تاج اسی فتح پو کے نواب فدن خان کی بیٹی تھی جو بادشاہ اکبر سے بیاہی گئی تھی وہ ہندی کے سنت کاویہ میں تاج کوتیری کے نام سے مشہور ہوئی۔

خواجہ نجم الدین چشتی شیخاواٹی کے پہلے صاحب تصنیف صوفی شاعر ہوئے جن کی ۵۲ سالہ حیات مبارکہ میں ۵۲ کتابیں فارسی اور اردو میں سپردِ قلم ہوئیں۔ان میں شاعری سوانح اور تاریخ کو موضوع سخن بنا گیا۔

خواجہ نجم الدین چشتی نے خواجہ معین الدین چشتی کی سوانح حیات ''مناقب الحبیب'' کے نام سے فارسی میں لکھی جسے بعد میں ان کے فرزند مولانا محمد رمضان نے اردو میں ترجمہ کیا۔

معاصر اردو ادب میں نذیر فتح پوری کا نام کسی رسمی تعارف کا محتاج نہیں۔وہ یکم دسمبر ۱۹۴۶ کو فتح پور شیخاواٹی کے ایک جوڑ مسلم خاندان میں پیدا ہوئے۔ناموافق حالات کی وجہ سے ان کی حصول تعلیم کا سلسلہ درجہء پنجم سے آگے نہ بڑھ سکا،اس کے بعد معاشی مسائل سے نبرد آزمائی کے لیے نذیرؔ صاحب مہاراشٹر کے تجارتی شہر پونہ اپنے والد حاجی ابراہیم خان علیم خان جوڑ کے پاس آ گئے اور پھر پونہ ہی کے ہو رہے۔

جب نذیر صاحب نے شعر وادب کی دنیا میں پہلا قدم رکھا تو بہت جلد اپنی تدریسی اور مکتبی تعلیم کی کمی اور محرومی کو اپنے مطالعہ کے بل پر ایک حد تک پورا کر لیا اور مختلف جہتوں میں اردو کی خدمت اور شعر وادب کے ترسیلی سلسلے کو کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی۔یہ بات باعث مسرت ہے کہ آج راجستھان کے اردو نصاب کی درجہء چہارم ششم اور دہم کی کتابوں میں ان کی نظمیں پڑھائی جاتی ہیں۔راجستھان اردو اکادمی نے دوبار انہیں انعام سے نواز کر سرفراز کیا۔ان کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے اپنے شہر فتح پور سے ''بزمِ احساسِ اردو ادب'' کی جانب سے ۲۰۰۹ء میں انہیں علامہ کالی داس گپتا رضاؔ ادبی ایوارڈ تفویض کیا گیا اور ان کے دوستوں نے شہر والوں کے ساتھ مل کر ان کا جشن منایا اور اپنی بے پناہ محبتوں کا ثبوت دیا۔

نذیر فتح پوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ''عنوان سے سیکر کے عارف بھاٹی نے راجستھان یونیورسٹی کے لیے مقالہ لکھ کر ایم فل کی سند حاصل کی۔نذیرؔ فتح پوری کی عمر اس وقت لگ بھگ ۶۴ سال کی ہے اور اب تک ان کی ۴۲ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں ان میں شاعری،افسانہ،ادبی مضامین،تبصرے،طنز ومزاح،ناول اور بچوں کے ادب کے علاوہ تاریخ اور تذکرے بھی شامل ہیں۔انکی ادارت میں سہ ماہی ادبی رسالہ اسباق''گذشتہ تیس برسوں سے نہ صرف یہ کہ مسلسل چھپ رہا ہے بلکہ اس کے پڑھنے والے ساری دنیا میں موجود ہیں۔

اردو کی ادبی کتابوں کی اشاعت کے لیے انہوں نے ایک غیر تجارتی ادارہ''اسباق پبلی کیشنز'' قائم کر رکھّا ہے جس کے تحت اب تک ۸۲ سے زائد کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ آج راجستھان کے اس ہونہار شاعر،ادیب اور محقق و مدیر کے فکر وفن پر زیرِ مطالعہ کتاب مرتب کرنے کی سعادت بھی راجستھان ہی کے حصّے میں آئی ہے۔نذیر فتح پوری کے فکر وفن پر بے شمار مضامین اور تبصرے لکھے گئے۔اس سے پہلے ان کے فکر وفن اور شخصیت پر کئی کتابیں اور ادبی رسائل کے گوشے چھپ چکے ہیں۔لیکن زیر مطالعہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد پیش کش ہے جس میں شامل تمام مضامین اور تبصرے خواتین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں اور ہم دو خواتین نے مشترکہ طور پر اسے مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ان مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نذیرؔ صاحب اردو اور ہندی کے ادبی حلقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔

جن خواتین اہلِ قلم نے اس کتاب کے لیے اپنے گراں قدر مضامین اور تبصرے ارسال کئے ہم ان تمام کے دلی طور پر شکر گزار ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھیں جائے گی۔

نذیر فتح پوری (پونہ)

گفتِ باہمی

۲۰۰۸ء میں جب میری طویل غزلوں کا مجموعہ ''سفر مدام سفر'' شائع ہوا تو سید آصف نے ان غزلوں کے مطالعہ کے بعد ''دیوان'' کی تخلیق کا مشورہ دیا۔ جسے میں نے بسروچشم تسلیم کیا اور اپنے سارے تخلیقی اور ترسیلی کاموں سے صرفِ نظر نہ کرتے ہوئے ''دیوان'' کی تخلیق کا بھی ڈول ڈال دیا۔ اور پھر دو ماہ کے عرصے میں ''دیوان'' مکمل کرلیا۔ لیکن ''دیوانِ میر'' اور ''دیوانِ غالب'' کی طرح ''دیوانِ نذیر'' کی اصطلاح مجھے اپنے لیے موزوں اور مناسب معلوم نہ ہوئی۔ اسی دوران برادرم مناظر عاشق ہرگانوی نے گفتنی کے عنوان سے ''پیش لفظ'' سپردِ قلم کر کے ارسال کردیا۔ ۲۰۰۹ء کے نصف میں مسودہ کمپوزنگ بھی ہوگیا۔ لیکن میں عنوان کے لیے سرگرداں ہی رہا۔ پھر خیال گزرا کہ صرف ''دیوان'' نام سے اسے شائع کردیا جائے۔ لیکن اس پر بھی تشفی نہ ہوئی۔ اور پھر ایک بار اشاعت کی بات التواء میں پڑ گئی۔ دو ایک احباب سے مشورہ بھی کیا لیکن کسی نے تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ اسی دوران مئی ۲۰۱۰ء میں اپنی کتاب ''سلاطینِ دکن کے عہد میں شادیاں'' کی اشاعت کے سلسلے میں اورنگ آباد سے اسلم مرزا تشریف لائے۔ میں نے اس سلسلے میں ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ''دیوانِ نذیر فتح پوری'' کی اصطلاح کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ اپنے قلم سے مسودے کی پیشانی پر تحریر بھی کردیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ''براکیٹ'' میں مجموعۂ غزلیات کا اضافہ کردوں۔ اور میں مطمئن ہوگیا۔

''تخلیق'' میرے لیے کبھی ''مسئلہ'' نہیں رہی لیکن ترسیل ہمیشہ مسئلہ بنی رہی۔ زیرِ مطالعہ دیوان سے پہلے میری غزلوں کے دو مجموعے اور نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوکر منظرِ عام پر آجانا چاہیے تھا۔ جن میں غزلیات کا ایک مجموعہ ''تتلیوں بھرا آکاش'' عنوان سے دو سال ہوئے کمپوزنگ شدہ رکھا ہے۔ جس کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریر فرمایا تھا۔ یہی حال نظموں کے مجموعہ کا بھی ہے جو ''پہلے دکھ کا نزول'' عنوان سے کمپوزنگ ہو چکا ہے۔ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے لکھا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ اس دوران میری کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ سالِ رواں میں میری چار کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے۔

☆ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی۔ (تنقید)

☆ ڈاکٹر نورالسعید اختر، تحقیق تنقید اور تخلیق کے تناظر میں (ترتیب)

☆ پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق (تحقیق)

☆ ماں کے نام (ترتیب) ☆ امینِ تیمور (بچوں کے لیے ناول)

اور اب یہ ''دیوان'' جو میری تخلیقی کاوش کی ایک اہم کڑی ہے۔ منظرِ عام پر آرہا ہے۔

زیرِ مطالعہ ''دیوان'' تخلیق کرتے وقت میں نے دانستہ ہر غزل میں پانچ اشعار کی قید رکھی ہے۔ کبھی کبھی تخلیقی مراحل سے گزرتے وقت اپنے طور پر کچھ پابندیاں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ تخلیقی ذہن منتشر نہیں ہوتا۔ ایسے میں جب کہ ایک تخلیق کار کے قلم کی نوک سے دوسرے بہت سے کام بندھے رہتے ہیں۔ حد بندی مفید ثابت ہوتی ہے۔

سالِ رواں میں ''رانچی کا سفر'' ایک غیر روایتی سفر نامہ سپردِ قلم کرچکا ہوں۔ اور ایک جوابی مثنوی ''مثنوی جوابِ زہر خند'' کے عنوان سے بھی۔۔۔۔ ''سمیٹنے سے سمٹتا نہیں ہے دامِ خیال''

دیوان سے متعلق عرض ہے۔

اس لیے دیوان ہم نے لکھ لیا اے نذیر اپنا مقدر تھا غزل

اور یہ بھی احساس جسے تعلّی کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

رسمِ دیوان اٹھ گئی تھی نذیر بعد غالب کے ہم نے کاوش کی

اور پھر یہ خوش فہمی

مرتب کرلیا دیوان ہم نے اسے کہتے ہیں تخلیقی کرامت

لیکن ایک بات وثوق کے ساتھ کہنے کی جسارت کرسکتا ہوں۔

نہیں ہے میر اور غالب کے تابع نذیر اپنا تو ہے بس اپنا لہجہ

شاعری میں ہمیشہ میں نے اپنی سی کہنے کی کوشش کی ہے۔ بطورِ خاص غزل کہتے وقت اپنے مزاج اور اسلوب ہی کو ملحوظ رکھا ہے۔ اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے اور کناروں کو پکڑنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ کچھ کا کہنا ہے کہ میں نے اپنا لہجہ بنالیا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ میں اپنے لہجے کی تلاش میں ہوں، میرا خیال ہے۔ دوسری بات ٹھیک ہے، کیونکہ تلاش وجستجو کا سلسلہ چلتا رہے تو نئے نئے انکشافات ہوتے رہیں گے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کا مرحلہ بھی طے ہوتا رہے گا اور اس طرح اسوچ ذہن کی دنیا کی سیر کرنے کا موقع بھی ملتا رہے گا۔ کیونکہ کوئی بھی جذبہ انتہا پر پہنچنے کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ میں اپنے تخلیقی جذبے کی ہر حال میں پرورش کرنا چاہتا ہوں، اور اسے متحرک رکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ اسی سے میری تخلیقی توانائیوں کا جھرنا بہتا رہتا ہے۔ اور نئی نئی باتیں صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

ماہیے نذیر فتحپوری

حمد

دے مجھ کو دلِ شاہین
اتنی گزارش ہے
اے مالک یوم الدین

جو علم دیا تو نے
تیرا کرم سارا
ممنون کیا تو نے

ابرا ہا کو روکے گا
کام خدا کا ہے
گمراہ کو روکے گا

سب تیرے ہی صدقے ہیں
کیسۂ ہستی میں
جو سانس کے سکے ہیں

پہچان سے باہر ہے
تیرا تصور تو
امکان سے باہر ہے

امواج میں ہل چل ہو
سوکھی ہوئی ندیا
تُو چاہے تو جل تھل ہو

یہ وہم و گماں کیا ہے
تیری عطائیں سب
یہ سود و زیاں کیا ہے

جب کوئی دعا مانگو
آسماں والے سے
دھرتی کا بھلا مانگو

-----نعت-----

کیا خوب یہ رشتے ہیں
ان کا ہوں شیدائی
جو رب کے چہیتے ہیں

تعریف محمدؐ کی
کرتا ہے قرآں خود
توصیف محمدؐ کی

کیا میرے مقدر ہیں
پیاس کا صحرا میں
وہ میرے سمندر ہیں

میں کون ہوں، میں کیا ہوں
ان کا ہوں دیوانہ
بس اتنا سمجھتا ہوں

جو چاند کا ہالا ہے
اسمِ محمدؐ کی
برکت کا اجالا ہے

جو نور کا گنبد ہے
اندھے زمانے میں
وہ اسمِ محمدؐ ہے

تائید کریں گے ہم
قولِ محمدؐ کی
تقلید کریں گے ہم

فیضان محمدؐ کا
سارے زمانے پر
احسان محمدؐ کا

پلکوں پہ رکھو اس کو
خوشبو کا سایہ وہ
محسوس کرو اس کو

اس بار یہ سوچا ہے
آؤں گا روضے پر
یہ دل کا تقاضا ہے

ماہیے نذیر فتحپوری

فرمانِ خدا کیا ہے
انؐ کی زباں سے سُن
قرآنِ خدا کیا ہے

جو آپؐ سے روٹھا ہے
کہہ دوں خدا لگتی
وہ آئنہ اندھا ہے

جو شہرِ مدینہ ہے
مان لے بات مری
وہ عرش کا زینہ ہے

----ماہیے----

جتنے بھی صحیفے ہیں
بابِ اجابت پر
سب میری دعا کے ہیں

بے کار کے سائے میں
بیٹھ کے کیا رونا
دیوار کے سائے میں

کچھ میرا پتا لے جا
مل کے بچھڑنا ہے
کچھ اپنا پتا دے جا

آنسو ہیں ندامت کے
کام تو آئیں گے
تحفے ہیں عبادت کے

جو روک کے رکھی ہے
تیرے لیے اب تک
وہ آخری ہچکی ہے

ہر راہ گزر تنہا
اس پہ ستم دیکھو
سانسوں کا سفر تنہا

موسم کی دعا لے جا
کام یہ آئے گی
کچھ تازہ ہوا لے جا

ہر نقش مٹا دے گی
آگ ہے جنگل کی
شہروں کو جلا دے گی

محسوس ہوا اتنا
اس کا وجود آخر
شہہ رگ سے لہو ٹپکا

جب پیڑ جلاؤ گے
دھوپ کے موسم میں
پھر سایہ نہ پاؤ گے

یہ تیج کا میلہ ہے
اوٹ خریدیں گے
کیا خوب جھمیلا ہے

پگڑی ہے نہ گھوڑا ہے
چھورے کی قسمت میں
تنہائی کا پھوڑا ہے

چندہ سے چکوری کا
رشتہ ہے، جو رشتہ
پلنے سے ڈوری کا

یہ فرض نبھاؤں گا
موم پرندوں کو
دھوپوں سے بچاؤں گا

وسعت میں سما جاؤں
پَر جو عطا ہو جائے
آکاش پہ چھا جاؤں

ماہیے نذیر فتحپوری

یہ روپ کی مٹی ہے
گوندھ غزل کوئی
کس بات کی دیری ہے

ہر سمت جھمیلے تھے
ساتھ ترا جب تھا
کیا خوشبو کے میلے تھے

دکھ درد کی بانی ہے
اپنی کہانی تو
بس اپنی کہانی ہے

تنہائی مٹانا ہو
آ گیا ساون تو
ساجن کو بلانا ہو

مت سوچ کہ تحفے ہیں
آنکھ لہو ہوگی
یہ خواب کے نیزے ہیں

ہے باعثِ حیرانی
دوشِ ہوا پر ہے
خوشبو کی پریشانی

بے نام ونشاں ہیں اب
تجھ سے تعلق تھا
وہ لمحے کہاں ہیں اب

کیا صبح کا منظر ہے
اوس کی خوشبو ہے
ہر چیز معطر ہے

یادوں کا نگر سُونا
تیرے نہ آنے سے
خوابوں کا ہے گھر سُونا

جو خواب سے ڈر جائے
موت سے پہلے ہی
وہ آدمی مر جائے

توقیر وفا کی ہے
ٹوٹ نہ پائے گی
زنجیر وفا کی ہے

ہے دل کا یہی ورثہ
اس کی محبت کو
میں بھول نہیں سکتا

توقیر کے قابل ہے
جس کو مسلتے ہو
وہ پھول نہیں، دل ہے

یہ دیکھا ہے آنگن میں
خواب کی پرچھائیں
استادہ ہے آنگن میں

اک رنگ تمہارا ہے
چہرۂ ہستی پر
اک رنگ ہمارا ہے

مَل کا نہ مُل کا ہے
ہم کو نشہ یارو
شبنم کا ہے، گُل کا ہے

بال اپنے، نہ پر اپنے
اُڑنے کی خواہش میں
سب ٹوٹ گئے سپنے

کیا رنگ نکھارا ہے
پیار کے موسم نے
ہر شئے کو سنوارا ہے

ماہیے نذیر فتحپوری

پہچان سے باہر ہے
اس کا تصور ہی
امکان سے باہر ہے

بے باک پرندہ ہے
تیر سے بچ نکلا
چالاک پرندہ ہے

جو دل پہ گزرتی ہے
شعر کی صورت وہ
کاغذ پہ اترتی ہے

اب یوں بھی دکھا دیں گے
اپنے تفکر کو
چٹکی میں اڑا دیں گے

تم شہر سے آ جاتے
دن کے اجالے بھی
راتوں میں سما جاتے

کیا شعلوں کو چھوتا ہوں
انگلیاں جلتی ہیں
جب خوابوں کو چھوتا ہوں

مسدود نہیں رکھتے
درد کے رشتوں کو
محدود نہیں رکھتے

ہم وعدہ نبھائیں گے
پیار کی قیمت ہے
جاں دے کے چکائیں گے

قندیل نہیں باقی
کوئی اجالے کی
تمثیل نہیں باقی

پھر کس کی دعا لینا
ماں سے جو خالی ہو
اس بستی سے کیا لینا

کیا تجھ کو ہے اندازہ
بکھرے گا اک پل میں
یہ سانسوں کا شیرازہ

کیوں خاک اڑاتے ہو
میری حقیقت کو
افسانہ بناتے ہو

ہے مرحلہ پیچیدہ
دل میں لپک اُٹھا
اک شعلۂ نادیدہ

سایہ ہے نہ دیواریں
زیست کے جنگل میں
ہیں دھوپ کی بوچھاریں

شمشیر سے کیا ڈرتے
عشق کے شیدائی
زنجیر سے کیا ڈرتے

کیا قہر ہوا میں ہے
سانس لگی گھٹنے
کیا زہر ہوا میں ہے

تذلیل نہیں سہتا
درد کا آنسو ہے
پلکوں سے نہیں بہتا

میں بھول گیا کب سے
روح سے لپٹی ہے
زخموں کی قبا کب سے

ماہیے نذیر فتحپوری

کیا ہجر کے صدمے ہیں
رات ہے ٹیسوں کی
دن درد میں ڈوبے ہیں

درپیش یہ مشکل ہے
خالی ہے مشکیزہ
اور صحرا مقابل ہے

جینے کا مزہ لینا
درد کی دولت کو
مل بانٹ کے کھالینا

زخموں کو وہ بھولے گا
نیند ہنڈولوں پر
جو آدمی جھولے گا

دھندلی سی ہیں تصویریں
کیسے کوئی سمجھے
پانی کی ہیں تحریریں

حاجت ہی نہیں کوئی
راہ کے پتھر کی
قیمت ہی نہیں کوئی

سب یاد دلائے گی
کون تھے ہم کیا تھے
تاریخ بتائے گی

ایسے بھی نبھالیں گے
کوئی بھی مل جائے
ہم دوست بنالیں گے

احساس کی دولت ہے
سب کو نہیں ملتی
مل جائے تو قسمت ہے

کب شعر سناتے ہیں
خونِ جگر سے ہم
دیوان سجاتے ہیں

تحریر ہتھیلی کی
مجھ پہ نہیں کھلتی
ہے مثل پہیلی کی

نفرت کو بڑھاتے ہیں
بھائی تو آنگن میں
دیوار اُٹھاتے ہیں

ویران گزر گاہیں
ہم نے بسائی ہیں
سنسان گزر گاہیں

ہے دور تلک صحرا
پیاس بجھے کیسے
پانی ہے نہ مشکیزہ

قصہ نہ کہانی لکھ
دنیا میں جینے کے
کچھ اور معانی لکھ

تنہائی میں بیٹھا ہوں
خود کو بجھا کر میں
تُو آئے تو جل جاؤں

وہ چہرا جو اپنا تھا
روٹھ گیا ایسے
جیسے کوئی سپنا تھا

مدفون مسرت کو
ڈھونڈ کے لائیں گے
کھوئی ہوئی دولت کو

ماہیے نذیر فتحپوری

ٹوٹے ہوئے رشتوں کو
سوچ کے کیا حاصل
بچھڑے ہوئے لوگوں کو

تو ہے تو تماشا ہے
ورنہ ہر اک منظر
بس نظروں کا دھوکا ہے

ہر چیز سے ڈرتا ہے
آج کے انساں کا
دل فاختہ جیسا ہے

کیا حادثہ پیش آیا
وقت کا شہزادہ
کس بات سے گھبرایا

تقدیر میں لکھا ہے
خواب کہاں اپنی
تعبیر میں لکھا ہے

اب اور کدھر جائیں
تجھ سے بچھڑ کر تو
دل کرتا ہے مر جائیں

سب خواب کے سائے تھے
اپنی کہانی کے
کردار پرائے تھے

ہر آنکھ ہے نم کیا ہے
جس پہ سبھی روئیں
سوچو تو وہ غم کیا ہے

الفاظ کی صناعی
ماہیا کہنے میں
یہ کام بہت آئی

پونہ کی فضاؤں میں
شعر کہے ہم نے
پُرکیف ہواؤں میں

رحمت کے فرشتے ہیں
اس میں اتریں گے
جس گاؤں میں بچے ہیں

کیا اس کو کہا جائے
جس کو بلاؤں میں
وہ دور چلا جائے

اب جی میں یہ ٹھانی ہے
سائے کے بن یارو
اک عمر بِتانی ہے

کب لوٹ کے آتے ہیں
بچھڑے ہوئے لمحے
بس چھوڑ کے جاتے ہیں

زخموں کے نشاں لکھنا
اپنی کہانی میں
اشکوں کا بیاں لکھنا

کیا خواب دکھاتے ہیں
دھرتی کے باشندے
آکاش سجاتے ہیں

شمعوں کو بجھا دینا
رات ڈھلے ساتھی
تب دل کو جلا دینا

ہر چیز میسر ہے
تیرے نہ ہونے سے
یہ گھر بھی کوئی گھر ہے

ماہیے امین خیال

(گوجرانوالہ)

انسان کی فطرت ہے
خلقتِ آدم کا
مقصد ہی محبت ہے

ماہیے کا قصہ ہوں
تیرے قصیدے کی
تشبیب کا حصہ ہوں

سب تجھ پہ فدا ماہیا
تجھ سے وفا کرنا
ہے رب سے وفا کرنا

دل میرے کی تو رانی
عمر میں گو اپنی
ہے فرق بہت جانی

ٹوکے پہ ٹوکا ہے
جھوٹ تری باتیں
اور پیار بھی دھوکا ہے

کیوں دل بھر آتا ہے
بھیگی شب میں جب
کوئی ماہیا گاتا ہے

لہراتا گیا آنچل
زلفوں والی کو
سجتا ہی گیا کاجل

لگتا نہیں دل ماہیا
لُوٹے چَین تری
ٹھوڑی کا تل ماہیا

کوئی ماہیا گاتا ہے
کانوں میں جیسے
کوئی رس ٹپکاتا ہے

وہ یار نہ تیرا ہے
میں ہوں ماہیے کی
اور ماہیا میرا ہے

اب تو کچھ کر ماہیا
سوچ ہری کے تو
جلتے ہیں پر ماہیا

چرخے کی گھوک آئے
درد بھری لے میں
جب ماہیا کوئی گائے

باغوں میں گھاس نہیں
پھول محبت کے
کھلنے کی آس نہیں

دل کونا ماہیے کا
ہار تو میرا ہے
اور سونا ماہیے کا

جو میرا تھا ماہیا
چھپ کے مرے دل میں
بن بیٹھا خدا ماہیا

خوش رنگ ہے تو ماہیا
مولسری جیسی
تیری خوشبو ماہیا

دینا ہی دینا ہے
ماہیا بن تیرے
کیا جی کے لینا ہے

یک نہ دو شد ماہیا
ماہیا کہہ کہہ کے
ہو جاؤں نہ خود ماہیا

ماہیے امین خیال

کرہم پہ نظر ماہیا
راہ میں بیٹھے ہیں
اس رہ سے گزر ماہیا

کوہسار میں جھرنا ہے
زیست کوئی جیسے
جرمانا بھرنا ہے

کرنا ہے خطاب آخر
نفرت ہی ہوگی
نفرت کا جواب آخر

خوابوں میں گلاب آئے
جب جب آنکھ کھلی
کانٹوں کے عذاب آئے

ساحل نہ کنارا ہے
حد ہی نہیں جس کی
جیون، وہ دھارا ہے

لوہے کا گہنا ہے
بیٹا ہاری کا
ہاری ہی رہنا ہے

بے خواب نہیں ہوتا
اب میں اتنا بھی
بے تاب نہیں ہوتا

کیا عجب تماشہ ہے
رنج و محن ہی تو
جیون کا خلاصہ ہے

سستے میں تلتا ہے
قوم کا مستقبل
فٹ پاتھ پہ رُلتا ہے

وہ تو اک سپنا تھا
ناز تھا جس دل پر
کب دل وہ اپنا تھا

در وا تو کیا ہوتا
اجر دیا ہوتا
یا صبر دیا ہوتا

زردار کا گھوڑا ہے
جھوٹ کی عزت ہے
سچ کے لیے کوڑا ہے

دن ساون بھادوں کے
آنکھ کے دریا میں
ہیں موتی یادوں کے

کچھ بھی تو نہیں ہوں میں
تم نے جہاں چھوڑا
اے یار وہیں ہوں میں

کب سنگل ٹوٹیں گے
باہنے صدیوں کے
کب قید سے چھوٹیں گے

ہر دل میں دھڑکن ہے
جیون جیسے کوئی
ٹوٹا ہوا برتن ہے

مٹ تو نہیں جائے گی
جو بھی صدا دوگے
وہ لوٹ کے آئے گی

اب بڑھنے نہیں پائے
کوئی ہوا آئے
اس حبس کو لے جائے

ماہیے   اسماعیل گوہر

کیا زور ہے مستی ہے
اپنے سپیرے کو
اک ناگن ڈستی ہے

جوگی بن جاؤں گا
ناگن ناچے گی
میں بین بجاؤں گا

ہر روپ میں تیرا ہوں
تُو گر ناگن ہے
میں تیرا سپیرا ہوں

کس سمت نشاں ڈھونڈے
خانہ بدوشوں کو
اب کون کہاں ڈھونڈے

یوں عمر بِتائی ہے
جیسے چٹان کوئی
کندھوں پہ اُٹھائی ہے

تسبیح کے دانے ہیں
ایک پہ ایک گرے
کیا تیرے بہانے ہیں

شعروں کی سبیل کرے
حسن ترا مجھ کو
ہر لحظہ اپیل کرے

ہر ساز پہ فٹ ہوں گے
آپ اگر گائیں
سب ماہیے ہٹ ہوں گے

تخریب میں رہتا ہے
دل کا کوئی حصہ
ہر روز ہی ڈھتا ہے

افغان نہیں رہتا
جس کے سینے میں
ایمان نہیں رہتا

اُس نے یہ سخا کر دی
درد کی اک لمبی
جاگیر عطا کر دی

رنجور سا رہتا ہوں
اپنے آپ سے بھی
کچھ دور سا رہتا ہوں

دیہات سے آئیں گے
شہر کو پھر سے ہم
آداب سکھائیں گے

بے مایہ غنی دیکھے
شہر کی گلیوں میں
باتوں کے دھنی دیکھے

تُو آم جو کھائے گی
ہاتھ ترے دھونے
برسات ہی آئے گی

اس دل پر زور نہیں
تیرے بِنا، اچھا
لگتا کوئی اور نہیں

اب کس کو یقیں آئے
پہلے بھی کہہ کہہ کر
جب آپ نہیں آئے

ہشیار زمانہ ہے
اک تری بات ہی کیا
ہر شخص سیانا ہے

ماہیے   اسماعیل گوہر

تیری سوچ میں لیٹا ہوں
تھکتا نہیں ہوں میں
مزدور کا بیٹا ہوں

☆☆☆

انسان کا بیٹا ہے
محنت سے خوش ہے
دہقان کا بیٹا ہے

☆☆☆

مزدور کی بیٹی ہے
باپ کی طرح ہی
تھک ہار کے لیٹی ہے

☆☆☆

مجبور کا سونا کیا
خواب میں غم ڈھوئے
مزدور کا سونا کیا

☆☆☆

مضبوط شکنجے سے
نکل ہی آؤں گا
حالات کے پنجے سے

☆☆☆

وہ قد میں رہے اپنے
وہ ہی معقول لگے
جو حد میں رہے اپنے

پستی میں اُترتے ہیں
اپنی بلندی کی
تعریف جو کرتے ہیں

عادات نہ بدلے گا
دولت آنے سے
کم ذات نہ بدلے گا

شیرین کے قصے میں
سخت چٹانیں تھیں
فرہاد کے حصے میں

بس عام سا رہتا ہے
تیرے بِنا ساون
بے نام سا رہتا ہے

جب تیرے بِن آئے
خاک مزہ دے گا
چھٹی کا جو دن آئے

بس کام سے چھٹیاں ہیں
پردیسی کی بھلا
کیا عید کی خوشیاں ہیں

یوں ظلم بھی ڈھاتے ہو
آنے سے پہلے ہی
تم لوٹ بھی جاتے ہو

طبلے پر تھاپ پڑی
ماہیے میں گاؤں
کوئی بام پہ آن کھڑی

آپ اپنے کو جوڑا ہے
اک اک ماہیے نے
میرے جسم کو توڑا ہے

جب ماہیے گاتا ہوں
ذہنوں میں بے موسم
کچھ پھول اُگاتا ہوں

تیرا حکم نہیں توڑا
دیکھے بِنا ہم نے
کوئی خواب نہیں چھوڑا

کیا پائیں گے میلوں میں
دل ہی نہیں لگتا
بے مہر جھمیلوں میں

ماہیے افضل چوہان

اک ایسا سوال آیا
لکھتے ہی پرچے میں
بچپن کا خیال آیا

آواز ہے تاڑی کی
دل کو سکوں بخشے
یہ کوک سی گاڑی کی

بوری میں جوار آئی
ایسے لگتا ہے
پت جھڑ میں بہار آئی

راجہ پٹیالے کا
سیر کو نکلا ہے
بانکا انبالے کا

بیٹھے ہیں مچانوں پر
پیٹ تو خالی ہیں
بس زور ہے گانوں پر

دلی بھی دور ہوئی
پیدل کا رستہ
وہ تھک کر چور ہوئی

گھر رہن رکھایا ہے
بارات کا کرشن نے
تب کھانا پکایا ہے

پنگھٹ پہ بہار آئی
رنگ جوانی کے
اوڑھے اک نار آئی

پھر آگ سی بھڑکی ہے
نرم چناروں سی
کشمیر کی لڑکی ہے

کتنا بد طینت ہے
شکر ادا کر لو
غربت بھی غنیمت ہے

بچوں کی سعادت ہے
ماں کی خدمت بھی
بس عین عبادت ہے

ویلا وہ آنا ہے
عشق کی روہی میں
ہمیں بہتے جانا ہے

کیا حسن ہے نرمی میں
کیف اتر آیا
ترے جسم کی گرمی میں

مجھ پر احسان ترا
پوچھتا رہتا ہے
افضل چوہان ترا

تجھ بن ناں رہ پائے
آج تلک بھی ہم
یہ بات نہ کہہ پائے

ریوڑ ہیں خوابوں کے
آس کے جنگل ہیں
بے بس بے تابوں کے

اب چھوڑ نہیں سکتا
ڈور محبت کی
میں توڑ نہیں سکتا

لمحے طغیانی کے
بیت گئے آخر
وہ دن بھی جوانی کے

ماہیے افضل چوہان

کیا خوشبو آئی ہے
ابلے ہوئے چاول
اور دال پکائی ہے

برتن کوئی کھڑکے ہے
ننھی آہٹ پر
میرا دل کیوں پھڑکے ہے

ہم کو بھی نہیں بھاتے
شاکاہاری ہیں
ہم ماس نہیں کھاتے

کیسی انہونی ہے
بچوں کے لڑنے پر
پنچائیت ہونی ہے

وہ حسن زمانوں کا
رحمت در رحمت
شافع ہے جہانوں کا

دنیا ہے پھلواری
سب نے کھلنا ہے
اپنی اپنی باری

جاتے ہی بھول گیا
دولت ملنے کی
خوشیوں سے پھول گیا

درگاہ پہ قوالی ہے
دینے پہ آئے تو
ہر شخص سوالی ہے

مٹی کے دو کوزے
آج اٹھائے پھر
بلی نے دو چوزے

ہم آس لگا بیٹھے
شام سے پہلے ہی
تیری راہ میں آ بیٹھے

شوقین بھی ہے پورا
ڈال کے کھاتا ہے
چاول پر گھی بورا

چوری تو چوری ہو
تنکے کی، چاہے
بھوسے کی بوری ہو

بھادوں کے ہیں چالے
دن کو گرمی ہے
اور راتوں کو پالے

ظالم نے لتاڑا ہے
کھیت ہمارا بھی
جنگلی نے اجاڑا ہے

تتلی کو پکڑتے تھے
بچپن میں اکثر
ہنستے ہوئے لڑتے تھے

تاریخیں روئی ہیں
مغربی کلچر نے
سب قدریں کھوئی ہیں

تعلیم کا رستہ تھا
بوجھ ہمارا تو
تختی اور بستہ تھا

مہنگائی کھاوے ہے
ایک روپے کا اب
کچھ بھی نہیں آوے ہے

جدید ادب شمارہ: ۱۸، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء

ماہیے افضل چوہان

تھا موڑ کہانی کا
ہم سے روٹھ گیا
جب دور جوانی کا

ترسوں ترے آنے کو
چپ تری کافی ہے
مجھے خوب رلانے کو

سرسوں کا تیل نہیں
یہ عشق ہے یار میاں
بچوں کا کھیل نہیں

کوئی عشق میں جوگی ہے
گر بے چین ہوں میں
بے چین تو وہ بھی ہے

ملنے کا وعدہ ہے
آنے کا اب گوری
کس روز ارادہ ہے

مندر کی داسی ہے
دید کی اب ماہی
مری روح بھی پیاسی ہے

دیں پھول پیاری کو
خوشبو کا تحفہ
الہڑ سی ناری کو

مٹی کا کھلونا ہے
اپنا ملن گوری
اک روز تو ہونا ہے

شیشے میں بال آیا
ڈھلتی جوانی سے
پھر تیرا خیال آیا

برسات نے آنا ہے
اب تری یادوں سے
دل کو بہلانا ہے

مالا بھی پروتی ہے
سن کر جانے کا
پھر خوب وہ روتی ہے

ایسا بھی سال آیا
ہجر مسلسل سے
میں خود کو نکال آیا

روہتک میں صحرا ہے
ہجر نے بخشا جو
وہ زخم بھی گہرا ہے

قسمیں مت کھایا کر
جان نکلتی ہے
مت دیر سے آیا کر

یوں خود کو سنبھال آیا
وقت کے دھارے پر
میں خود کو ڈال آیا

امبر کے تارے ہیں
دیکھ ہمیں گوری
ترے نین پیارے ہیں

دارو بھی وہ پیتا ہے
شاید آ جائے
اس آس پہ جیتا ہے

دکھ لکھنا جوانی کے
کتنے ہی قصے ہیں
اس درد کہانی کے

کتاب گھر

کتاب میلہ تعارف: حیدر قریشی

جب چڑیا شور کرے ماہیا نگار: اسماعیل گوہر

صفحات: 112 **قیمت**: 100 روپے، **پبلشر**: ادارہ علم و ادب، بفہ۔ ہزارہ

اسماعیل گوہر پشتو زبان وادب کے استاد ہیں۔اردو سے نہ صرف آشنا ہیں بلکہ اس آشنائی کو انہوں نے روشنائی سے مزین کیا ہوا ہے۔اردو ادب سے بھی اتنا ہی گہرا تعلق رکھتے ہیں جتنا پشتو زبان وادب سے۔مانسہرہ سے نکلنے والے ادبی رسالہ شعروسخن کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ادبی کتابوں اور ادبی مسائل پر ان کے تبصرے اور مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ماہیوں کے مباحث پر میری بعض کتابوں پر بھی انہوں نے تبصرہ کیا تھا۔مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کے تبصرے کے اندر کہیں ماہیے سے گہری وابستگی کا احساس کارفرما ہے۔

اسماعیل گوہر نہ صرف اردو ماہیا کے مباحث کو غور سے پڑھ رہے تھے اور ان پر اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے بلکہ وہ اس کے تخلیقی امکانات کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔یہ حقیقت مجھ پر اب ظاہر ہوئی ہے جب ان کے ماہیوں کے مجموعہ''جب چڑیا شور کرے'' کا مسودہ میرے سامنے موجود ہے۔اسماعیل گوہر نے ماہیے کی بحث میں ہلکا پھلکا سا حصہ لیا لیکن ماہیا نگاری کے ذریعے بھرپور تخلیقی اظہار کر دیا۔ان کے ماہیوں میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ہمارے ماہیا نگاروں میں عمومی طور پر پائی جاتی ہیں۔لیکن عمومی خوبیوں کے ساتھ ان کے ماہیوں میں افغانی اور پختون کلچر بہت نمایاں ہے۔اسے ایک لحاظ سے اردو ماہیا میں ایک اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

استر نہ لبادے ہیں	فولاد کو موڑ دیا	خوشحال خٹک پڑھ لو
ہم افغانی بھی	مجھ افغانی کو	ہم پشتونوں کا
کیا سیدھے سادھے ہیں	تیری ضد نے چھوڑ دیا	فکری مکتب پڑھ لو

''جب چڑیا شور کرے'' میں شامل ماہیے بحیثیت ماہیا نگار اسماعیل گوہر کی شناخت کو قائم کرتے ہوئے، اردو ماہیا کو پشتون اور افغان رنگ سے آشنا کر رہے ہیں۔اس حوالے سے یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ گولیوں کی تڑتڑ اور بموں کے دھماکوں کے شور میں گھرے ہوئے خطے کا ماہیا نگار چڑیا کی آواز کیسے سن پایا۔میں اسے پورے پختون خطے کے معصوم اور پرامن عوام کی آواز سمجھ رہا ہوں جو تدریجاً بلند آہنگ ہو کر شور جیسی لگ رہی ہے اور جو اپنے پورے پختون خطے میں امن وسکون اور ترقی کو دیکھنے کو خواہاں ہیں۔اس تناظر میں اسماعیل گوہر کے ماہیوں کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔میں اس مجموعے کی اشاعت کا تہہ دل سے اور امن کی دعا کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں!

سرسری تم جہان سے گزرے (خودنوشت) مصنف: اکرام بریلوی

صفحات: 404 **قیمت**: 400 روپے، **پبلشر**: بختیار اکیڈمی، گلشنِ اقبال، کراچی

اکرام بریلوی کی بنیادی ادبی شناخت صہبا لکھنوی کے رسالہ افکار سے ہوتی ہے جہاں وہ ان کے شریک مدیر تھے۔تاہم ان کی ادبی کارکردگی کئی جہات میں پھیلی ہوئی ہے۔اب حال ہی میں ان کی زندگی کی کہانی ''سرسری ہم جہان سے گزرے'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ان کی یہ خودنوشت سوانح ان کی ذاتی زندگی کی روداد ہونے کے ساتھ ان کے اندازِ تحریر کی بھی غمازی کرتی ہے۔۴۰۴صفحات کی اس کتاب کو انہوں نے کسی مربوط زمانی ترتیب سے یا ابواب کی کسی درجہ بندی سے پیش نہیں کیا۔بس جیسے جیسے جہاں جو یاد آتا گیا، اسے بیان کر دیا۔اس سے ان کی زندگی کے انداز کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اکرام بریلوی کی زندگی کا وہ حصہ زیادہ جاندار ہے جہاں انہوں نے حقائق و واقعات کو بیان کرتے ہوئے کسی وقتی مصلحت کو مدِ نظر نہیں رکھا۔تاہم جب وہ اپنے موجودہ زمانے کے احباب کے ذکر کی طرف آتے ہیں تو وہاں ایک احتیاط، مصلحت پسندی اور پبلک ریلشن شپ کے تقاضوں کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔تاہم یہ معمولی انسانی کمزوریاں ہیں جو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہم سب میں موجود ہیں۔مجموعی طور پر یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھ کر قارئین اکرام بریلوی سے ایک عمدہ ملاقات کر سکیں گے۔

اردو افسانہ اور اساطیر (تحقیقی مقالہ) مصنف: ڈاکٹر قاضی عابد

صفحات: 400 **قیمت**: 320 روپے، **پبلشر**: مجلس ترقی ادب۔۲۔کلب روڈ۔لاہور

ڈاکٹر قاضی عابد نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ''اردو افسانہ اور اساطیر'' کے موضوع پر لکھا تھا۔اسے اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔اساطیر کا موضوع اپنی بے پناہ وسعت اور زرخیزی کے باعث یوں تو دوسرے علوم سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق رکھتا ہے، تاہم ادب کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت بہت ہی خاص ہو جاتی ہے۔قاضی عابد نے ادب کی ایک صنف یعنی افسانے کو اس تناظر میں دیکھنے کی کاوش کی ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل اس مقالہ میں پہلے ''اساطیر: تعریف، حدود اور امکانات'' کے تحت بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہے۔''اردو داستانوں میں اساطیری عناصر'' کے زیرِ عنوان افسانے سے پہلے اردو داستانوں میں کارفرما ان اساطیری عناصر کی عمدگی کے ساتھ نشان دہی کی گئی ہے۔اس کے بعد قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۷ء تک اردو افسانے میں اساطیری عناصر دکھائے گئے ہیں۔ اگلے دو ابواب میں پاکستان اور ہندوستان کے افسانوں میں الگ الگ اساطیری عناصر کی کارفرمائی کو بیان کیا گیا ہے۔آخر میں''اردو افسانے پر اساطیر کے عمومی اثرات'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر باب کے آخر میں حوالہ جات و حواشی شامل ہیں اور آخر میں کتابیات کا مکمل احاطہ موجود ہے۔ڈاکٹر قاضی عابد نے یہ مقالہ لکھتے وقت محنت سے کام کیا ہے اور ان کا اندازِ بیان طالب علمانہ نہیں بلکہ ایسا عالمانہ ہے جو علم سے مملو اور انکساری سے گندھا ہوا ہے۔

ساختیات۔۔۔ایک تعارف (تحقیقی مقالہ) **مرتب: ڈاکٹر ناصر عباس نیر**

صفحات 247 **قیمت**: 295 روپے، **پبلشر**: پورب اکادمی، اسلام آباد

ڈاکٹر ناصر عباس نیر ایسے صاحبِ علم دانشور نقاد ہیں جن کے علم کا نور ان کی تحریر سے از خود ظاہر ہوتا ہے۔ میرا ان کا تعلق لگ بھگ ربع صدی پر پھیلا ہوا ہے، ہمارے درمیان زیادہ تر اختلاف رائے کا اظہار ہوتا رہا لیکن ادبی اختلاف رائے کہیں بھی ذاتی رنجش کا باعث نہیں بنا۔ ریکارڈ پر موجود ہمارے اختلافی مباحث اختلاف کا منہ بولتا ثبوت ہیں تو ربع صدی سے قائم ہمارے ادبی مراسم ناصر عباس نیر کی اس اخلاقیات کا مظہر ہیں کہ ادبی اختلاف کو ذاتی دشمنی میں نہیں ڈھلنا چاہیے۔ ان کی کتاب ''ساختیات۔۔۔ایک تعارف'' اس موضوع سے متعلق ان کی مرتب کردہ کتاب کا دوسرا اور نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور نے شائع کیا تھا اور یہ دوسرا ایڈیشن پورب اکادمی اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، فہیم اعظمی اور ناصر عباس نیر کے موضوع سے متعلق دو دو مضامین شامل ہیں، ضمیر علی بدایونی اور قاسم یعقوب کا ایک ایک مضمون شامل ہے۔ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے سات مضامین میں نظری مباحث شامل ہیں جبکہ آخری چار مضامین میں ساختیاتی تنقید کے عملی نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں پوری ذمہ داری کے ساتھ ساختیات کی اہم اصطلاحات، ساختیات کے اہم بنیاد گزاروں کا تعارفیہ اور کتابیات کو شامل کیا گیا ہے۔

کسی موضوع کی بحث میں اتفاق یا اختلاف کرنا ہر ادبی قاری کا حق ہے، تاہم ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے کتاب کو مرتب کرتے وقت درسی نوعیت کی معلومات کی سطح سے اوپر کے علمی مضامین کو کتاب میں جگہ دی ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ساختیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک اچھا علمی تعارفیہ ہے۔

سرمایۂ فکر ونظر (مضامین) **مصنفہ: ڈاکٹر رضیہ حامد**

صفحات 240 **قیمت**: 200 روپے، **پبلشر**: باب العلم پبلی کیشنز، بھوپال

ایک ادیبہ اور سہ ماہی فکر و آگہی کی مدیرہ کی حیثیت سے ڈاکٹر رضیہ حامد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، بھوپال کی علمی و ادبی شناخت کے حوالے سے تحقیق وتنقید کے باب میں انہیں سند کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے مضامین کا نیا مجموعہ ''سرمایۂ فکر ونظر'' کے نام سے سامنے آیا ہے۔ اس میں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر، شاعروں اور ادیبوں کی کارکردگی کی مختلف جہات پر ملے جلے ۳۵ مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ حامد کے بقول: ''اس مجموعہ میں شامل اکثر مضامین مختلف سیمینار کے لئے یا رسائل کی فرمائش پر لکھے گئے تھے''۔۔۔اس کے باوجود کہ فرمائش کے تقاضوں کو کچھ نہ کچھ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، ڈاکٹر رضیہ حامد نے ان مضامین میں اپنے کم از کم ادبی معیار کو برقرار رکھا ہے۔ جہاں انہوں نے ایک طرف سینئر اور اہم لکھنے والوں کو اہمیت دی ہے وہیں نئے لکھنے والوں کے بارے میں فراخدلانہ اعتراف کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ 'سرمایۂ فکر ونظر' کے ان مضامین سے ڈاکٹر رضیہ حامد کی علمی و ادبی سوچ اور ذہنی رسائی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پسِ گرداب (غزلیں) **شاعر: شاداب احسانی**

صفحات: 192 **قیمت**: 300 روپے، **پبلشر**: ماورا پبلشرز، لاہور

شاداب احسانی آج کے سینئر شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ غزل سے ان کی خاص وابستگی ہے۔ آج کی غزل میں ان کا حصہ ان کے مجموعۂ کلام ''پسِ گرداب'' کی صورت میں ادبی دنیا کے سامنے ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ ۸۹ غزلوں پر مشتمل اس مجموعہ کا دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا کا تحریر کردہ ہے۔ تبرکاً صاحبزادہ نصیر الدین نصیر سے پیش لفظ بھی لکھوا لیا گیا ہے۔ پیش لفظ اور دیباچہ دونوں میں شاداب احسانی کی شاعری کے حوالے سے اہم باتیں کی گئی ہیں اور ان کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ شاداب احسانی کے شعری مجموعہ کے چند اشعار سے ان کی گزل کے عمومی انداز کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم کو خود سے ملے زمانہ ہوا — گھر سے بے گھر ہوئے زمانہ ہوا
مانا کہ وصل وہجر ازل کی اکائی ہیں — لیکن بدن سے جاں کا تعلق کچھ اور ہے
خزاں جیسی بہار آئی ہے اب کے — تماشا بھی تماشائی ہے اب کے
آسماں بھی زمین جیسا ہے — یہ گماں بھی یقین جیسا ہے
دریا میں بار بار اترنا تو ٹھیک ہے — لیکن یہ لہر لہر بدن ہو رہا ہے کیوں

شہر خاموش ہے (غزلیں، نظمیں) **شاعر: شاہد ماہلی**

صفحات: 244 **قیمت**: 200 روپے، **پبلشر**: معیار پبلی کیشنز۔ دہلی

ادبی جریدہ معیار کی ادارت سے شہرت پانے والے شاہد ماہلی نے اپنے اشاعتی ادارے کے ذریعے علم و ادب کی بھرپور خدمت کی۔ اپنے تخلیقی اظہار کے لیے انہوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف سے کام لیا۔ غزل اور نظم کی غیر ضروری کشاکش کے باوجود شاہد ماہلی نے دونوں اصناف کے ساتھ بساط بھر انصاف کیا۔ کچھ لوگوں کو ان کی غزل زیادہ اچھی لگی تو کچھ لوگوں کو ان کی نظم زیادہ بھلی لگی۔ میرے جیسے لوگوں کو دونوں اصناف میں ہی شاہد ماہلی بھلے لگے۔ شاہد ماہلی خود بھی خاموش طبع انسان ہیں اسی لیے انہوں نے شہر کی خاموشی کی طرف توجہ کی ہے۔ غور سے دیکھیں تو یہ شہر جو خاموش ہے حقیقتاً خود شاہد ماہلی کے اندر کا شہر ہے۔ اپنے اس مجموعۂ کلام کے ذریعہ شاہد ماہلی نے صرف شہر کی خاموشی کی ترجمانی نہیں کی بلکہ اس خاموشی کو ایک زبان دے دی ہے۔ شاعری کی زبان۔

ایک لمحہ تھا جو تبدیل ہوا برسوں میں — ایک منظر تھا جو دوبارہ دکھایا نہ گیا
پھرتا ہوں لے کے ہاتھوں میں اک کاسۂ انا — سودائیوں میں ہوں، کبھی صحرائیوں میں ہوں
ہم اپنا درد سنائیں، اگر سنے کوئی — کسی کا حال سنیں، کوئی ہم کلام تو ہو

''شہر خاموش ہے'' کی ساری غزلوں، نظموں میں شاہد ماہلی کے اندر کے خاموش شہر کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اپنے قاری سے ہمکلام ہوتی ہوئی آوازیں، اور اپنا درد سناتی ہوئی آوازیں، جو ہمیں اپنی آواز بھی لگتی ہیں۔

منشائیے (مضامین، جائزے، خاکے) **مصنف**: **منشایاد**

صفحات:387 **قیمت**:600روپے، **پبلشر**:مقبول اکیڈمی، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور

منشایاد اردو کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ان کے نو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔پنجابی کتب اور مرتب کردہ کتب کی تعداد الگ سے ہے۔ایک ادیب کی حیثیت سے انہوں نے لکھنے کے ساتھ پڑھنے کا عمل بھی جاری رکھا۔ان کا مطالعہ ادب اور ادیب ہر دو سطح پر جاری رہا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے بعض ادیبوں کے خاکے لکھے،بعض کتابوں کے ادبی جائزے لکھے،مضامین لکھے۔یوں مضامین کا مجموعہ''منشائیے''تیار ہو گیا۔

میں ادب میں تنقید کا قائل ہوں،نظری تنقید کی اہمیت کا معترف ہوں،تاہم مجھے وہ تنقید اور نظری مباحث کھلتے ہیں جن میں پوری بحث کے آخر تک قاری کو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا سمجھایا جا رہا ہے۔ایسی یبوست زدہ تنقید کے مقابلہ میں ادب کے قاری کی سیدھی سی رائے ،اور کھلا تاثر زیادہ معتبر ہو جاتا ہے۔منشایاد نے ادبی شخصیات کا جائزہ لیا ہے یا ادبی کتابوں کا، ہر دو قسم کے جائزوں میں انہوں نے ادب اور قاری کے رشتے کو صرف عام فہم نہیں بنایا بلکہ دل میں اتر جانے والا بھی بنا دیا ہے۔ممتاز مفتی،عصمت چغتائی،ضمیر جعفری،احمد ندیم قاسمی،قدرت اللہ شہاب،لطیف کاشمیری،اعجاز راہی،ضیا جالندھری،ملک مقبول احمد،اکبر حمیدی ،رشید امجد،احمد فراز،اور متعدد دیگر معروف اور غیر معروف ادیبوں سے لے کر پروین عاطف اور فریدہ حفیظ تک منشایاد نے کسی کی کتاب کا جائزہ لیا ہے تو ساتھ ہی اس کی شخصیت کو بھی نمایاں کر دیا ہے اور شخصیت کا جائزہ لیا ہے تو اس کے ادبی قد و قامت کو بھی پیش کر دیا ہے۔

''منشائیے''منشایاد کے ذاتی تاثرات پر مبنی مضامین ہیں۔اس لحاظ سے کتاب کا نام بہت با معنی اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔کتاب کے تمام مضامین میں منشایاد کا رویہ محبت آمیز رہا ہے،انہوں نے زیادہ تر وہ ادب پارے منتخب کیے ہیں جن سے وہ اپنی ادبی محبت کے اظہار میں کوئی الجھن محسوس نہ کر سکیں۔اپنے ایماندارانہ اظہار کی وجہ سے منشایاد کی تحریر بہت زیادہ دلچسپ ہو گئی ہے۔اس میں جن شخصیات سے تعارف ہوتا ہے وہ آپ کی جانی پہچانی شخصیات ہوں تب بھی ان کی شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں جو ایک طرح سے انکشاف کا درجہ رکھتے ہیں۔اسی طرح جن کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے اس سے متعلقہ کتب کو خود پڑھنے کی تحریک ملتی ہے۔

''منشائیے''روایتی تنقید کے مضامین کا مجموعہ نہیں ہے لیکن اپنے اندازِ بیان کی وجہ سے ہماری روایتی تنقید کی رہنمائی کرتا ہے۔ان مضامین سے ہمارے ناقدین کرام سیکھنا چاہیں تو یہ سیکھ سکتے ہیں کہ کسی ادب پارے کے مطالعہ کا طریق کار کیا ہونا چاہیے۔قاری کو ادب سے قریب کرنا مستحسن ہے یا ایسا علم بگھارنا جو صرف یبوست زدہ اور جارحانہ تنقید کو سامنے لائے۔تنقید کے نام پر قاری کو ادب سے دور کرنے والے نقادوں کو''منشائیے'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔مجھے امید ہے کہ ایسے نقاد پھر اپنے لیے بہتر راہیں تراش سکیں گے۔ذاتی طور پر مجھے''منشائیے'' نے بہت ادبی مزہ دیا ہے۔میں ابھی تک منشایاد کے مضامین کی خوشبو میں گھرا ہوا ہوں۔

پروفیسر عتیق اللہ (دہلی)

پروین شیر کی شاعری۔۔۔ایک ماحولیاتی مطالعہ

An ecological study

(کرچیاں اور نہالِ دل پر سحاب جیسے دونوں مجموعوں کے حوالے سے)

فطرت اور مظاہر فطرت سے مختلف قسم کی مشابہتیں قایم کرنیکی روایت کے سرے ان عوامی نغموں اور مذہبی صحیفوں کے تحت میں کارفرما ہیں جن کا تعلق تاریخ و ماقبل تاریخ زمانے سے ہے۔فطرت کے مظاہر وہ معروضی وسیلے ہیں جن سے شعرا نے ہمیشہ اپنے جذبوں کو زیادہ سے زیادہ کاری اور مئوثر بنانے کا کام بھی لیا اور روحانی سطح پر اس تصور وحدت کی توثیق بھی کی جو تمام عالم کون و مکاں اور تمام انفس و آفاق نیز مرئی اور غیر مرئی اشیا کو تہ بہ تہ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے ہوئے ہے۔فطرت کا خارجی رخ ہی تخلیقی تحریک کا باعث نہیں بنا، وہ داخلی رخ زیادہ فیض رسانی اور معنی خیزی رکھتا ہے جس کے اسرار کی کشش کبھی کم نہیں ہوتی اور جس کی کنہ تک پہنچنے کے لیے انسان ہمیشہ سرگرم رہا ہے۔ ہمارے اکثر شعرا فطرت جو ضرور تھے لیکن فطرت کے محض خارج ہی کو انہوں کل حقیقت سمجھ لیا تھا۔فطرت کا محض بیان شاعری نہیں ہے۔شاعری کا چشمہ وہاں پھوٹتا ہے جہاں انسانی جذبوں کے اظہار اور ان کی تطہیر کی کوئی راہ فطرت سے ہو کر جاتی ہے۔یہی راہ اس منزل کی نشاندہی بھی کرتی ہے جہاں سے دنیا کچھ اور ہی معنی میں ہمارے سامنے عیاں ہونے لگتی ہے۔

سب سے پہلے رومانیوں ہی نے فطرت سے انسان کے پیچیدہ اور تخلیقی رشتے کی طرف متوجہ کر کے یہ تصور مہیا کیا تھا کہ عناصر فطرت کے دردانہ اور موسمیاتی مشاہدات کی روداد بیان کرنا فطرت شناسی نہیں ہے۔فطرت خود ایک مذہب ہے۔فطرت کے وسیلے سے ہم تمام اشیا نیز فطرت اور فوق الفطرت کے اندر کارفرما روح کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔رومانیوں نے فطرت کی عظمت کا احساس دلایا اور اس کی تمجید و تجلیل بھی کی۔ یہ عمل نفسیاتی ترفع کا سامان بھی بنا۔رومانیوں کو فطرت کی عقب سے''انسانیت کی خاموش اور حزن آگیں موسیقی'' کا تجربہ بھی حاصل ہوا۔فکر کے نئے سانچے بھی میسر آئے اور دنیا کے ساتھ ساتھ ذہن انسانی کو سمجھنے کی فہم کو جلا بھی ملی۔اس اعتبار سے پروین کو ایک رومانی قرار دیا جا سکتا ہے۔لیکن وہ فطرت پسند ہونے کے باوصف ماحول دوست بھی ہیں۔ پروین کی

نظم ہی فطرت سے وابستگی کی مظہر نہیں ہے اپنی نثری تحریروں میں جہاں انہوں نے اپنے فکر وفن یا اپنے تصور تخلیق کے بارے میں وضاحت کی ہے وہاں ان کی زبان استعاراتی ہو جاتی ہے اور ان میں بھی بیش تر استعارے فطرت سے اخذ کردہ ہیں۔ درج ذیل اقتباس میں فطرت سے روحانی تعلق کا رنگ کچھ یوں ہے:

''دراصل زندگی ایک قوس قزح ہے، جس کے مختلف رنگ ہیں۔ کبھی اس کا پیلا رنگ شجر جاں پر چھا جاتا ہے اور اس کو خزاں رسیدہ بنا دیتا ہے تو کبھی ہرا رنگ سبز بخت بنا دیتا ہے۔ قوس قزح کے سب رنگوں کا امتزاج ہی تو ہے زندگی جس کے مختلف رنگ جاں کے سفید کینوس پر کبھی اپنی پیلاہٹ کی خزاں بکھیرتے ہیں تو کبھی سبز رنگ کی ہریالی۔ انہیں تضادات کے سیلاب میں کشتی جاں ......تخلیق کی پتوار لیے ہچکولے کھاتی ہوئی رواں ہے۔ کبھی سنگین چٹانوں سے ٹکراتی ہے تو کبھی بھنور میں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہے ....کبھی شجر جاں خزاں بخت ہو جاتا ہے تو اس کے کھڑکھڑاتے ہوئے سوکھے پتے جلا کر اس کی آگ سے اپنی تخلیق میں روشنی بھرتی ہوں اور کبھی سبز بخت ہو جاتا ہے تو ہرے پتوں کی سرسراہٹ کی ٹھنڈک سے۔''

پروین کے نثری اسلوب اور شعری اسلوب میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ دونوں میں شدت احساس ایک مشترک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں حواس سرگرم ہوتے ہیں وہیں پیکروں کے جھرمٹ کے جھرمٹ نمو پانے لگتے ہیں۔ پروین کی لفظیات یا لفظی خوشے حواس کو متحرک بھی رکھتے ہیں اور سرگرم بھی۔

رومانیوں نے فطرت کے جلال و جمال یا بازگشت بہ فطرت کا جو خوبصورت تصور پیش کیا تھا اسے مغرب میں سائنسی اور صنعتی ارتقا کا ردعمل بھی کہا جا سکتا ہے۔ جس نے گزشتہ دو سو برسوں کے پھیلے ہوئے عرصے میں فطرت اور انسان کی معصومیتوں کو مسخ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا ماحولیاتی ہلاکت خیزی کے دہانے تک پہنچ گئی ہے۔ تمام انسانیت پر ایٹمی جنگ، بے حد قیمتی قدرتی وسائل کی معدومی، شہری حدود کی بے قابو توسیع، آبادیوں کی دھماکہ خیز صورت حال، استحصالی ٹکنالوجیوں کے بے محابا فروغ، خلا کو کوڑے دان بنانے کی جستجو، تیزی سے ہر چہار طرف محیط ہوتی ہوئی آلودگی اور کئی انواع کی ناپیدگی کی دہشت طاری ہے۔ ممکن ہے کبھی یہ بھی کسی نسل کو سننا پڑے کہ فطرت میں اب کچھ ایسا نہیں بچا جسے خوبصورت اور محفوظ کہا جا سکے نیز جو ہمارے تخلیقی وجدان کو حرکت میں لانے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہو۔ یہ وہ آفات ہیں جو فطرت ہی نہیں انسانی صحت، انسانی جسامت، انسانی سائیکی اور انسانی حسن کے لیے بھی کم خطرناک نہیں ہیں۔ مغرب نے تیسری دنیا کا استحصال ہی نہیں کیا بلکہ عالمی سطح پر فطرت کی افزائش، عورت کی صلاحیت تولید اور بچے کی جسمانی بالیدگی پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔ ہمیں یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ماحول دوست اس تصور کو سختی کے ساتھ رد کرتے ہیں کہ ہر چیز سماجی یا لسانیاتی طور پر ساختہ ہے۔ ماحولیاتی ادبی تھیوری کے بنیادی ساختیاتی تصور ہی کو تسلیم نہیں کرتی برخلاف اس کے فطرت کا اپنا ایک وجود ہے جو ہم سے باہر واقع ہے اور جو ہمیشہ ہم پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ فطرت سے بے خبری

اور بے پروائی پر فطرت ہی مختلف اعمال کے ذریعے قدغن بھی لگاتی رہتی ہے۔ جب بھی انسان نے اپنی حدوں سے تجاوز کر کے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہے وہ قہرناک بھی ثابت ہوئی ہے، Where, Tears اور Shattered سے موسوم کردہ پروین کی مصوری کے نمونے فطرت کے دوسرے جلالی رخ کے مظہر ہیں۔ اس کی تندی و تیزی اور تشدد آوری ہمیں آزردہ و ملول کر دیتی ہے تو اس کی شفقتوں کے دامن کی کشادگی عافیت کا سامان بھی مہیا کرتی ہے۔

پروین کا فطرت سے جو رشتہ ہے وہ ذہنی سے زیادہ روحانی ہے۔ اس کا ذکر انہوں نے بارہا اپنی گفتگو میں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''بچپن ہی سے میرے بہترین ساتھی قدرتی مناظر رہے تھے، ۷ سال کی عمر میں حسین و رنگین افق کو دیکھ کر.....اور دور کھجور کے درختوں کی سلہاٹی دیکھ کر ایک نئی دنیا کے ہونے کا خیال مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا تھا جہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ آسمان کے کینوس پر بکھرے حسین رنگوں کو چرا کر کاغذ پر اپنی رنگین پنسل سے قید کر لیتی تھی۔ میرے اندر احساسات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کسی بھی راستے سے باہر نکلنے کو بے تاب تھا''۔

دوسری جگہ انہوں نے لکھا ہے: '' میں شاخ سے ٹوٹا ہوا وہ پتہ تھی جسے وقت کی آندھی اڑا کر سات سمندر پار لے آئی تھی۔ دراصل مغربی دنیا میں تنہائی کا زہر کاٹتا ہے اپنی زبان و تہذیب سے دوری نے مجھے ان کے اور قریب کر دیا۔ اپنی تنہائی کے شور کو قلم میں سمو دیا۔ آسمان پر سبک سفید پروں کو پھیلائے، اڑتے ہوئے بادلوں کے پنچھیوں سے دوستی کر لی۔ جھومتے درختوں کے نغمے، ندی سے چھیڑ خوانی کرتی ہوائیں مجھ میں وارفتگی پیدا کرتی رہیں۔ پورے چاند کی رات جب چاند ندی کے سینے میں آہستہ سے سما کر گھل مل جاتا، لہریں بل کھاتی ہوئی چاندنی بن جاتیں تو تخلیقی جراثیم اپنی بھرپور طاقت سے حملہ آور ہوتے۔ میرے اندر کوئی چیختا کہ کچھ ایسا کرو کہ یہ حسین لمحہ رک جائے۔ یہ نظارہ کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہو۔ وقت اسے چھین نہ لے.......اسی بے خودی کے عالم میں یہ نظم رقص کرتی ہوئی دل کے نہاں خانوں سے نکل آئی........جس کی چند سطریں:

''شہر سارا سکوت خواب میں تھا
اور میں پورے چاند کی اس رات
چاندنی اوڑھے بیٹھی تھی چپ چاپ
چاند کے ہالے سے اتر کر خواب
میری پلکوں میں سمٹ آئے تھے''

اس لحاظ سے پروین نے فطرت کے مظاہر کو جا بجا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ ایسے مقامات پر فطرت ایک شفیق ماں کے کردار میں ڈھل جاتی ہے۔ جو تخلیقی حس کے تئیں جلا کار بھی ہے اور روحانی طمانیت اور روحانی ترفع کا ساز

بھی بلکہ فکر واستغراق کے لیے اکسانے کا ذریعہ بھی۔ پروین اسا سا ماحول دوست ہیں اور ماحول دوست ہونے کے اعتبار سے بے حد حساس واقع ہوئی ہیں۔سائنس، تکنالوجی اورتہذیب جس طور پر فطرت (جو ایک عظیم ماں ہے) کو مسخ کرنے کے درپئے ہے۔ پروین نے بڑے دکھ کے ساتھ اسے اپنی پینٹنگز اور نظموں میں ادا کیا ہے۔آدمی کا تہذیبی سفر فطرت سے استفادے سے شروع ہوا تھا،انیسویں صدی کے بعد یا یہ کہیے کہ صنعتی انقلاب کے بعد استفادے کی روش استحصال میں بدل جاتی ہے۔فطرت کے استحصال میں مختلف اقوام میں مسابقت کا میلان شروع ہو جاتا ہے اور انسانیاتی تاریخ ایک جذبوں سے عاری منطقے کی راہ لے لیتی ہے۔اسی بنا پر وندنا شیوا نے سائنس کو فطرت مخالف اور تذکیری کہا ہے۔مرد نے عورت اور فطرت دونوں کا اس طور پر استعمال کیا جیسے ان کی تخلیق کا مقصد بھی یہی تھا۔تکنالوجی اور صنعتی آفات کی سب سے پہلی شکار عورت اور اس کی باز تخلیقیت نیز بچے اور فطرت ہوتی ہے۔ پروین کی بیشتر شاعری بلکہ مصوری بھی بچہ،عورت اور فطرت کے محور پر گردش کرتی ہے۔ ماں اور فطرت دونوں ایک ہی ہستی میں ضم ہو جاتے ہیں اور دونوں شاعرہ کے لیے طمانیت نفس اور روحانی اہتزاز کے اسباب مہیا کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ''ماں'' اور ''مگر اب تو'' کے یہ اقتباس دیکھیں:

تو ہے اک گہرا سمندر پیار کا/ ریگ زاروں میں شجر ہے سایہ دار/ کیف آگیں،روح پرور تیری چھاؤں/ زندگی کی دھوپ میں سایہ فگن/ مجھ پہ بادل سی رہی ہے عمر بھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''**ماں**''

وہ بچی چاہتی ہے،/اس کے بچپن کی لطافت/ زندگی میں پھر سے در آئے/ وہی معصوم جذبے ہوں جو چہرے پر نکھرتے تھے/وہی الفت بھرے بندھن جو پکے تھے/وہی شوخی، وہی دل کھول کر ہنسنا/ خیاباں میں/ برستی چاندنی میں بھیگ جانا/ اور/ کبھی مخمل سے رستوں پر/ وہ ننگے پاؤں چل کر پھول چن لینا/ وہ اڑتی تتلیوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے جانا/ ملائم گھاس کی تازہ ہری پتی کے ہونٹوں سے/ وہ موتی جیسے قطرے اوس کے پینا/ کبھی بادل کی اڑتی ٹکڑیوں پر سوچنا/ اے کاش/ میں بھی آسماں کی سیر کرتی/ بادلوں کے ساتھ اڑتی/ وہ آنچل میں پکڑ کر/ جگنوؤں کی جلتی بجھتی روشنی پر/ کھلکھلا دینا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''**مگر اب تو**''

غم گسار میں بھی شاعرہ کا چارہ ساز ودم ساز ایک پیڑ ہی ہے،جو اس کے لیے رفیق دیرینہ کے مماثل ہے۔اس کی خزاں رسیدگی شاعرہ کو مغموم کردیتی ہے۔یہاں پیڑ انسانوں سے زیادہ انسان کا تاثر دے رہا ہے۔نظم کے تحت میں کچھ کھو جانے یا ضایع ہونے سے پیدا ہونے والے حزن وملال کے احساس کی رو کارفرما ہے،ممکن ہے اس احساس میں وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس یک جان ہو گیا ہو۔ پروین کی نظموں میں اس نوع کے کئی معروضی تلازمات سے سابقہ پڑتا ہے۔''کاش'' میں زرد پتہ،شاعرہ کی عمر گزشتہ کی یادوں کو برانگیخت کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

شاخ سے ٹوٹا ہوا اک زرد رُو بیمار پتہ/ تیز آوارہ ہوا کی بانہیں تھامے/ اڑتا اڑتا/ ڈوبتی نبضوں کے سرگم میں

پھنسی/ ان خشک شریانوں کو جھک کر دیکھتا ہے/ جو کبھی سیراب تھیں جاں بخش خوں سے/ اور پھر یہ لامحالہ سوچتا ہے/ کاش یہ میری رگیں/ شاداب ہو پاتیں تمہارے خوں کی شبنم سے/ زندگی سرشار ہو سکتی مری/ اک بار پھر میں ناچ سکتا!۔۔۔۔''**کاش**''

درج ذیل شعر میں پیلے رنگ کا استعارہ بھی اسی تخصیص سے عبارت ہے:

حسین خوابوں سے سرسبز رت کے کیا پایا

ہر ایک برگ تمنا کے رنگ پیلے ہیں

یا ''رائیگاں'' میں وہ پھول جس سے شاعرہ کو لق ودق بیابان میں سابقہ پڑتا ہے۔اس کے ان اپنوں کی بیگانہ روش کا علامیہ ہے جن کی شمولیتیں اس کی زیست بسری کا خاص اسباب تھیں اور جن کے ذریعے وہ اپنی ذات کو کوئی معنی بھی فراہم کرتی تھی۔

لق ودق بیاباں/ سلگتا ہوا ایک صحرا/ کہ جس میں/ کہیں زندگی کا نشاں تک نہیں ہے/ مگر بیچ میں جانے کیسے اگا ہے/ فقط ایک پودا،فقط ایک پھول/ نہ تتلی، نہ پنچھی نہ جھرنے/ نہ جھونکے ہی بادصبا کے/

۔۔۔۔۔۔۔

مگر یہ بھی سچ ہے/ کہ وہ پھول اب/ خود سے بھی ہار کر اپنا دشمن ہوا ہے/ وہ اب تھک چکا ہے/ وہ اب مر رہا ہے!

اس عنوان سے ''رُت بدلی ہے'' کا مطالعہ بھی کم معنی خیز نہیں ہے۔ یہاں بھی شاعرہ کے لحن میں تحت اندر تحت احساس تاسف کارفرما ہے۔شاعرہ کے لفظوں میں اس نظم کی محرک اٹلی کی ایک دوکان دار کی روداد ہے۔لیکن اس نظم کو پروین کی ان دوسری نظموں کے تناظر میں رکھ کر دیکھیں جو اسی نوع کے موضوع کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں تو پتہ چلے گا کہ شاعرہ کی اپنی ناکام ونا تمام حسرتیں ہی پس پردہ کارفرما ہیں جن کی نمو میں رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کے احساس کا خاص رول رہا ہے۔

رت بدلی ہے/ کل تک تھے سرسبز جو پتے/ اب مکھ موڑ کے/ جینا چھوڑ کے/ شاخوں سے ہجرت کرنا اک فرض سمجھ کر/ اڑ جائیں گے! رت بدلی ہے

۔۔۔۔۔۔۔

کاش کوئی موسم ایسا بھی آئے/ مجھ کو نئی رتوں کا ایک سندیسہ دے کر/ پھونک مار کر اتنا کہہ دے/ جا تجھ کو پھر سے سرسبز کیا قدرت نے/۔۔۔۔'' **رت بدلی ہے**''

''عراق'' میں چمن زاروں سے شعلوں کا لہراتے ہوئے اٹھنا اور شاخساروں کا جھلسنا یا ''اشرف المخلوقات'' میں جوہری بم کے ہاتھوں چاند تاروں کا لرزنا، چہرہ گل کا دھواں دھواں ہونا، بچوں کا رونا بلکنا یا ماؤں کی گود کا خالی

ہونا، انسان مرد کے فطرت مخالف رویوں ہی کا مظہر ہے۔

چاند تارے بموں سے لرزاں ہیں/چاندنی مضمحل ہے میلی ہے/چہرۂ گل دھواں دھواں سا ہے/حال برباد گلستاں کا ہے/تم نے بچوں کے بہتے اشکوں سے/اپنی اس جیت کو خریدا ہے۔۔۔" **اشرف المخلوقات**"

دوسرے ماحولیاتی تانیثیت پسندوں کی طرح پروین کا بھی یہی خیال ہے کہ فطرت کی آزادی کے بغیر عورت کی آزادی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تہذیبی تراش خراش کی مہم بھی جس طور پر صدیوں سے فطرت کی خلقی نفاست، تقدیس اور معصومیت کو پائمال کرتی آ رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ فطرت اور تہذیب ایک دوسرے سے متضاد تصور کیے جانے لگے ہیں۔ فطرت کی جبلی نمو پذیری پر تہذیب ہمیشہ قدغن لگانے کے درپے رہتی ہے۔ تہذیب کے لیے فطرت برکت کی نہیں نمائش کی چیز ہے۔ فطرت بتہذیب کی ثنویت اصلاً پدری ہے۔ تمام جنگوں، ہلاکت خیز کیمیاوی ہتھیاروں، بموں سے تباہ ہونے والی انسانیت اور فطرت کی بیش قیمت نعمتوں کو ملیامیٹ کرنے کے پیچھے مرد ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ جب اس بات کی دہائی دی جاتی ہے کہ قدرتی وسائل کو بڑی ہوشیاری سے کام میں لینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک محفوظ رہ سکیں تو اس کے معنی فطرت برائے تحفظ فطرت کے نہیں بلکہ انہیں ایک بڑے عرصے تک مرد کے فائدے کے لیے محفوظ رکھنے کے ہیں۔

پتہ پتہ ہوا کے مدھر تال پر/رقص کرتا ہوا گنگناتا تھا جیسے شجر اور میں/رقص کے نوجواں دوست، ہم رقص ہوں/اور کبھی اک گھڑی دو گھڑی کے لیے/بیٹھ جاتی تھی چڑھ کر کسی اوپری شاخ پر/اور وہاں سے مجھے/ایک کھلونا سی لگتی تھی دنیا......مگر

ایک دن/ایسی آندھی چلی/ایسے زناٹے کا ایک طوفاں اٹھا/تیز رفتار/سیماب پا اک بگولہ/دھماکے کی آواز سے/میرے بچپن کے ساتھی/مرے پیڑ کو/روند کر/بیخ و بن سے گراتا ہوا/خود ہوا ہو گیا!

پروین کی نظر میں اس نظم کا محرک کوئی اور ہو سکتا ہے لیکن محض ان کے لیے جنہیں ان کے سارے تناظر کا علم ہے۔ ورنہ آندھی کے چلنے، طوفان کے اٹھنے اور تیز رفتار سیماب پا بگولہ کا بھنور اور پھر ایک دھماکہ جس نے اس پیڑ کو جڑوں سے اکھاڑ دیا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ اشارے کس تحت المتن کا باب ہم پر وا کر رہے ہیں۔ کیا یہ بگولہ اور یہ دھماکہ ہمارے سماعتوں کے پردے چاک نہیں کر رہا ہے؟ کیا یہ تلازمے ہیروشیما اور ناگاساکی تباہیوں اور مختلف النوع ہلاکت خیزیوں کی طرف ہمارے ذہن کو منعطف نہیں کرتے؟ پیڑ کی علامت یہاں پوری بشریت کو محیط ہے۔

فطرت مخالف تکنیکی ترقیات نے عورت کے ساتھ بچے پر بھی جو ستم رانی کی ہے پروین کو اس کا شدید احساس ہے۔ جس نے ان کے لحن میں کارفرما حزن کو حزن آمیز احتجاج میں بدل دیا ہے۔ پروین کا اپروچ انفرادی

ہے۔ انہوں نے ایک غیر انسانی صورت حال کی نشاندہی کرتے ہوئے ان نکبت زدہ اور حرماں نصیب بچوں کی طرف توجہ کی ہے جو عام شفقتوں اور دلدادگی سے محروم ہیں۔ اس معنی میں بچہ بھی فطرت مخالف تذکیری سیاست اور تکنالوجیکل آفات کا عورت ہی کی طرح شکار ہے۔ اس ذیل میں The Farewell,Homeless, Tears, The Ashen Eyes, جیسی تصویروں کے علاوہ 'سب سے بڑا دکھ' اور 'نیلا چاند' وغیرہ نظموں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

پروین شیر جو کچھ برس پہلے تک تقریباً ایک انجانا یا نسبتاً نیا نام تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک حیران کن مانوس نام میں بدل گیا۔ ایسا نہیں ہے کہ شاعری کے میدان میں ان کی حیثیت نو وارد کی ہے۔ وہ گزشتہ ۲۵، ۳۰ برسوں سے نہ صرف یہ کہ شعر کہہ رہی ہیں بلکہ مصوری اور موسیقی جیسے فنون سے بھی عہد وفا نبھاتی چلی آ رہی ہیں۔ یہ تینوں فنون ان کے تخلیقی ضمیر میں اس طور پر رچ بس گئے ہیں کہ انہیں نہ تو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان میں محرک اول کون سا فن ہے۔ پروین کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں ان تینوں فنون نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ جس نرم خوئی اور مخاطبے میں ایک خاص قسم کے آہنگ سے ان کی ذات مملو ہے وہی موسیقی کی صفت خاص بھی کہلاتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں جیسے پوری زندگی سمٹ آئی ہو، جیسے ان کا ہر مسام کچھ بولنے کے درپئے ہو۔ جیسے کسی مصور کی صفحہ قرطاس پر اُتاری ہوئی تصویر۔ خامشی میں اندر ہی اندر جیسے ایک شور بپا ہے۔ پروین کی شاعری اسی شور کو انگیز کرنے سے عبارت ہے۔ میں نے بارہا یہ شور ان کی شاعری کی اوٹ میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا محسوس کیا ہے۔

پروین کی شاعری جہاں جمالیاتی آسودگی بہم پہنچاتی ہے وہیں بے چین بھی کر دیتی ہے۔ جیسے اس نے ہمارا سراغ پا لیا ہو۔ میں اسے شاعری کی سب سے بڑی قوت کا نام دیتا ہوں۔ شعر کی اثر کاری کا راز بھی شعر کے اسی عمل میں پنہاں ہے۔ ہم اس کا سراغ لگانے نکلتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ اس نے ہمارا ہی سراغ پا لیا۔ ہمارے اندر جو اتھاہ تاریکیوں کا سمندر موجیں مار رہا ہے پروین اس کی تہوں میں اترتی ہیں کہ شاید روشنی کی کوئی ننھی سی کرن کہیں دبی چھپی مل جائے۔ انہیں اندھیرے کے پیچھے اندھیروں کا سلسلۂ بے کنار ملتا ہے لیکن ہر بے کنار کی کوئی انتہا ضرور ہوتی ہے اور اسی انتہا کے دہانے پر کوئی روشن لکیر ہوتی ہے جو ایک اندھیرے کو دوسرے اندھیرے سے الگ کرتی ہے۔ پروین کی ہر نظم اور ہر تصویر اسی لکیر کی متلاشی ہے۔ تخلیق جب براہ راست مطالعے کا موضوع بنتی ہے تو اس کی گرہ کشائی ہمیں معنی کے کئی نئے زُمروں سے روشناس کراتی ہے۔ روشناسی کے بجائے اسے انکشاف کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ پروین شیر کی شاعری کے محاکموں میں انکشاف کا یہ پہلو حاوی رجحان کی حیثیت رکھتا ہے۔

حیدر قریشی (جرمنی)

''جوش بانی'' کا
ترقی پسند نظم نمبر اور میراجی

ڈاکٹر علی احمد فاطمی ایسے ترقی پسند نقاد ہیں جن کی سوچ اور اپروچ میں ایک توازن ملتا ہے۔اپنے ترقی پسند خیالات کے ساتھ وہ ادب کو اس کے مجموعی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ادب کے تئیں ان کے اس رویے نے عمومی طور پر انہیں ادبی دنیا میں نہ صرف عدم توازن کا شکار ہونے سے بچائے رکھا بلکہ ان کی ترقی پسند سوچ میں ایک توازن بھی قائم کر دیا۔ترقی پسند تحریک کی ابتدا، عروج، زوال سے لے کر اب تک کے منظر نامہ پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ تحریک اپنی بہت ساری ادبی خوبیوں کے باوجود اپنے کارندوں کی مارکسسٹ سخت گیری اور فکری سطح پر متشددانہ رویے کی وجہ سے زوال کا شکار ہوئی۔سخت گیر ترقی پسندوں نے جو زیادہ تر مارکسزم کے کچے پکے مطالعہ سے دانشور بن بیٹھے تھے، ادب کو محض آلۂ کار سمجھ لیا۔ایسے غیر تخلیقی اذہان نے تخلیقی عمل کے اسرار اور اس کی پیچیدگیوں کو بھی سرسری طور پر لیا اور اپنے نظریات کو عقیدے کی متشددانہ حد تک پہنچا دیا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک کے تخلیق کار بھی اسی رو میں بہہ نکلے۔چنانچہ کبھی کسی نے احسن فاروقی کو گریبان سے پکڑ کر اسٹیج سے نیچے گرایا تو کبھی منٹو اور اسی طرح کے دوسرے تخلیق کاروں کو اپنے رسائل میں چھاپنے سے روک کر سوشل بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔کبھی فیض میلہ میں احمد ندیم قاسمی جیسے ترقی پسند کو بھی ہوٹ کر کے مشاعرہ پڑھنے سے روک دیا گیا۔یہ متشددانہ رویوں کی چند سرسری سی مثالیں ہیں۔اس کا نقصان مخالفین کو اتنا نہیں ہوا جتنا خود ترقی پسندوں کو اور ان کی اپنی تحریک کو نقصان ہوا۔ترقی پسند تحریک کے تنظیمی زوال کے بعد ترقی پسند تخلیق کاروں اور دوسرے دانشوروں نے سنجیدگی کے ساتھ تحریک کی غلطیوں کا جائزہ لیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اصلاحِ احوال کی کوشش کی۔علی احمد فاطمی کو میں ایسے دانشوروں میں شمار کرتا ہوں جنہوں نے تحریک کی غلطیوں کا ادراک کر کے احسن طور پر ان غلطیوں کی تلافی اور اصلاح کی کوشش کی۔

جوش و فراق لٹریری سوسائٹی، الٰہ آباد کے زیر اہتمام ایک ادبی رسالہ ''جوش بانی'' وقتاً فوقتاً شائع ہوتا ہے۔اس کے مدارالمہام علی احمد فاطمی ہیں۔''جوش بانی'' کا شمارہ نمبر ۵۔۶ جولائی ۲۰۱۰ء تا جون ۲۰۱۱ء ترقی پسند نظم نمبر کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔اس نظم نمبر کو دیکھ کر میری ان تمام باتوں کی تصدیق ہوتی ہے جن کا میں اوپر

ذکر کر چکا ہوں۔علی احمد فاطمی کے بے حد اہم اداریہ کے ساتھ ترقی پسند ادب اور ترقی پسند شاعری کے بارے میں محمد حسن، سید محمد عقیل، صدیق الرحمٰن قدوائی، شارب ردولوی، عتیق اللہ، اقبال حیدر، ابن کنول اور علی احمد فاطمی کے آٹھ مضامین شامل ہیں۔ان میں ترقی پسند ادب اور خصوصاً ترقی پسند شاعری کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس نمبر کا اہم حصہ اور بنیادی شناخت قرار پانے والا حصہ نظموں کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔اس میں ۵۹ شاعروں کی ۷۱ نظموں کا تجزیاتی مطالعہ یکجا کیا گیا ہے۔اداریہ اور مضامین کا حصہ ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ نظموں کے تجزیاتی مطالعہ کا سلسلہ صفحہ نمبر ۱۱۷ سے لے کر صفحہ نمبر ۵۲۷ تک پھیلا ہوا ہے۔اس نمبر کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ اداریہ میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے فراخدلی کے ساتھ یہ اعتراف کیا ہے **''بہت پہلے میں نے میراجی کی کتاب اس نظم میں پڑھی تھی جو بہت اچھی لگی تھی، بس اسی طرز پر ترقی پسند نظم اور ان کے تجزیوں کا خاکہ بنا ڈالا''**۔یہ روایتی ترقی پسندوں سے ہٹ کر آزادانہ علمی و ادبی کام کرنے والوں کے کام کے ایماندارانہ اعتراف کی ایک جہت ہے۔وگرنہ عمومی طور پر ترقی پسندوں کی طرف سے میراجی کو برا بھلا ہی کہا جاتا تھا۔رجعت پسند کی روایتی گالی جو مارکسزم کا سطحی مطالعہ کرنے والے ہر کسی کو منہ بھر کر دے دیا کرتے ہیں، میراجی کو بھی دی جاتی رہی۔لیکن آج سنجیدہ اور پڑھے لکھے ترقی پسندوں میں یہ رویہ سامنے آنے لگا ہے کہ وہ نظریاتی تشدد کی بجائے دوسروں کی بات اور کام کی بھی قدر کرنے لگے ہیں۔یہ ایک صحت مند تبدیلی ہے، جس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

تجزیاتی مطالعہ کے لیے منتخب کی گئی نظموں میں شاعروں کے انتخاب میں بھی کھلے دل کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔علامہ اقبال نے تو ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بھی پہلے چند ایسی شاندار نظمیں لکھ دی تھیں جو آج بھی ترقی پسند شاعری کے لیے مثالی نمونہ قرار دی جا سکتی ہیں۔چنانچہ علامہ اقبال کی دو نظمیں بھی تجزیاتی مطالعہ میں شامل کی گئی ہیں، اختر شیرانی سے لے کر میراجی تک مختلف الجہات لیکن اہم اردو شعراء کو بھی اس حصہ میں شامل کیا گیا ہے۔میراجی کے لکھے ہوئے جوش ملیح آبادی اور ن م راشد کی نظموں کے دو تجزیے بھی شامل کیے گئے ہیں۔اور میراجی کی نظم ''کلرک کا نغمۂ محبت'' کا تجزیاتی مطالعہ کرا کے اسے بھی شامل کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، فراق گورکھپوری، ن م راشد، میراجی، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، اسرارالحق مجاز، احسان دانش، جمیل مظہری، مجنوں گورکھپوری، پرویز شاہدی، وامق جونپوری، مسعود اختر جمال، احمد ندیم قاسمی، سلام مچھلی شہری، اخترالایمان، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی جیسے معتبر ناموں سے لے کر آج کے ندا فاضلی، جاوید اختر اور شاہد ماہلی تک شاعروں کی ایک کہکشاں ہے جو اس نمبر میں جگمگا رہی ہے اور جن کی نظموں کے تجزیوں سے ترقی پسند افکار کی توثیق کی جا رہی ہے۔ایک کمی ہے کہ ظہیر کاشمیری سے لے کر احمد فراز تک پاکستان کے کئی معتبر ترقی پسند شاعر اس نمبر میں دکھائی نہیں دے رہے۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ''پاکستان کے سبھی ترقی پسند شاعروں کو ہم نہیں لے سکے جس کا ہمیں افسوس ہے۔مواد کی فراہمی مسئلہ بنی رہی''

ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے اداریہ کے ان اقتباسات سے ان کے موڈ اور فراخدلانہ طریق کار کے بارے میں

اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''قمر رئیس کہا کرتے تھے کہ ادب میں نظریاتی تشدد نقصان زیادہ پہنچاتا ہے اور دائرہ کو محدود کرتا ہے۔ فکر میں نرمی اور لچک ہونی چاہیے جو قمر رئیس میں تھی اور میں بھی اس کا قائل ہوا اور اسی کا فائدہ اٹھایا''

''سارا ادب ہمارا، سارے ادیب ہمارے، سارے انسان ہمارے، ساری کائنات ہماری، یہی ہم نے اپنے بزرگوں سے سیکھا ہے اور یہی ہم اپنے نوجوانوں کو وراثت میں دینا چاہتے ہیں۔''

یہ خوشی کی بات ہے کہ پہلے زندگی کے صرف ایک رُخ پر ہی اصرار کرنے والے ترقی پسند دانشور اب اپنے افکار پر قائم رہتے ہوئے زندگی کو اس کے مجموعی تناظر میں بھی دیکھنے لگے ہیں۔ بلکہ زندگی سے بڑھ کر کائناتی سطح پر بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور ان کے رفیق کار کینیڈا کے اقبال حیدر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ترقی پسند نظم نمبر پیش کر کے ترقی پسند نظم کے خدوخال کو اجاگر کیا۔ اپنی سوچ میں آنے والی مثبت تبدیلیوں کو نمایاں کیا اور ہمارے میرا جی کے کام کا اعتراف کر کے دوسروں کو بھی اعتراف کی ترغیب دی۔ اس نمبر سے ادب میں فراخدلانہ سوچ اور صحت مند رویے مستحکم ہوں گے۔

منشا یاد انتقال کر گئے۔۔انا للہ و انا الیہ راجعون

ابھی اپنی ڈیوٹی سے لیٹ نائٹ گھر پہنچا ہوں تو معلوم ہوا کہ اکبر حمیدی صاحب نے اسلام آباد سے فون پر اطلاع دی تھی کہ معروف و ممتاز اردو افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار منشا یاد وفات پا گئے ہیں۔ انٹرنیٹ پر آیا تو وہاں ارشد خالد، سعید شباب، راجہ محمد یوسف، اسحاق ساجد کی جانب سے موصولہ ای میلز میں یہی افسوس ناک خبر آئی ہوئی تھی۔ بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ منشا یاد کی مغفرت فرمائے اور ان کے جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین۔

ابھی تین روز پہلے مجھے ان کی نئی کتاب ''منشائیے'' کا تحفہ ملا تھا۔ اس میں میری کتاب ''میری محبتیں'' پر ان کا ایک بہت عمدہ اور محبت آمیز مضمون شامل ہے۔ میں نے آج ہی منشا جی کی اس کتاب پر جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۸ کے لیے اپنا تبصرہ مکمل کیا تھا۔ وہ کل ایک دلچسپ ای میل اپنے احباب کو بھیج رہے تھے، اس میل میں ایک اخبار کی خبر تھی جس میں پاکستان کا سب سے امیر ترین شخص منشا یاد کو قرار دیا گیا تھا۔ ساتھ منشا جی کی طرف سے وضاحت تھی کہ یہ امیر ترین شخص میں نہیں ہوں۔ ان کے سارے احباب اس ای میل کے جواب میں اپنا ردِعمل بھیج رہے تھے۔ منشا جی نے ایک متحرک اور چاق و چوبند زندگی بسر کی اور اسی حالت میں ہی اگلی دنیا کی طرف کوچ کر گئے۔

حیدر قریشی (جرمنی سے) ۱۵/اکتوبر ۲۰۱۱ء

(یہ خبر اردو رائٹرز ایٹ یاہو گروپس اور ادب ڈاٹ کام ایٹ گوگل گروپ سے ریلیز کی گئی)

بقول ڈاکٹر وزیر آغا: حیدر قریشی کی زندہ رہنے والی کتاب

گیارہ کتابوں پر مشتمل **عمرِ لاحاصل کا حاصل** شائع ہو گئی

حیدر قریشی کی کتاب **عمرِ لاحاصل کا حاصل** کا لائبریری ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ میگزین سائز کی یہ ضخیم کتاب ۶۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تخلیقی کام پر مشتمل حیدر قریشی کی یہ گیارہ کتابیں یکجا کی گئی ہیں۔ ۱۔ **سلگتے خواب** (غزلیں) ۲۔ **عمرِ گریزاں** (غزلیں، نظمیں اور ماہیے) ۳۔ **محبت کے پھول** (ماہیے) ۴۔ **دعائے دل** (غزلیں اور ماہیے) ۵۔ **درد سمندر** (غزلیں، نظمیں اور ماہیے) اور ان مجموعوں کے بعد کی شاعری۔ ۶۔ **روشنی کی بشارت** (افسانے) ۷۔ **قصے کہانیاں** (افسانے) ۸۔ **میری محبتیں** (خاکے) ۹۔ **کھٹی میٹھی یادیں** (یادیں) ۱۰۔ **فاصلے قربتیں** (انشائیے) ۱۱۔ **سوئے حجاز** (سفرنامہ) اور ان مجموعوں کے بعد کی تخلیقات۔ ان مختلف شعری و نثری کتابوں میں ایسا ربطِ باہم ہے کہ گیارہ کتابیں ایک کتاب لگتی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ۲ صفحات پر حیدر قریشی کی اب تک کی جملہ تصنیفات (صرف تصنیفات) کی طویل فہرست کتابوں کے سالِ اشاعت اور پبلشر کے ادارہ کے نام کے ساتھ درج کی گئی ہے۔ اور ایک صفحہ پر **پاکستان سے ڈاکٹر وزیر آغا، جرمنی سے ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ، انڈیا سے دیوندر اسر، روس سے ڈاکٹر لڈمیلا، انگلینڈ سے ڈاکٹر ڈیرک لٹل ووڈ، مصر سے ہانی السعید اور امریکہ سے کساندرا راؤزن** کے اردو یا انگریزی میں تاثرات کو شامل کیا گیا ہے۔ **ڈاکٹر وزیر آغا** نے لکھا ہے ''حیدر قریشی نے اپنی اس **زندہ رہنے والی کتاب** کو ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کہا ہے۔ غور کیجئے کہ اس عنوان میں لاحاصل سے حاصل تک کا سفر ایک ایسی اوڈیسی ہے جو کم کم دیکھنے میں آئی ہے۔'' **ڈاکٹر کرسٹینا** لکھتی ہیں کہ'' حیدر قریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے''۔ دیوندر اسر کے بقول'' حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی ابتدا ہیں۔'' **ڈاکٹر لڈمیلا** حیدر قریشی کی مجموعی ادبی صلاحیت کو معجزہ قرار دیتے ہوئے اس پر حیرت کا اظہار کر رہی ہیں تو **ڈاکٹر ڈیرک لٹل ووڈ** حیدر قریشی کو فلاسفیکل کہانی کار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

Haider Qureshi's splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation.

ہانی السعید نے حیدر قریشی کو جدید اردو ادب کا ایک بڑا شہسوار قرار دیا ہے تو **کساندرا راؤزن** نے حیدر قریشی کے بارے میں لکھا ہے کہ: Haider Qureshi is a breath of fresh air for our times

کتاب کا سرورق **مصطفیٰ کمال پاشا** (دہلی) نے بنایا ہے جبکہ منفرد نوعیت کا بیک ٹائٹل **خورشید اقبال** (۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال) کا بنایا ہوا ہے۔ **عمرِ لاحاصل کا حاصل** کو دہلی کے معروف و ممتاز اشاعتی ادارہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کے حصول کے لیے براہِ راست پبلشر سے یا پھر حیدر قریشی سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے ای میل ID یہ ہیں: **پبلشر**: ephdelhi@yahoo.com

مصنف: haider_qureshi2000@yahoo.com **اور** hqg786@arcor.de

ا**رشد خالد** (اسلام آباد) کی جانب سے انٹرنیٹ پر یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے 11.05.2009 کو ریلیز کی گئی۔ جہاں سے اردو کی کئی ویب سائٹس نے اسے شائع کیا۔

جدید ادب شمارہ: ۱۸،جنوری تا جون۲۰۱۲ء